

# اسلام اور مستشرقین

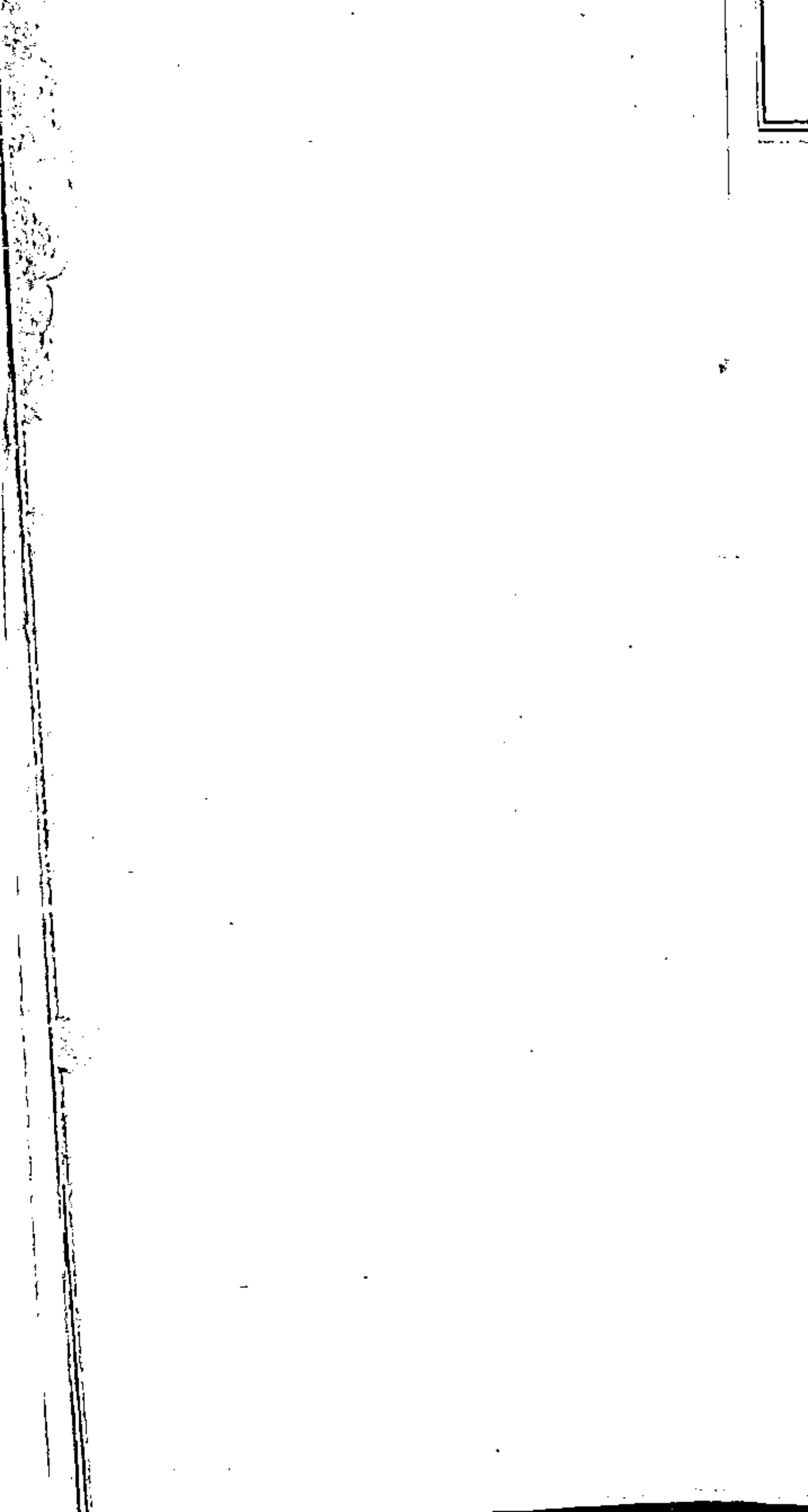
جلد دوم

رتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

مصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (۲۷۶۰۰۱)





DATA ENTERED

# اسلام اور مستشرقین

جلد دوم

فروری ۱۹۸۲ء میں دارالمصنفین کے اہتمام میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر جو بین الاقوامی سمینار ہوا تھا، اس کی مختلف نشستوں میں اسلام اور شارع اسلام اور تاریخ اسلام پر مستشرقین کے اعتراضات کے رد میں جو مضامین پڑھے گئے تھے، ان کو ترتیب سے اس میں جمع کر دیا گیا ہے۔

مرتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

دَارُ الْمَصْنُفِينَ شِبْلَا كُدْمِي

عَظِيمُ كَرُوِيُوِي (هِنْد)

✓  
جملہ حقوق بحق دارالمصنفین محفوظ

سلسلہ دارالمصنفین نمبر: ۱۵۷

297.4

34

5850

اسلام اور مستشرقین جلد دوم

کتاب

سید صباح الدین عبدالرحمن

مصنف

۲۸۳ + ۶ = ۲۸۹

صفحات

۲۰۰۴ء

دوسرا ایڈیشن

معارف پریس، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (ہند)

مطبع

دارالمصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (ہند)

ناشر

﴿ باہتمام ﴾

عبدالمنان ہلالی

۱۱

۱۱

۱۱



۱۲۱-۱۲-۲۰۱۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فہرست مضامین

اسلام اور مستشرقین جلد دوم

صفحہ	مضمون نگار	مضمون
۱ - ب	سید صباح الدین عبدالرحمن	ویباچہ
۱۰ - ۱	جناب حکیم محمد سعید صاحب دہلوی بہمدرد فاؤنڈیشن، کراچی (پاکستان)	مستشرقین اور طب اسلامی
۲۷ - ۱۱	پروفیسر خلیق احمد نظامی شعبہ تاریخ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ	مستشرقین کے افکار و نظریات کے مختلف دور
۳۸ - ۲۸	شیخ نذیر حسین، مدیر انسائیکلو پیڈیا آف اسلام پنجاب یونیورسٹی، لاہور	مستشرقین اور علوم اسلامیہ
۳۷ - ۳۹	مولانا سعید احمد اکبر آبادی، علی گڑھ	پروفیسر اجناس گولڈزیبر
۵۹ - ۴۸	ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، ریڈر اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، اسلام آباد (پاکستان)	مستشرقین، استشرق اور اسلام
۷۲ - ۶۰	پروفیسر ضیا الحسن فاروقی، جامعہ ملیہ دہلی	سر ہملٹن الیکزینڈر روسکین گب
۸۱ - ۷۳	پروفیسر خواجہ احمد فاروقی، دہلی یونیورسٹی	مستشرقین کے تصور اسلام کا تاریخی پس منظر
۹۳ - ۸۲	الاستاذ انور الجندی، قاہرہ مترجمہ عمیر الصدیق دریا بادی، ندوی، رفیق دارا لمصنفین، اعظم گڑھ	مستشرقین اور اسلام (نمبر ۱)
۱۰۳ - ۹۵	ڈاکٹر مشیر الحق، پروفیسر مطالعات اسلامی جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی	ولفریڈ کینیوئل اسمتھ
۱۱۴ - ۱۰۲	جناب سید اطہر حسین، ریٹائرڈ آئی، ایس، ایس، لکھنؤ	قرآن اور مستشرقین

اسلام اور مستشرقین

۱۲۱-۱۲-۲۰۱۱



مضمون	مضمون نگار	صفحہ نمبر
براؤن اور اسلام	ڈاکٹر امیر حسن عابدی، شعبہ فارسی، دہلی یونیورسٹی	۱۱۵-۱۱۹
قرآن مجید میں قصہ ابراہیم اور مستشرقین کے اعتراضات	ضیاء الدین اصلاحی، دارالمصنفین، اعظم گڑھ	۱۲۰-۱۲۷
جوزف شناخت اور اصول فقہ	جناب محمد طفیل صاحب، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد (پاکستان)	۱۳۸-۱۳۹
مستشرقین اور سیرت نبوی ﷺ	ڈاکٹر غلام الدین خلیل، موصل یونیورسٹی (عراق) مترجمہ عمیر الصدیق دریابادی، ندوی، رفیقہ دارالمصنفین، اعظم گڑھ	۱۵۰-۱۷۷
مستشرقین اور اسلام (نمبر ۲)	شیخ انور اجندی، قاہرہ مترجمہ عمیر الصدیق دریابادی، ندوی، رفیقہ دارالمصنفین، اعظم گڑھ	۱۶۸-۱۸۵
ہمارے عصری تعلیمی اداروں پر مستشرقین کے اعتراضات	مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی دہلی	۱۸۵-۱۸۷
مستشرقین اور تاریخ ترکی	ڈاکٹر اکمل ایوبی، ادارہ علوم اسلامیہ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ	۱۶۱-۱۷۷
مستشرقین کی خدمات اور ان کے حدود	جناب سید وحید الدین، ہمدرد نگر، نئی دہلی	۱۹۸-
منگمری واٹ کی کتاب "محمد آیت مکہ" پر ایک نظر	سید صباح الدین عبدالرحمن دارالمصنفین، اعظم گڑھ	۲۰۸-
علم حدیث اور مستشرقین	ڈاکٹر تقی الدین ندوی مظاہری جامعہ العین، ابو ظہبی	۲۵۰
اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر ایک سرسری نظر	مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی امیر جماعت اسلامی ہند	۲۷۷
مستشرقین کے بارے میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے ارشادات گرامی	مولانا سید ابوالحسن علی ندوی ندوة العلماء لکھنؤ	۷۳



## بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

### دیباچہ

الحمد للہ اسلام اور مستشرقین کی یہ دوسری جلد اب ہمارے معزز ناظرین کے ہاتھوں میں ہے، یہ ان مقالات کا مجموعہ ہے جو دارالمصنفین کے بین الاقوامی سمینار منعقدہ فروری ۱۹۸۲ء میں پیش کیے گئے۔

ان مقالات پر سمینار میں جو مباحث یا تبصرے ہوئے ان کی پوری تفصیل اس سلسلہ کی جلد اول میں پیش کر دی گئی ہے، اس کے مطالعہ سے ان مقالات کی نوعیت اور اہمیت کا اندازہ ہوگا، اس میں کچھ ایسے مقالات بھی درج کر دیے گئے ہیں جو پیش تو کیے گئے تھے لیکن وقت کی کمی کی وجہ سے پڑھے نہ جاسکے، ان ہی میں جناب شیخ نذیر حسین لاہور، الاستاذ انور احمد بی قاہرہ، جناب ضیاء الدین اصلاحی دارالمصنفین، ڈاکٹر عماد الدین خلیل عراق، جناب سید وحید الدین صاحب دہلی اور خود خاک سار کے مقالے ہیں، اس لیے ان پر سمینار میں بحث و مباحثہ نہ ہو سکا۔

عربی کے جو مقالے آئے تھے ان کے ترجمے دارالمصنفین میں احتیاط سے کیے گئے، کچھ لوگوں کو یہ اعتراض تھا کہ مستشرقین نے جو مفید خدمات انجام دی ہیں، ان کا اعتراف نہ کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، لیکن اس مجموعہ میں ایسے مقالے بھی ملیں گے جن میں ان مستشرقین کی خدمات کا بھی ذکر اچھی طرح سے آگیا ہے، لیکن ایسے مقالات پڑھتے وقت اس کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ ان مستشرقین کی وجہ سے نقصانات زیادہ پہنچے ہیں، جیسا کہ اسی کتاب کے اور مقالات سے اور اس سلسلہ کی دوسری جلدوں سے بھی ظاہر ہوگا۔

ہم اپنے ناظرین کو پھر یاد دلا دیں جیسا کہ اس سلسلہ کی پہلی جلد کے دیباچہ میں لکھ چکے ہیں کہ اس کی تیسری جلد میں وہ مقالات جمع کر دیے گئے ہیں، جو ہندوستان اور باہر کے ارباب نظر نے مختلف عنوانات کے تحت مستشرقین کی علمی تلبیسات اور تالیسات پر بہت کچھ لکھا ہے، چوتھی جلد



میں مولانا شبلیؒ کے وہ مضامین ہیں جو انہوں نے مستشرقین پر مختلف اوقات میں لکھے ہیں، پانچویں جلد میں استاذ محترم مولانا سید سلیمان ندویؒ کے مضامین ہیں۔

محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے سمینار میں جو مقالہ پیش کیا تھا وہ علاحدہ سے اسلام اور مستشرقین کے نام سے ندوۃ العلماء کے مکتبہ تحقیقات و نشریات کی طرف سے شائع ہو گیا ہے، اس کو بھی اسی سلسلہ کی ایک جلد سمجھنا چاہیے، اس کا عربی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے، پھر سمینار میں جو عربی مقالے آئے، ان کے مجموعہ کا ایک نمبر البعث الاسلامی دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ سے بھی شائع ہوا ہے۔

زیر نظر مجموعہ میں مضامین کی تقدیم و تاخیر کی ترتیب میں زیادہ خیال نہیں رکھا گیا بلکہ جیسے جیسے مضامین دست یاب ہوتے گئے ان کی کتابت و طباعت ہوتی رہی تاکہ تاخیر نہ ہو، اگر اس کی وجہ سے کچھ بے احتیاطی ہو گئی ہو تو ہم معذرت خواہ ہیں۔

اس مجموعہ کی اشاعت میں توقع سے زیادہ تاخیر ہو گئی ہے، اس کی وجہ یہ ہوئی کہ معارف پریس میں طباعت کے ون ڈانک سسٹم کا تجربہ کیا گیا، الحمد للہ وہ کامیاب رہا اور اس سلسلہ کی ساری کتابیں ون ڈانک ہی کے ذریعہ طبع ہوئی ہیں۔

امید ہے کہ یہ مجموعہ اور اس سلسلہ کی بقیہ جلدیں جس مقصد سے شائع کی جا رہی ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے علمی حلقوں میں مقبول ہوں گی۔ آمین!

احقر

سید صباح الدین عبدالرحمن

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

۱۵ دسمبر ۱۹۸۵ء



# مستشرقین اور طب اسلامی

از

جناب حکیم محمد سعید دہلوی، ہمدرد فونڈیشن، کراچی (پاکستان)

ہمارے اسلاف نے قرآن کریم کی روشنی اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے فیض سے عالم انسانیت کو جو بہت بڑا عطا کی اور علوم و فنون کے میدانوں میں جو بہتم باشان کارنامے انجام دیے وہ تاریخ عالم کا بیش بہا ذخیرہ ہیں لیکن مختلف وجوہ سے جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، مسلمانوں میں سیاسی انحطاط کے ساتھ علمی لگن میں بھی کمی ہوئی تو وہ علمی پیش رفت تو رہی ایک طرف اپنے اسلاف کے کارناموں سے بھی بیگانہ ہونے لگے اور ان کو مسلمان مشاہیر علم و ادب کی خدمات کا علم و اندازہ بھی نہیں ہوا۔ اقوام مغرب میں سیاسی غلبہ کے ساتھ ساتھ علم و دانش میں بھی بڑی جھل کرنے کی سعی پیہم کی، اس کے لئے ایک طرف تو مغرب اہل علم نے مسلمانوں کو احساس کمتری میں مبتلا کرنے کی کامیاب کوششیں کیں، دوسری طرف وہ خود علمی تلاش و تحقیق دکھو کاوش میں مصروف ہو گئے، اپنی علمی برتری اور اپنے اخلاقی تنوع کو ظاہر و ثابت کرنے کا ایک طریقہ انھوں نے یہ بھی نکالا کہ مسلمان اکابر و مشاہیر کے کارناموں پر تحقیق شروع کی، اور اپنی تحقیق کے نتائج کو انکشافات کے انداز میں خود مسلمانوں کے سامنے بھی پیش کیا، خدا ترسے برانگیزد کہ نیک ماوراں باشد کے مہدات ان کے اس طرز فکر و عمل کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ خود مسلمان اہل علم کو بھی اپنے اسلاف کی عظمت پر توجہ ہوئی اور ان کو احساس ہوا کہ ان کے بزرگوں نے جو کارنامے انجام دیے ہیں ان کو مستشرقین نے تسلیم کرنے میں کتمان حق سے خوب خوب کام لیا ہے، عالم اسلام میں بیداری اور احساس زیاں کی موجودہ لہر نے ہمیں ایک بار پھر موقع دیا ہے کہ ہم مستشرقین کے کارناموں کا بامعان نظر مطالعہ کرنے کے بعد حقائق کو تجزیہ و تحلیل کی چیلنی میں چھاننے کی کوشش کریں اور نوازن فکر کا دامن نہ چھوڑتے ہوئے حقائق تک پہنچنے کی کوشش کریں، اسلام اور مستشرقین پر یہ بین الاقوامی موتمر مسلمان اہل علم کو ایک زریں موقع فراہم کرنی ہے کہ وہ اسلامی تاریخ کے باب میں ایک جامع لائحہ عمل تیار کریں۔

میرا موضوع مستشرقین اور اسلامی طب ہے، میں نے اس میں اختصار کے ساتھ مستشرقین کے کام کا دیا اندازہ



اور فراخ دلانہ جائزہ لینے کی کوشش کی ہے، اور کیرے نکالنے کی ذہنیت اختیار نہیں کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم مسلمانوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اسلامی طب کی ایک مجموعہ اور جامع تاریخ مرتب کریں اور اس میں مسلمان اطباء و حکماء کے کاموں کو صحیح علمی و تاریخی پس منظر میں پیش کریں، صرف اسی طرح ہم اس کوتاہی کی تلافی کر سکیں گے جو ہم نے اپنی علمی تاریخ کی تدوین سے ظاہر ہو چکا ہے، ایک مسلمان طالب علم کی حیثیت سے میرا انداز فکر یہ ہے کہ ہمیں دوسروں کی کوتاہیوں، مگر اہمیوں اور جانب دارانہ رویوں کی تقید پر عطف و توجہ سے زیادہ مثبت انداز میں خود علمی پیش رفت کی جانب مائل ہونا چاہئے، صرف اسی طرح ہم بعض مستشرقین کے ایسے کاموں اور ان کے مفسر اثرات کا بھی ازالہ کر سکیں گے جو انہوں نے اپنے مخصوص مسلح اور مفادات کی بنا پر باہمی علمی تاریخ پر مرتب کئے ہیں۔

لیگی آف اسلام کے ایک مقالہ نگار اور معروف مستشرق الفریڈ ٹاگلم نے بڑے محتاط انداز میں اور بڑی دینی زبان سے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ گیارہویں صدی میں یورپ میں قائم کی جانے والی یونیورسٹیوں اور دوسری تعلیم گاہوں کے طرزِ تعلیم ہی نہیں، بلکہ طرزِ تعمیر کا خاکہ بھی اسلامی جامعات کی نقل تھا، نگ نے اسی کتاب میں شامل اپنے مقالہ میں تحریر کیا ہے کہ انگلستان میں چھاپہ خانے کی ایجاد کے بعد جو سب سے پہلی کتاب طبع ہوئی وہ ایک مصری عالم بشر ابن فاتک کی تالیف لفظیات فلاسفہ کا انگریزی ترجمہ تھی، اس کتاب کو اربل ریور نے ہسپانوی ترجمے کے واسطے سے *The Dictates and Sayings of the Philosophers* کے نام سے انگریزی میں منتقل کیا تھا۔

اسی طرح قائم ہونے والی یورپی درس گاہوں اور ان کے اطراف کی آبادی پر پڑنے والے اثرات نیز عربی سے مغربی باؤں میں منتقل ہونے والی کتابوں اور صلیبی جنگوں اور ان کے اثرات مابعد نے اسلامی اور عربی علوم و فنون کے یورپ میں داخل اور خیل ہونے کی راہیں ہموار کیں، ان علوم میں متعدد اسباب کی بنا پر طب کو نمایاں مقام حاصل ہے۔

ای۔ جی۔ برادس نے لکھا ہے کہ "صلیبی جنگیں مغرب میں طب اسلامی کی اشاعت کی محرک کمی جاسکتی ہیں، لیکن یہ محض ایک سیاسی پس منظر ہے، متزجین کی ایک خاص تعداد حروبِ صلیبیہ سے پہلے ہی طبی سرمایے کو لاطینی میں منتقل کرنے کی کوشش میں مصروف ہو چکی تھی۔" سائنسی علوم کے تمار مورخ جارج سارٹن کا بھی خیال یہی ہے کہ صلیبی جنگوں سے صرف نظر کر کے اگر دیکھا جائے تو اندس میں مسلم حکومت کا قیام اور یورپ میں اس زمانہ میں قائم ہونے والی طبی درس گاہیں سرزمین مغرب میں طب اسلامی کی اشاعت کا اہم ترین سبب معلوم ہوتی ہیں۔



اطالیہ کے شہر سلرنو کے مدرسہ طبیہ اور ماونٹ پیلیمر میں واقع طبی درسگاہ کو طب عربی کی تعلیم و تدریس اور تالیف و ترجمہ کے لئے تاریخ میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہاں کے فارغ التحصیل طلبہ یورپ کے حکمرانوں کے علاج معالجہ کے لئے جایا کرتے تھے۔

سلرنو ہی کی درسگاہ کا ایک فرد قسطنطین الافریقہ بھی تھا، جو سب سے پہلے نوی صدی عیسوی کے اواخر میں اسلامی طب کے سرایے کو لاطینی میں منتقل کرنے کی طرف متوجہ ہوا، اور اس نے رازی کی الکیمیاء کا ترجمہ لاطینی میں کیا، اگرچہ طبی اصطلاحات کے تراجم میں اس سے غلطیاں سرزد ہوئی ہیں، تاہم یہ فخر اس کو حاصل ہے کہ وہ پہلا مستشرق ہے جس نے رازی کو مغرب سے روشناس کرایا۔ اسی طرح اس کی دلچسپی نے مغرب میں اسلامی طبی لٹریچر کے تراجم کی تحریک پیدا کی، سلرنو کے مستشرقین میں ایک اہم شخصیت کریمونا کے جیوٹا کی ہے جو ۱۱۵۰ء میں اٹلی میں پیدا ہوا، اس نے بطریقہ وس کی الجسطی اور جالینوس اور بقراط کی کتابوں کے ترجمے کے علاوہ القانون کو لاطینی زبان میں منتقل کر کے اہم خدمت انجام دی، اس ترجمے کے بعد ہی اہل مغرب شیخ الرئیس سے کما حقہ متعارف ہوئے اور ان کے ہاں ایک نئے طبی دور کا آغاز ہوا، براؤن نے ایک اور مستشرق کا ذکر بھی کیا ہے، جو یورپ میں ابن سینا کے افکار کی اشاعت کا سبب بنا، ان کے علاوہ ایک یہودی طبیب فرج بن سالم نے ۱۲۴۹ء میں رازی کی کتاب الحادی کا ترجمہ کیا۔

ایڈے لارڈ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس نے اساسی علوم اور عربی زبان کی باقاعدہ تحصیل کے بعد انگلستان جا کر متعدد عربی کتابوں کے ترجمے کئے، اس طرح رفتہ رفتہ اسلامی عربی علوم کو یورپ میں فروغ حاصل ہوتا گیا، ہسپانیہ کا شہر طلیطلہ اسلامی علوم و فنون کا بہت بڑا مرکز تھا، ہسپانیہ میں پیرس کے ایک انگریز طالب علم ڈینیل مارے نے عربی کی بہت سی کتابوں کے ترجمے کئے، اس کے سارے ترجمے بارہویں صدی سے تعلق رکھتے ہیں، اسی عہد میں ایک یہودی طبیب ابراہیم نے ڈاکٹر میکس سائمن کے اشتراک سے زہر ادھی کی کتاب کا ترجمہ کیا، الفانسونیز بونا کو سائے ابن رشد کی کتاب الافعال اور کلیات کا ترجمہ کیا، اسلامی علوم سے مستشرقین کے شغف کا اندازہ اس بات سے بھی ہو سکتا ہے کہ بیشتر اہم کتابوں کے ایک سے زیادہ ترجمے کئے گئے۔

تیرہویں صدی میں اسٹیفن نے الجوسی کا ترجمہ دنیس سے ۱۲۹۵ء میں شائع کیا، رابرٹ اور ڈراگن کی کوششوں سے اور نیز دوسرے مترجمین کی محنت اور توجہ سے ۱۵ویں صدی میں کنڈری رازی اور بعض دیگر اطباء سے اسلام کی کتابیں بھی لاطینی



میں منتقل ہو گئیں اور تسلسل کے ساتھ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں یورپی زبانوں میں اسلامی طبی لٹریچر کے تراجم اور ان کی تحقیق کا سلسلہ جاری رہا۔

عہد بہ عہد مستشرقین کا ذوق تحقیق ترقی کرتا رہا، انھوں نے طبی ذخائر کی تلاش و جستجو شروع کی، نایاب نسخوں کی دریافت اور ان کی نشان دہی اور ان پر تحقیق کے ساتھ ان کی تہذیب و تریب ان کے اہم کارناموں کی حیثیت رکھتی ہے۔ انھوں نے آکسفورڈ اور کیمبرج کی لائبریریوں کے علاوہ شخصی اور ذاتی کتب خانوں میں جا کر بعض اہم نسخوں کا مطالعہ کیا، پروفیسر براؤن نے بعض ایسی طبی کتابوں کے قابل اعتماد نسخوں کی طرف اشارہ کیا ہے جن کی نقلیں شخصی کوششوں سے حاصل ہوئیں۔ اطباء کی تاریخ میں قفطی کی تاریخ اکھبار خاص اہمیت رکھتی ہے، ڈاکٹر چولیس لیپرٹ نے خاصے حزم و احتیاط کے ساتھ ۱۹۰۳ء میں اس کو ایڈٹ کر کے شائع کیا۔

پروفیسر براؤن نے اسنادی کے بارے میں لکھا ہے کہ اس کا مکمل ترین نسخہ بوڈلین لائبریری میں ہے، اس کے بعض حصے کے نوٹوں میں نے پروفیسر مارگو لیتھ کی مہربانی سے حاصل کر لئے ہیں۔

طب اسلامی پر تحقیق کا کام جس کے لئے صرف طبی کتابوں کے ذخیرے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ ان وسائل کا اہتمام بھی ضروری تھا جن کی مدد سے ان تصانیف اور کارناموں کی قدر و قیمت کا تعین ممکن ہو، ان میں قلمی نسخے بھی شامل ہیں، اس سلسلہ کا پہلا کام ان مخطوطات کا تحفظ تھا، یہ فریڈریش میوزیم لندن اور اسی طرح برلن کے مشرقی علوم کے کتب خانے اور کتب خانہ پیرس کے علاوہ کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں کے شعبہ علوم شرقیہ نے انجام دیا۔

تحفظ کے ساتھ ساتھ ان کتب و مخطوطات کی محققانہ فہرست سازی بھی افادہ نوبت کا ایک اہم کارنامہ ہے، اور انہی فہرستوں کے ذریعہ خود مشرقی دنیا کو اپنے بعض گمراہے نایاب کی اطلاع ملی۔

یہ فہرستیں صرف کتابوں کے ناموں تک محدود نہیں ہیں بلکہ مصنفین اور مباحث کتاب کا ممکن حد تک تعارف بھی ان فہرستوں میں موجود ہے جن سے اہل علم ہر دور میں مستفید ہوتے رہے ہیں، پروفیسر براؤن نے لیکرگ، بروکلن کا تذکرہ اپنے لکچرز میں جا بجا کیا ہے، ایسی فہرستیں ارباب ذوق کے لیے بہت اہم ہوتی ہیں، ان فہرستوں اور طبی ذخیروں کی موجودگی اور عربی زبان و ادب سے مستشرقین کی دلچسپی نے ان کو اہم خدمات کا موقع عطا کیا۔

پروفیسر براؤن کی صراحت کے مطابق بیسویں صدی کے اوائل میں متعدد طبی کتابوں کے انگریزی تراجم کے علاوہ ابن النیم



کی افہرست، ۱۳۳۵ھ، تفتلی کی تاریخ الحکام، ۱۳۲۵ھ، ابن ابی اصیبه کی طبقات الاطباء (۱۳۲۵ھ)، اور اسی نوع کی بعض دیگر کتابوں کے اعلیٰ ایڈیشن منظر عام پر آچکے تھے، اور یہ قابل قدر خدمات مشرقین ہی نے انجام دی تھیں۔

طب عربی کی عمومی خصوصیتوں پر نیو برگ، پچیل، ویننگٹن، گیرسین وغیرہ نے قابل قدر کام کیا۔

طب اسلامی پر ناقدانہ بحث و نظر کے سلسلہ میں ڈاکٹر کوننگ اور ڈاکٹر سائمن خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان محققین

کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اطباء اسلام کی طبی اصطلاحات کو صحت کے ساتھ درج کیا اور یونانی اصطلاحات سے ان کا

مقابلہ دوازہ بھی کیا ہے۔

بیسویں صدی میں طب اسلامی سے مشرقین کے شعف نے حواری ترقائی شکل اختیار کی، اس کے بعض پہلو خصوصیت

کے ساتھ قابل ذکر ہیں، انیسویں صدی سے ان کی تحقیقات کا دائرہ ترجمے اور یونانی کتب سے تقابل سے آگے بڑھ کر سائنسنگ

بنیادوں پر قدیم طبی حقائق کی تلاش و جستجو شروع ہوئی، اس کو ہم ان کے علمی ذوق و شعور کی ترقی بھی کہہ سکتے ہیں اور ان کی اپنی

ضرورت بھی۔

فاضل مشرق مارٹن لیوی نے الکندی پر اپنی فاضلانہ تحقیق پیش کرتے ہوئے اپنی کتاب کے مقدمہ میں لکھا ہے، یہ امر

مسلم ہے کہ جدید طب نے خصوصیت کے ساتھ طب اسلامی کے علم و اساسی اور قرابادینوں سے استفادہ کیا ہے، جدید فن و اساسی

کو اساس و بنیاد طب اسلامی ہمارے فراموش کی یہی خیال دراصل ان کے ذوق تحقیق کے لئے تازیانہ بنا، چنانچہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ

موجودہ صدی میں مشرقین کی توجہ طب اسلامی کے ذخائر کی طرف روز بروز زیادہ سے زیادہ ہوتی جا رہی ہے، انہوں نے طب فنی

کتب ہی نہیں، بلکہ مسلمان اطباء کی سوانح اور ان کے علمی کمالات کی تفصیلات پر دقیق نظر ڈالی، طب اسلامی کے ادلین ماخذ کی

کی تلاش و جستجو کی، مسلمان اطباء کے افکار کے سائنسی عناصر کا تجربہ کیا، اور دانش حاضر کے سرمایے میں ان کے اثرات کی کار فرمائیوں

کا جائزہ بڑے تعمق کے ساتھ لیا، نہایت سلیقہ سے علم اور علماء کی تاریخ کے اہم ماخذ کو مغربی زبانوں میں منتقل کیا اور ان سارے

وسائل و ذرائع سے کام لے کر اطباء اسلام کے کارناموں پر شرح و بسط اور نقد و نظر کے ساتھ روشنی ڈالی۔

یہ امر لائق توجہ ہے کہ اطباء اسلام کے کارناموں پر مشرقین کے مضامین، مقالات اور ان کی تصانیف سرسری نوعیت

کی نہیں ہیں، بلکہ قدیم تذکرہ نگاروں کی روش سے ہٹ کر تفصیل و تجزیہ اور تعمین مقام، مرتبہ کی کوشش بھی ان کی ممتاز خصوصیت

ہے لیکن ان کے ہمہ گیر ذوق تحقیق یا ان کی خدمات کا دوسرا پہلو اس سے زیادہ اہم ہے، اور وہ ہے اطباء اسلام کی تصانیف

کو تصحیح و ترمیم کے ساتھ مرتب کرے پیش کرنا، اور حق یہ ہے کہ اس میدان میں ان کی محنت و کاوش، وقت نظر اور بصیرت کی داد دینا نا انصافی ہے، اس آخر الذکر کا نامے کا منفرد پہلو یہ ہے کہ ہمارے اسلاف کے بعض قیمتی کارنامے ہم تک انہی کوششوں سے پہنچے، اور مستشرقین نے اسلاف کے بعض ایسے علمی کارنامے طشت از بام کیے ہیں جن کی خبر ہمارے بیشتر اہل علم کو اب تک نہیں ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ان کی ادارت اور پیش کش ایسے سائنٹفک اصولوں پر ہوتی ہے جن سے تصنیف و مصنف دونوں کی عظمت و افادیت کے سارے گوشے نمایاں ہو جاتے ہیں۔

ان کی ادارت و تحقیق کی انفرادیت کے ضمن میں قدامت کی فنی تصانیف کے بھی چند خصائص کا ذکر ضروری ہے، جو صوری اور معنوی دونوں حیثیت سے نہایت اہم ہیں، اطباء اسلام کی فنی تصانیف مثلاً رازی کی الحادی، ابن سینا کی القانون اور سمرقندی کی القربادین کی زبان و ہیئت آج کی زبان و ہیئت سے بہت مختلف ہے، وضاحت اور تفصیل جو عصر حاضر کی تحریروں کی خصوصیت ہے وہ بظاہر ان کتابوں میں نظر نہیں آتی، بعض رسائل و کتب پر از اول تا آخر ایک مسلسل پیرا گراف کا لگان ہوتا ہے جو ریز و اوقاف سے خالی ہو، یوں اس قلم میں سارے گم موجود ہیں، لیکن قاری کے لئے گہر چینی دشوار ہوتی ہے۔

معنوی خصوصیت میں ابہام اور اصطلاحات کا کثرت استعمال اور مختصر اشارات خاص طور پر لائق ذکر ہیں، کتابوں کے متون بعض ناقلوں کی غفلت کی وجہ سے خلط ملط بھی ہوئے ہیں، ان مشکلات کی موجودگی میں تہرسی اور غواصی کی ہم بہ آسانی سر نہیں کی جاسکتی تھی مستشرقین بلاشبہ قابل تبریک ہیں کہ ان دشواریوں کے باوجود انہوں نے طبی کتابوں کے مضامین اور نکات کا ادراک کرنے میں کامیابی حاصل کی۔

قدما کے طرز تصنیف اور زبان کی پیچیدگی، اصطلاحات کی کثرت، عبارتوں کی عدم وضاحت کا ذکر براؤن نے بھی کیا ہے، قدیم مصنفین کے نزدیک فنی کتابوں میں تفصیل و تشریح کو غیر علمی اسلوب سمجھا جاتا تھا، حاشیے اور شرحیں اسی لیے وجود میں آئیں۔ قدیم مصنفین کا خیال تھا کہ کتاب کے مضامین کی ترتیب، حوالے اور ماخذ کی جستجو، اشارات کی مدد سے مباحث کا مکمل ادراک مطالعہ کرنے والے کا کام ہے، مطالعہ کرنے والوں پر ساری تفصیل کے دروازے کھولنے کی کوشش کو وہ علم اور اہل علم دونوں کی توہین اور حق تلفی سمجھتے تھے، لیکن جدید دنیا میں اخفا، اغماض اور ابہام کے برخلاف قاری کو ساری سہولتیں ہم پہنچانے کی ذمہ داری مصنف کی سمجھی جاتی ہے، اور جو فنی کتابیں ان اوصاف سے خالی ہوتی ہیں وہ اپنی وسیع افادیت کے باوجود علمی استفادہ میں مشکلات پیدا کرتی ہیں۔



مستشرقین کی یہ کوشش بڑی اہمیت کی حامل ہے کہ جدید طرز تحریر و تصنیف کے تمام تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے انھوں نے قدیم طبی سرمایے کو اس قدر پرکشش اور استفادہ کے لیے زیادہ آسان بنا دیا ہے، مشکل مقامات پر توضیحی نوٹ اور کتاب کے مندرجات کی ابجدی فہارس مرتب کر کے انھوں نے کتابوں کی افادیت کو کئی گنا بڑھا دیا ہے

میں اس جگہ طبی اہمیت کے دو کارناموں کا کسی قدر تفصیلی تعارف کرانا چاہتا ہوں، جو مستشرقین کی مساعی سے ہم تک ٹھے مناسب انداز میں پہنچے ہیں، یہ کارنامے الکندی اور سمرقندی کی قرابادین ہیں جنہیں مارٹن لیوی نے ترتیب نو اور تہذیب نو کے بعد انگریزی ترجمے کے ساتھ شائع کیا۔

تذکرہ نگاروں نے الکندی کی دو سو پینسٹھ کتابوں کا ذکر کیا ہے، لیکن ان میں سے بیشتر ناپید تباہی گئی ہیں، بصریات پر اس نے ایک کتاب لکھی تھی جس کا صرف لاطینی ترجمہ موجود ہے جس کے متعلق میکس مار ہوف نے لکھا ہے کہ راجر بیکن اور دوسرے مغربی علمائے بصریات نے اس سے استفادہ کیا ہے، میرے علم کی حد تک کسی مشرقی زبان میں الکندی کی یہ کتاب موجود نہیں، اسی طرح مسلمان تذکرہ نگاروں نے الکندی کی تصانیف میں سے بعض کتابوں کا کوئی ذکر نہیں کیا، ابن ندیم کی الفہرست میں اس کی قرابادین کا کوئی تذکرہ نہیں ہے، ترکی کے کتب خانہ ایا صوفیہ میں اس کتاب کا ایک قلمی نسخہ موجود تھا، لیکن زمانہ حال تک یہ غیر معروف رہا، ایک ترک عالم کی نشاندہی پر مارٹن لیوی نے اسے اصل مخطوطے کے نوٹ اور اس کے انگریزی ترجمے کے ساتھ مہذب اور منقح کر کے شائع کیا، لیوی نے کتاب میں جو اضافی ابواب تحریر کیے ہیں ان میں الکندی کی شخصیت اور اس کے علمی اور خاص طور پر طبی کارناموں کا مفصل ذکر کیا ہے۔ طب اسلامی میں دوا سازی اور علم الادویہ کی اہمیت پر روشنی ڈالی ہے، قرابادین میں جن مرکبات کا ذکر ہے ان کے مفرد اجزاء کے سائنٹفک مترادفات (بنیاتی اور کیمیائی نام) دیے ہیں، طبی دوا سازی کی اصطلاحات اور اعمال دوا سازی کی تشریح و توضیح کی ہے، اور جگہ جگہ تاریخی اور طبی اہمیت کے وضاحتی نوٹ لگائے ہیں، کتابیات کے ضمن میں ان جدید و قدیم مصادر کا ذکر کیا ہے جن سے طبی علوم اور تاریخ طب کے ضمن میں معلومات حاصل ہو سکتی ہیں، کتاب کے آخر میں دواؤں کی فرہنگ اور اشاریے لگائے ہیں، اس طرح اس مشرق نے تاریخ طب اسلامی کا ایک نیا باب اہل تحقیق کے لئے دیا ہے، اور ہمارے گم شدہ گوہر کو بجلی کر کے ہمارے سامنے پیش کر دیا ہے۔

اس مشرق نے بالکل اسی انداز پر فخر الدین رازی کے ہم عصر معروف طبیب نجیب الدین سمرقندی کی قرابادین بھی ایڈٹ کر کے شائع کی ہے، لیوی کے ان دونوں کارناموں کا مفصل تذکرہ اس جگہ بے محل ہوگا، یہ دونوں کام میں نے محض بتوں

کے طور پر پیش کیے ہیں۔

اس جگہ چند ان مستشرقین کا ذکر بے محل نہ ہوگا جنہوں نے ایسی ہی بصیرت اور تحقیقی ندرت کے ساتھ خالص سائنس

انداز سے اطباء اسلام کے کارناموں پر مورخانہ انداز سے روشنی ڈالی ہے۔

ان میں اولین نام ایڈورڈ جی براؤن کا ہے جو کیمبرج یونیورسٹی کے نامور پروفیسر اور وسیع النظر مشرق کی حیثیت سے

اپنا ایک فاضلہ مقام رکھتے ہیں، ۱۹۱۹ء اور ۱۹۲۰ء میں رائل کالج آف فزیشنرز لندن کی دعوت پر انہوں نے طب اسلامی

پر چار فاضلانہ خطبات دیے جو بعد میں کتابی صورت میں Arabian Medicine کے نام سے شائع ہوئے ۱۹۲۳ء

میں فرانسیسی زبان میں اس کا ترجمہ ہوا، یہ کتاب بظاہر طب عرب کی تاریخ معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ صرف تاریخ

نہیں ہے، بلکہ اس میں طب اسلامی کے اسی تصورات اس کے ارتقا اور عالمی تہذیب پر اس کے اثرات، وجود و طبی ماس

کی ترقی میں اس کے حصے، اکابر اطباء اسلام کے مقام و مرتبہ، ان کے معجزاتی اکتشافات، طب کے امہات کتب، ان کے

مستند نسخے اور ان کی فنی افادیت کی فاضلانہ تشریح و تشریح پر مشتمل ایک بہترین کتاب ہے، اس کتاب میں طب اسلامی کے تصنیفی

سرمایے کی طرف اشارہ ہی نہیں بلکہ پوری سیرت اور تحقیق کے ساتھ ہر ایک کے مفہام پر تبصرہ بھی ہے۔

پروفیسر براؤن نے اپنی کتاب کے مقدمہ میں پروفیسر میکس نیو برگ کی کتاب کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "وہ میرے لئے

بہت مفید ثابت ہوئی اگرچہ اس میں طب عرب کا ذکر کل ۸۶ صفحات میں ہے، لیکن اس کے باوجود یہ کتاب حقائق اور مستند تفصیلات

سے پُر ہے"

پروفیسر براؤن کے اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغربی زبانوں بالخصوص فرانسیسی میں طب اسلامی کی مستند تاریخیں

لکھنے کی کوشش کی گئی ہے، نیز اسی دور میں پروفیسر مارگولیتھ جیسے لوگ موجود تھے، جو تشریح قدیم کے سمجھنے میں براؤن کی رہنمائی کرتے

تھے۔ اس طرح میکس نیو برگ بھی اہم مشرق سمجھا جاتا ہے، لیکن طب اسلامی کی عظمت کی پُر سکوہ عمارت جن علی اور سنی زادیوں سے مورخانہ

صداقت کے ساتھ پروفیسر براؤن نے مغربی دنیا کو دکھائی اس نے دیگر مستشرقین کے لئے ایک مستقل مکتبہ فکر کی صورت اختیار کر لی۔

اس کے ٹھیک دس برس کے بعد ۱۹۳۰ء میں Legacy of Islam کے نام سے ایک اور اہم کتاب وجود

میں آئی۔ یہ متعدد فضلاء کی مجلس علمی کی ادارت میں مرتب ہوئی، اس کتاب میں اسلام کی تمدنی، تہذیبی اور علمی میراث اور اس کی

عالمی افادیت بالخصوص مغربی فکر و ثقافت پر اس کے اثرات کا ہمہ گیر جائزہ لیا گیا ہے، مختلف شعبہ ہائے علوم و فنون میں خصوصی



مہارت اور شہرت رکھنے والے ماہرین کے مقالات جمع کیے گئے ہیں، اس کتاب میں اسلام کے متعلق جو مختلف فیہ امور آئے ہیں وہ میرا موضوع نہیں، ان کے بارے میں تنقیدی حوالوں سے آپ حضرات واقف ہیں، اس کتاب کا ایک عنوان اسلامی طب و سائنس بھی ہے، مشہور مستشرق ارمون نے اپنے فاضلانہ مقالے میں جس تاریخی ترتیب سے طب اسلامی کے ارتقا اور مشرق و مغرب پر اس کے اثرات کا ذکر کیا ہے وہ ترتیب *Arabian Medicine* میں بھی نظر نہیں آتی، طبی کتابوں کے یورپین تراجم اور وہاں کی نرسنگا کے نصاب میں ان کی شمولیت کی جو تفصیلات اس مستشرق نے پیش کی ہیں ان سے یورپ پر دانش اسلامی کے اثرات کا اندازہ کرنے میں بہت مدد ملتی ہے۔

ان ایٹیکلو پیڈیا آف اسلام میں بعض مشرقین نے اطباء اسلام کے فنی کمالات، تصانیف اور ان کی اہمیت مستند آخذ اور دیگر تفصیلات پر جو مقالات پیش کیے ہیں وہ بھی منفرد نوعیت کے کارنامے کہے جاسکتے ہیں، میں اجازت چاہوں گا کہ اس کتاب کے مختلف فیہ مسائل سے صرف نظر کرتے ہوئے اپنی گفتگو صرف طب اور سائنسی علوم تک محدود رکھوں، الغرض اس دائرۃ المعارف میں الکندی، رازی، ابن رشد، ابن سینا، فارابی، سمرقندی، زہراوی اور دیگر اطباء اسلام سے متعلق جو مستند اور مفصل معلومات یکجا کر دی گئی ہیں، وہ اگر ایک طرف اکابر کے کمالات کا مرقع ہیں تو دوسری طرف مشرقین کے اہم کارناموں کی بھی حیثیت رکھتی ہیں، بیسویں صدی کے وسط اول ہی میں ایک ممتاز مستشرق جارج سارٹن جو پہلے ہی سے تاریخ علوم پر متعدد مضامین و مقالات لکھ چکا تھا اس اہم کام کی طرف متوجہ ہوا، اس نے دی اسٹڈی آف دی ہسٹری آف سائنس کے عنوان سے تاریخ علم کا دائرۃ المعارف مرتب کرنے کا فیصلہ کیا اور اس طرح ۱۹۲۷ء میں انٹرویڈکشن ٹو دی ہسٹری آف سائنس کے نام سے تین ضخیم جلدوں پر مشتمل ایک کتاب وجود میں آئی جس میں دانش قدیم و جدید کی تاریخ ہر ممکن تفصیل کے ساتھ پیش کی گئی۔

جارج سارٹن نے اپنے مقدمہ میں لکھا ہے کہ "میرا ایمان ہے کہ عصر حاضر میں علوم کی دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جسکی

اساس و بنیاد ماضی میں موجود نہ ہو!"

یہی خیال اس کتاب کی تصنیف کا محرک ہوا، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس نے ماضی میں انسانی تہذیب و ثقافت کی انتہائی

گہرائیوں میں جا کر اساس و بنیاد کی جستجو کی اور اپنے مقصد میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوا۔

چنانچہ قرون وسطیٰ کی تاریخ علم و ثقافت میں اسلام اور اہل اسلام کے علمی و فکری کارناموں کا کوئی گوشہ اس نے نشہ نہیں چھوڑا۔ طب اسلامی نے جس عظیم فلسفہ و سائنس کی بنیاد پر ارتقا کی منزلیں طے کیں اس پر خصوصیت کے ساتھ اس نے توجہ کی

اس سے نہ صرف ماضی و حال مربوط و ہم رشتہ ہو گئے ہیں بلکہ سارے اکابر کے کارناموں کے منفرد پہلو بھی پوری صراحت کے ساتھ سامنے آگئے ہیں۔

اس کتاب کی یہ خصوصیت، ساری نئی نئی اور اپنی طرف متوجہ کرتی ہے کہ اس میں اسلامی طب و سائنس کا ذکر عالمی سائنس کے پس منظر میں کیا گیا ہے، اور وقتاً بوقتاً سائنس کی تاریخ کو اس کے حقیقی جمال و کمال کے ساتھ پیش کر کے سائنس نے اہم کارنامہ انجام دیا ہے۔

اسی سلسلہ کی ایک تازہ کوشش ایڈیٹر یونیورسٹی کا ایک سلسلہ کتب اسلامک سیریز ہے اس کی گیارہ جلدیں شائع ہو چکی ہیں۔

مستشرقین کی ان کوششوں کی وجہ سے جہاں اہل مغرب میں اسلامی علوم کے تحقیقی مطالعہ کی ضرورت کا احساس بڑھ رہا ہے وہیں ان کی یہ خدمات ہمیں بھی یہ راہ دکھاتی ہیں کہ ہمارے اسلاف نے اپنی ذہنی و علمی کاوشوں کا جو ذخیرہ چھوڑا ہے، وہ سائنسی تحقیقات کے اس دور میں بھی کارآمد مواد اور مزید تحقیق کے لئے مضبوط اساس فراہم کرتا ہے۔



## مستشرقین کے افکار و نظریات کے مختلف دور

طریقہ کار کا تجزیہ اور اصلاح حال

از

پروفیسر خلیق احمد نظامی، شعبہ تاریخ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ہر قوم کی حیات اجتماعی کی ایک روح ہوتی ہے، جس کے صحیح ادراک کے بغیر اس کی تاریخ یا تمدن کی بنیادی حقیقتوں تک رسائی ممکن نہیں، مستشرقین نے اسلام کی تاریخ اور تہذیب کی تحقیق میں مہتمم باشان کارنامے انجام دیے ہیں، لیکن ان میں ہمیشہ اس کی داخلی معنویت کو سمجھنے سے عاجز رہے ہیں، اس ناکامی کے اسباب کی توجیہ اس وقت ممکن ہے جب ان عوامل اور محرکات کا سراغ لگایا جائے جن کے زیر اثر مستشرقین نے تاریخ اسلام پر اپنی توجہ مرکوز کی تھی اور اس کے مذہبی افکار اور تمدنی اداروں کی نوعیت کو سمجھنا چاہا تھا، یہ محرکات کبھی مذہبی عصبیت کا مہارالیتے تھے، کبھی مقتضائے سیاست سے ان کا رخ متعین ہوتا تھا، کبھی معاشی دوراندیشی، علمی جدوجہد کا پیکر اختیار کرتی تھی، مذہب، سیاست اور معاشیات کی اس تگ و دو میں فاضل علمی اور تحقیقی کاوشوں کی کیفیت گہر پانظاروں کی سی رہتی تھی، اگر تاریخ کے وسیع پس منظر میں دیکھا جائے تو مستشرقین کی تحقیقی جدوجہد کے پانچ دور سامنے آئیں گے۔

پہلا دور (۱) اسلام اور اس کے تہذیبی کارناموں سے واقفیت حاصل کرنے کا جذبہ مغرب میں اُس وقت بیدار ہوا تھا جب اسپین اور سسلی کی سرزمین پر عربوں نے قدم رکھا تھا، یہ صرف ایک ملک یا ایک جزیرہ کی فتح نہ تھی بلکہ تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کے ایک نئے اور انقلاب آفرین دور کا آغاز تھا، ایسا دور جس نے بقول مشہور فرانسیسی مستشرق پروفیسر میسٹون تہذیبی اعتبار سے یورپ کو بیدار کیا اور مغرب کی ترقی کے لئے نئے نئے امکانات پیدا کر دیئے، عربوں کے علوم کو حاصل کرنے، ان کے مذہب کی حقیقت کو سمجھنے اور ان کی علمی سر بلندی کا راز دریافت کرنے کا جذبہ اس بات کا محرک ہوا کہ اسلام کا تحقیقی مطالعہ کیا جائے، عربوں کی نئی تحقیقات، نئے علمی تجربات، نئے علمی رجحانات سے یورپ کے عالم استفادہ کرنا چاہتے تھے، اور گوپینبرگ اسلام کے متعلق جب گفتگو کرتے تو اپنے متعصبانہ جذبات کو چھپانہ پاتے تھے، لیکن اسلام کے علمی ذخائر کے ذریعہ علمی سر بلندی کا راز معلوم کرنے کی جستجو ان کے سارے جذبات پر حاوی تھی، ۱۳۱۱ء میں طلپطلہ کے ایک فاضل ڈورہیورنٹ نے ایک محکمہ اسلامی فلسفیانہ تصانیف کو عربی سے لاطینی میں منتقل کرنے کے لئے قائم کیا، اس محکمہ میں بہت سے یہودی عالم شامل

تھے، ۱۱۵۹ء میں طلیطلہ ہی کا ایک یہودی عالم ابراہیم بن عذراہ انگلستان پہنچا اور علومِ اسلامی کے مطالعہ کی ضرورت اور افادیت پر توجہ دلائی اس زمانہ میں عیسائیوں اور یہودیوں نے جن کی زبان عبرانی تھی، عربی پر غیر معمولی قدرت حاصل کی، اور عربی کتابوں کو لاطینی اور دوسری زبانوں پر منتقل کرنا شروع کر دیا، گیرارڈ ڈی کریمونا (Gerardi Crimona) نے رازی اور ابن سینا وغیرہ کی تقریباً ساٹھ کتابوں کا عربی سے لاطینی میں ترجمہ کیا، اسی زمانہ میں یورپی ممالک بالخصوص انگلستان کے علماء اسپین کی عرب درسگاہوں میں تحصیلِ علم کے لئے آئے شروع ہوئے، بارہویں صدی کے ان علماء میں ایڈیلرڈ (Adelard) کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے، اس نے انگلستان میں نہ صرف عربی علوم کی حمایت میں بہت کچھ لکھا، بلکہ متعدد عربی کتابوں کا ترجمہ بھی کیا، ڈنیل آف مارے (Daniel of Marley) نے اسپین پہنچ کر عربوں کی درسگاہوں میں تعلیم حاصل کی، میکس اسکاٹ (Michael Scott) نے سلی میں اسلامی علوم کی تحصیل کی اور پھر ارسطو کی تصانیف کا عربی سے ترجمہ کرنے میں عمر گزار دی، کلیسا نے بھی عربی علوم کی افادیت کو محسوس کیا اور پوپ جان (Pope John XXII) نے ۱۳۲۵ء میں ایک منشور کے ذریعہ اپنے نمائندے کو پیرس میں ہدایت کی کہ کالج کے عربی شعبہ کی نگرانی میں غفلت نہ برتی جائے۔

ایڈیلرڈ نے اپنی کتاب "مسائلِ طبیعیہ" (Natural Questions) میں عربوں کے ان احسانات کا بھی ذکر کیا ہے جس نے یورپ کی خاموش علمی فضا میں حرکت پیدا کر دی تھی، عربوں نے یورپ کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ عقل (Reason) کو سزا (Authority) پر ترجیح حاصل ہے، یورپ کا دور احیائے علوم (Renaissance) اسی اصول کا شرمندہ احسان تھا۔ آنے والی صدیوں میں اسی پر عمل پیرا ہو کر یورپ نے علمی دنیا کی سربراہی کا راز پایا اور وہ عظیم انسان علمی کارنامے انجام دیئے جنہوں نے اس کو علمی فضیلت کی صف اول میں پہنچا دیا، اقبال نے اسی دور کے عربوں کے کارناموں کے پیش نظر کہا ہے:

اصل او جز لذت ایجاد نیست

این گہرازدست ما افتادہ است

علم و حکمت را بنادیکہ نہ ساد

ماہلش افرنگیاں برداشتند

حکمت اشیار فرنگی زاد نیست

نیک اگر بینی مسلمان زادہ است

چوں عرب اندر اردیا برکشاد

دانہ آں صحرانشیناں کاشتند



**دوسرا دور** (۲) مستشرقین کی علمی سرگرمیوں کے دوسرے دور کی ابتدا صلیبی جنگوں سے ہوتی ہے، گو بعض مستشرقین جن کا ابھی ذکر کیا گیا ہے، صلیبی جنگ کے زمانے سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن ان کی علمی جدوجہد کامرکز اسلام نہ تھا بلکہ مسلمانوں کے وہ علوم و فنون تھے جن کے حصول میں انھوں نے کسی تنصب کو قریب نہیں آنے دیا، مولانا شبلی نے اس دور کے مستشرقین کی علمی دلچسپیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا: "یورپ کی فیاض، دلی رشک کے قابل ہے کہ ایک طرف تو مذہبی اختلافات کی بنا پر مسلمانوں کے خون کا پیاسا تھا، لیکن دوسری طرف اس نے بے تکلف مسلمانوں کے خونِ کرم سے زلہ ربانی شروع کر دی"۔ لیکن اس فیاضی کا تعلق غیر مذہبی لٹریچر سے تھا، جہاں تک مذہب کا تعلق ہے صلیبی جنگ کے بعد مستشرقین کے طرز فکر اور انداز تحقیق میں بنیادی تبدیلی رونما ہو گئی، اب اسلام کی تعلیمات اور پیغمبر اسلام کی حیات طیبہ اور اسلامی تہذیب کا کوئی گوشہ ایسا نہ رہا تھا جو ان کے متعصبانہ افکار کی زد میں نہ آ گیا ہو، انھوں نے اپنی ساری صلاحیتوں کا رخ اسلام کو غیر مذہب اور وحیانا مذہب ثابت کرنے کی طرف موڑ دیا، اس لئے کہ اسی میں ان کو عیسائیت کی مدافعت کی راہ نظر آتی تھی، کتنے ہی غلط اور بے بنیاد الزام تھے جو اسلام اور مسلمانوں کے متعلق اس دور میں تراشے گئے، اور ان کو شہرت عام دے دی گئی، حضرت عمرؓ کی نسبت کتب خانہ اسکندریہ کے جلانے کا حکم اسی زمانہ میں مستشرقین نے وضع کیا اور اس کو اس طرح مشہور کیا کہ اپنے پرانے سب کو اس کی صداقت پر یقین آ گیا، اس زمانہ میں یورپ نے مسلمانوں کے خلاف جذبات برانگیختہ کرنے کے لیے ان کے متعلق گمراہ کن خیالات کو قومی گیتوں میں اس طرح سمودیا کہ یہ جنگی معرکوں میں رجز کے طور پر گائے جانے لگے، اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ جب کسی شخص کو عیسائی بنایا جاتا تھا، تو یہ خیالات عقاید کے طور پر اس کو سکھائے جاتے تھے۔

مستشرقین نے اسلام کی جو غلط تصویر اس دور میں پیش کر دی تھی وہ مدتوں تک یورپ اور اس کے زیر اثر علاقوں میں تاریخی حقیقت کے طور پر تسلیم کی جاتی رہی۔

**تیسرا دور** (۳) مستشرقین کی علمی جدوجہد کے تیسرے دور کا آغاز اس وقت ہوا جب صنعتی انقلاب نے یورپی ممالک میں استعمار اور ملک گیری کی نئی خواہشات کو بیدار کر دیا، اب یورپ میں اقوام نے مسلمان ملکوں پر لپجائی ہوئی نظریں ڈالنا شروع کر دیں، ان حالات میں اسلام کی طرف کھلا ہوا اتحاد سیاسی مصالح کے منافی نظر آنے لگا، ان ملکوں پر اقتدار کے مضبوط پنجے جلنے کے لیے ضروری تھا کہ مسلمانوں کی تاریخ کا ایک ایک پیچ و خم، ان کے افکار و احساسات کی ایک ایک خلش اور ان کے سماجی رجحانات اور دینی شعور کے ایک ایک نشیب و فراز کا پتہ لگایا جائے، محکوم کے دل و دماغ تک پہنچنے بغیر حکمراں کی کوئی ساحری کامیاب نہیں ہو سکتی تھی،

اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے یورپین ممالک نے سب سے پہلے اپنی یونیورسٹیوں اور اداروں کی طرف دیکھا اور ہمت افزا جواب پایا، سترہویں صدی میں کیمبرج اور آکسفورڈ میں عربی پڑھانے کا بندوبست کیا گیا، اور اسلام کے علمی ذخائر کو جگہ جگہ سے سمیٹ کر لانے کے منصوبے بنائے گئے، آکسفورڈ کے عربی پروفیسر ایڈورڈ پوکاک (Edward Pococke) نے حلب سے عربی مخطوطات کے بیش بہا ذخیرے حاصل کئے اور انجیر کے ایک درخت کے سایے میں جو وہ شام سے لایا تھا (اور جو اب تک وہاں موجود ہے) عربی تصانیف کے خلاصے کرنے شروع کر دیے تاکہ مسلمانوں کے ملی مزاج اور علمی صلاحیتوں کا صحیح اندازہ ہو سکے، جارج سیل George Sale نے اسی زمانہ میں قرآن کا ترجمہ انگریزی میں کیا، یورپی زبانوں میں قرآن کا یہ پہلا مکمل ترجمہ تھا، اشتراق کی یہ لہر جو مقتضیاتِ سیاسی نے تیز تر کر دی تھی یورپ میں اس طرح پھیلی کہ ہر ملک مسلمانوں کی زبان، تاریخ اور مذہب کی تحقیق میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش کرنے لگا، جرمنی میں ریکے (Reiske) سوزر لینڈ میں بورہڈ (Burhard) فرانس میں سلوینروی ساسی (Sylvestre de Sacy) ہالینڈ میں ڈوزی (Dozy) انگلستان میں رابرٹن اسمتھ (Roberton Smit) نے تو اسلامی تاریخ اور ادب پر تصانیف کے انبار لگا دیے برہارڈ (Burhard) نے تو مسلمان بن کر شام اور حجاز کا سفر کیا، پیرس، میڈرڈ، برلن، لندن، لائڈن، آکسفورڈ کے علومِ مشرقی کے شعبوں میں اسلام پر تحقیقی کام میں غیر معمولی دلچسپی کا اظہار ہونے لگا، نیپولین نے ۱۷۹۵ء کے بعد مصر کے علمی ذخیروں کو فرانس منتقل کرنا شروع کر دیا، انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان کے نادر قلمی نسخے لندن پہنچا دیے، انڈونیشیا، ہندوستان، ایران، مصر، شام، عراق کے کتنے ہی انمول موتی جن کو غیر ملکوں میں دیکھ کر بقول اقبال "دل سی پارہ ہوتا ہے" یورپین کتب خانوں کی زینت بن گئے، نیپولین نے وقت کے اشاروں کو سمجھا اور ازہر کے ساٹھ علماء کے سامنے اسلام سے اپنے احترام کا اعلان کیا اور اپنے نائب کلیر (Kleber) کو ہدایت کی کہ حکومت کے معاملات میں مسلمانوں کے مذہبی طبقوں کا تعاون حاصل کرے، یہ سب سیاست کے تقاضے تھے جن کا اظہار آکسفورڈ سے لے کر ازہر تک مسلسل ہوتا رہا تھا۔

اس زمانہ میں صلیبی دور کا کھلا ہوا معاندانہ انداز مصلحتاً ترک کر دیا گیا، لیکن مقصد کے نشتر تیز تر ہو گئے، اب ساری جدوجہد کا رخ اس طرف تھا کہ مسلمانوں کو ذہنی طور پر مرعوب کر کے ایسے احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا جائے کہ وہ ہر معاملہ میں ہدایت و رہبری کے لئے مغرب کی طرف دیکھنے پر مجبور ہوں، تشکیک اور شبہات کے ذریعہ ان کے قوائے ذہنی کو اس طرح مفلوج کر دیا جائے کہ وہ نہ



صحیح سمت میں قدم اٹھا سکیں، نہ صحیح زاویہ نگاہ سے چیزوں کا جائزہ لے سکیں، پوست پلائے ہوئے انسان کی طرح نہ اعضاءِ جہانی ان کے قابو میں ہوں، نہ قوائے ذہنی پر ان کا بس چلے۔

۱۸۵۷ء کے بعد ہندوستان سے متعلق مستشرقین کے کام کے دو پہلو خاص طور پر جاذب توجہ نظر آتے ہیں، ایک یہ کہ مسلمانوں کی تاریخ پر کام کرنے والے بہت سے مصنفین فوج سے تعلق رکھتے تھے، مثلاً رپورٹی

Briggs Raverty (Scott) ڈاؤ (Dow) ڈیوی (Davy)

دوسرے یہ کہ سیاسی مقاصد کے پیش نظر مسلمانوں کی تاریخ کو اس طرح پیش کرنے کا منصوبہ بنایا گیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے تعلقات کی وہ شگفتگی برقرار نہ رہ سکے جو صدیوں تک ان کی سماجی زندگی کی خصوصیت رہی تھی، سرسہری ایلٹ نے یہ کام اٹھ ضخیم جلدوں میں انجام دیا، ہمیں ایلٹ کا مشکور ہونا چاہیے کہ اس نے اپنے مقاصد کا اظہار ایک عرضداشت (Memorandum) میں انگلستان کی حکومت سے کرنے کا فیصلہ کیا، اس عرضداشت کو بعد میں گلاب کا جزو بنا کر شائع کر دیا گیا، بغیر یہ سوچے کہ مستشرقین کے خلاف یہ سب سے بڑی دتاویز ہے جو ان کے مفاد کے مقاصد کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہے۔

اسی طرح مصر کے متعلق یہ حقیقت فراموش نہیں کرنی چاہئے کہ نیپولین کے بیشتر مددگار اور ترجمان فرانس کے مشہور مستشرق سلوٹر دی ساسی کی شاگرد رشید تھے، اور جب دی لیسپس (de Lesseps) نے نرسویز کو جاری کیا تھا تو اس کے عزائم کو کامیاب بنانے میں کتنے ہی فرانسیسی مستشرقین کی بے تاب تمنائیں کام کر رہی تھیں۔

اس دور کے مستشرقین نے زہر کی تلخیوں کو تحقیق کے شہد میں اس طرح چھپایا کہ کام و دہن کو تو تلخی محسوس نہیں ہوتی، لیکن زہر رگ و پے میں اتر گیا۔

چوتھا دور (۴) جب نوآبادیاتی نظام کا دم واپس شروع ہوا اور اسلامی ممالک میں آزادی کی تحریکیں نمودار ہونے لگیں تو مستشرقین کے اندازِ تحقیق اور طریقہ کار میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا ہو گئی، نوآبادیوں کی آزادی کو ماننا اب ممکن نہ رہا تھا، لیکن ان سے بے تعلق ہو جانا ملک کے سیاسی اقتدار پر ضرب کاری کے مترادف تھا، چنانچہ اب تمدنی رشتوں کی نئی زنجیریں وضع کرنے کے لئے اسلامی علوم کا نئے انداز سے مطالعہ ضروری ہو گیا، دولتِ برطانیہ نے اپنی نوآبادیوں سے دست بردار ہونے میں پس و پیش نہیں کیا، لیکن تمدنی سرمایہ کو (جو آج بھی کتابوں اور آثار کی شکل میں انگلستان کی زمین بنا ہوا ہے) واپس کرنے سے انکار کر دیا، جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اس دور کے مستشرقین کی تحقیقی کاوشوں میں رنگِ احترام آگیا، اقبال نے ۱۹۳۲ء میں جب پروفیسر میسنیون سے کہا کہ مغرب

کے مورخین کو اسلام سے جو تعصب و عناد ہے وہ وقت گزرنے کے ساتھ کم ہوتا رہا ہے، اور اسلام کی صداقت اور حقیقت ان پر آشکارا اور واضح ہوتی جا رہی ہے، تو ایسی نیون نے ان کی رائے سے پوری طرح اتفاق کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ فکر کی یہ تبدیلی مقصد بدل جانے کا نتیجہ تھی، اب سیاسی برتری قائم رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ بظاہر اپنا انداز تحقیق میں اسلام کے ساتھ احترام کا برتاؤ کیا جائے، مبادا سیاسی آزادی کی تحریکیں مغرب کی ذہنی غلامی سے بناوٹ کا رنگ اختیار کر لیں، لیکن دوسری طرف ایسے فتنوں کو خاموشی سے بیدار کر دینے کی جستجو شروع ہو گئی جن سے مسلمان ممالک افتراق اور انتشار کا شکار بنے رہیں، اور ملی وحدت کی پرچھائیاں بھی ان کے ذہن پر نہ پڑنے پائیں، اس دور کے مستشرقین اپنے ملکوں کی وزارت خارجہ کے مشیر بن گئے، اور ان کی تحقیق اگر ایک طرف مغربی حکومتوں کی خارجی پالیسی کا رخ متعین کرنے لگی تو دوسری طرف ان علاقوں میں خیالات کی تبدیلی لانے کے لیے وزارت خارجہ ان مستشرقین سے مدد لینے لگی، جو کام کبھی سپاہیوں کے ذریعہ انجام پاتا تھا، اب پروفیسروں کے ذریعہ انجام پانے لگا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد انگلستان میں اسکالبرور رپورٹ (Scarborough Report) تیار ہوئی جو بجا طور پر (Charter of Modern Orientalism) استشرق جدید کا منشور کہا جاسکتا ہے، اس رپورٹ میں اس بات کا شدید احساس ملتا ہے کہ اگر نئے ابھرتے ہوئے مشرق کو پوری طرح نہیں سمجھا گیا تو برطانوی مقاصد بری طرح متاثر ہونگے۔ ان مقاصد کو World Peace (امن عالم) کا معصوم نام دیا گیا ہے، لیکن سامراجی جذبات افکار کا نیا چولہہ بدل کر اس رپورٹ کے ایک ایک حرف سے جھانکتے نظر آتے ہیں، ایچ۔ اے۔ آرگب (H. A. R. Gibb) نے Modern Trends in Islam میں نئے انداز سے مسلمانوں کی نبض پر ہاتھ رکھا ہے، اور وقت کے بدلے ہوئے تقاضوں کے پیش نظر عالم اسلام پر نظر ڈالی ہے۔

پانچواں دور | (۵) مستشرقین ابھی اسی دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کی تدابیر سوچ رہے تھے کہ اسلامی ممالک میں زریاں کے چشمے ابل پڑے اور دنیا کامرکز نقل و حرکت کی طرف منتقل ہو گیا، مستشرقین کے حاشیہ خیال میں بھی ایسی صورت نہ تھی، اسلامی ممالک کی اقتصادی آزادی کے خیال نے ان کی استعمارانہ فکر کے سارے منصوبے خاک میں ملا دیئے، نئی صورت حال کے امکانات ان کے لیے تشویش بلکہ توحش کا باعث بن گئے، اقتصادی اعتبار سے ان حالات سے فائدہ اٹھانے کی کوشش برابر جاری ہے، لیکن ساتھ ہی ساتھ قرونِ اولیٰ کے اسلام کے مطالعہ سے بے توجہی برتی جا رہی ہے، اب مستشرقین کی دلچسپی جدید مذہبی تحریکات سماجی



رجانات اور اقتصادی امکانات کے مطالعہ کی طرف منتقل ہو چکی ہے، اور فکر اسلامی کی توجیہ اور تلیل سے زیادہ مسلمان ملکوں کے اندرونی اور بیرونی حالات کے تجزیے کی طرف توجہ ہے، قومیت (Nationalism) کے وہ عناصر جو عربوں کی وحدت ملی کے تصورات کو پارہ پارہ کر سکتے ہیں اب توجہ کا مرکز بن گئے ہیں، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ صیہونیت نے مشرقین کے انداز تحقیق سے خاموش ساز باز کر لیا ہے۔

شاید تاریخ کے کسی دور میں دیار مغرب کے رہنے والوں کو اسلام سے وہ دلچسپی پیدا نہیں ہوئی جو عصر حاضر کا خاصہ بن کر سامنے آئی ہے، حالات کی اس نئی کروٹ نے مشرقین کو ایک عجیب ذہنی کشمکش میں مبتلا کر دیا ہے، ان کا ترکش خالی ہے اور حالات کچھ اور ہی رنگ اختیار کرتے جا رہے ہیں، اس زمانہ میں مشرقین نے جو کام اسلام پر کئے ہیں، وہ اسلام سے زیادہ خود ان کے نفسیاتی مطالعے کے لیے دلچسپ مواد فراہم کرتے ہیں Area Studies کے تصور کو اقتصادیات، سیاست ارضی Geopolitic اور عمرانیات (Psychology) سے قریب لاکر دینی عناصر کے مطالعہ سے گریز کیا جا رہا ہے۔

۱۹۶۶ء میں امریکہ میں The Middle East Studies Association of

North America قائم ہوئی اور ۱۹۶۶ء میں British Society for Mid-East-

ern Studies کا قیام عمل میں آیا، یہ انجمنیں بدلتے ہوئے حالات اور رجانات کی آئینہ دار ہیں، ان کی مطبوعات اور رسائل

سے ان ذہنی خلتوں کا اندازہ ہو جاتا ہے جن سے مشرقین اس وقت دوچار ہیں، کبھی Hydro Politics

of the Nile Valley (John Waterburg- 1979) کی طرف انکی

نظر جاتی ہے، کبھی Islam and Colonialism : The Dictsine of

Jihad in Modern History (Rudolph Peters Monton-1979) پر غور کرتے

ہیں، لیکن وہ یہ سمجھنے سے قاصر معادوم ہوتے ہیں کہ اسلامی فکر کا دھارا اب کس رخ سے گھا اور انہیں کہاں کہاں اور کیا کیا بندھ

باندھنے چاہئیں، ایک جدید ترین کتاب Islam and the West کے مصنف Normal Daniel

نے مشرقین کی تصانیف پر گفتگو کرتے ہوئے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ Latin Eur- نے اسلام کے خلاف

بہت سے غلط نظریات پھیلائے تھے، لیکن اس کی عصبیت اس کو علمی بددیانتی تسلیم کرنے کی اجابت نہیں دیتی۔

یہ ہیں وہ پانچ دور جن میں مشرقین کی فکر، ان کے مقصد و منہاج، محرکات و محسوسات کی پرورش ہوئی، اور جن کے

زیر اثر ان کی علمی کاوشیں وقت اور حالات کا ساتھ دیتی رہیں۔

**مقصد (۱)** افراد کی زندگی میں جو حیثیت حافظہ کی ہے، قوموں کی زندگی میں وہی اہمیت ان کی تاریخ کی ہے، مستشرقین کو پیش نظر سب سے زیادہ اہم مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کا تعلق ان کی حیات اجتماعی کے دینی، تمدنی اور فکری سرچشموں سے منقطع کر دیا جائے تاکہ جب وہ کسی انسانی کمال یا کارنامے کا تصور کریں تو ان کا ذہن مغرب کے سوا کسی دوسری طرف منتقل ہی نہ ہو سکے، بقول مولانا شبلیؒ: "ہم کو صرف یہی رونا نہیں ہے کہ ہمارے زندوں کو یورپ کے زندوں نے مغلوب کر لیا ہے، بلکہ یہ رونا بھی ہے کہ ہمارے مردوں پر یورپ کے مردوں نے فتح پالی ہے۔" اس مقصد کے پیش نظر مسلمانوں کو علمی اعتبار سے ایسے احساس کمتری میں مبتلا کرنے کی کوشش کی گئی جس سے ان کی فکر کے سوتے خشک ہو جائیں، ان کی خودی ختم ہو تو ان کی گردنوں میں برگساں اور تہیگل سے عقیدت کی نثار ڈالی جائے۔

(۲) ایک ایسے دور میں جب کہ اسلامی ممالک میں معرکہ سائنس و مذہب برپا تھا اور سائنس کی ایجادات نے ایک ذہنی غلطی پیدا کر دی تھی، مستشرقین کی جدوجہد کا ایک رخ یہ بھی تھا کہ مسلمان سائنس کی برتری تسلیم کر کے اپنے مذہب سے پرہیز ہو جائیں، ان کو اپنا قانون، اپنی شریعت، اپنا طرز زندگی سب فرسودہ اور بیکار نظر آنے لگے، مسلم پرسنل لایٹس تبدیلی اور اصلاح کا آواز سب سے پہلے مستشرقین ہی نے بلند کیا تھا، یورپ میں سائنس اور مذہب کا معرکہ جلد ہی شروع ہوا، اور جلد ہی ختم بھی ہو گیا، مستشرقین نے مشرق میں اس جنگ کو طول دے دیا تاکہ مسلمانوں کو قدم قدم پر اپنے مذہب کے ناقص ہونے کا احساس ہو اور وہ یہ محسوس کرنے لگیں کہ اسلام اس معرکہ میں ناکام ہو چکا ہے۔

(۳) مسلمانوں کے ذہن کو ایسے مسائل میں الجھا دیا جائے جن کا ان کی علمی زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو، لیکن جو قوائے ذہنی کو مضحل کرنے میں کارگر ثابت ہوں، اقبال کی نظم میں ابلیس کا جو شیر مسلمانوں کو ان گتھیوں کے سلجھانے کی تلقین کرتا ہے:

ابن مریم مرگیا یا زندہ جاوید ہے	ہیں صفات ذاتِ حق، حق سے جدا یا عین ذات
ہیں کلام اللہ کے الفاظِ حادث یا قدیم	امت مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات
تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے	تا بساطِ زندگی میں اسکے سب مرے ہوں مات

اس کے پہلو میں مشرق ہی کا دل دھڑکتا نظر آتا ہے۔

(۴) اسلامی تاریخ کے ایسے گوشوں کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر زیر بحث لایا جائے جو مسلمانوں میں اتحاد ملی کے جذبات کو نشوونما پانے



سے روک دیا، اس مقصد کے پیش نظر مستشرقین نے کتنی ہی عداوتوں کو جو وقت کے ساتھ بے جان ہو چکی تھیں، نئی زندگی بخش دی۔

**طریقہ کار** (۱) سب سے زیادہ موثر حربہ جو ان مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کیا گیا، وہ اسلام کے علمی ذخیروں پر قبضہ تھا۔ یورپ کے علمی اداروں، قومی میوزیم اور کتب خانوں میں تاریخ اسلام کے سارے آخذ جمع کر دیے گئے، اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ مسلمان اپنی تاریخ کے اخذ کے لئے مستشرقین کے مکمل طور پر دست نگر ہو گئے۔

(۲) ایک پُر فریب معروضی نقطہ نگاہ نے ان علمی کاوشوں کی حقیقی نوعیت کو نظروں سے پوشیدہ کر دیا، مثلاً جرجی زیدان نے چار جلدوں میں تمدن عرب کی تاریخ لکھی جس میں بظاہر مسلمانوں کی مدح سرائی کی، لیکن درپردہ مسلمانوں پر سخت اور متعصبانہ حملے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کی نظر اس کی فریب کاریوں پر نہیں پڑی اور کتاب گھر گھر پھیل گئی۔

(۳) مستشرقین نے بعض نظریات کو جو بنیادی طور پر غلط اور گمراہ کن تھے، اس خود اعتمادی اور بلند آہنگی کے ساتھ پھیلایا کہ خود مسلمانوں کو ان کی صداقت پر یقین آگیا۔

یہ من چنداں گتہ از بدگمانی می کند نسبت کہ من ہم درگماں افتادہ پسندارم گنہگارم

(۴) مستشرقین کا ایک مخصوص طرز استدلال جس کے اثرات تو سب مسلمانانِ عالم محسوس کرتے تھے، لیکن اس کی نفسیاتی

مصلحتوں کا احساس بہت کم لوگوں کو تھا، یہ تھا کہ دروغ بیانی اور افتراؤں کے دفتر جب کھولے جائیں تو موقع بموقع ایسے جملے

ضرور کہے جائیں جن سے مسلمان پڑھنے والوں کو طیش آجائے اور وہ سکون کے ساتھ ان کے پیدا کئے ہوئے مفسدوں کا جواب

نہ دے سکیں، سب سے پہلے مولانا شبلی نے اس طرز استدلال کے نفسیاتی پہلو کو طشت از باہم کیا اور لکھا: "خود مجھ پر بھی یہی اثر پڑا

ہے، لیکن میں ان حریفوں کو یہ موقع نہ دوں گا کہ وہ میرے طیش و غضب سے فائدہ اٹھائیں" سر سید نے جب میور کی کتاب

کو دیکھا تھا تو بقول خود ان کا دل جل کر کباب ہو گیا تھا، لیکن سر سید یا مولانا شبلی کی طرح جذبات پر قابو پا کر مدلل اور سنجیدہ گفتگو

کرنا ہر شخص کے لئے ممکن نہ تھا، چنانچہ بعض لوگوں نے طیش میں آکر مستشرقین کو صرف بُرا بھلا کہا اور اصل مفسدہ اپنی جگہ بدستور باقی

رہا، بعض نے ان کے بیانات کو ناقابل اعتنا قرار دے کر خاموشی اختیار کر لی، جن لوگوں نے جواب دینے کی کوشش کی ان کو غز خوار

حیاتی (Apolo gist) کہہ کر خود ان کی نظر میں ان کو گرا دیا گیا مستشرقین کے طریقہ کار کے یہ نہایت موثر حربے تھے جو موقع اور

مصلحت سے استعمال کیے جاتے تھے۔

(۵) مستشرقین کا سب سے زیادہ اہم کارنامہ جس کے ذریعہ اگر ایک طرف اسلامی علوم کے متعلق معائنہ بین کی معلومات میں حیرت انگیز اضافہ ہوا تو دوسری طرف مسلمانوں کی علمی اور تحقیقی کاوشوں کا دروازہ نہ صرف بند ہو گیا ہے، بلکہ صدہا ایسی غلط فہمیاں عام ہو گئیں جو گہرے گہرے انکار کا منہ نہیں رہا، وہ "Encyclopaedia of Islam" "Dictionary of Islam" "Bibliothèque Orientale" "Muslim Theories of Finance"۔

جیسی کتابوں کی اشاعت ہے، ان کتابوں کی ترتیب اور تیاری میں جو علمی کاوشیں کی گئی ہیں، وہ اپنی جگہ مسلم ہیں، اور کوئی دیانت دار مصنف ان کی اہمیت سے کبھی انکار نہیں کر سکے گا، لیکن ان میں جن نظریات اور افکار کو بین الاقوامی علمیت کا ٹھپا لگا کر رواج دے دیا گیا ہے، ان کی تردید و اصلاح کے لئے بڑا علمی تبحر اور اس سے زیادہ محنت و جانفشانی درکار ہے، نتیجہ ظاہر ہے اسلام کے فقہی، تمدنی، سیاسی تمام مسائل پر ان تصانیف کو حرف آخر کا درجہ دے دیا گیا ہے، مولانا سید سلیمان ندوی نے اس صورت حال کے خلاف آواز اٹھائی اور انڈین ہسٹری کانگریس کے اجلاس منعقدہ مدراس (۱۹۴۳ء) میں کہا: "یہ دیکھ کر تعجب اور افسوس ہوتا ہے کہ بعض تاریخی تحقیقات میں اسلامی شریعت کی وضاحت انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کی مدد سے کی جاتی ہے، اسلامی فقہ کے نکتے میکڈانڈ کی کتاب کے ذریعہ بتائے جاتے ہیں، اسلامی مسائل کا حل ریورنڈ میوز کی ڈکشنری آف اسلام سے پیش کیا جاتا ہے، مسلمانوں کی حکومت، بادشاہی اور مالیات کے نظریے آرلڈ، اگناڈیز کی سینک سے دیکھے جاتے ہیں، ہم تحقیق کے نام سے اپنے پیشروؤں کی غلطی کی غلط پیروی میں مصروف ہیں!"

(۶) مشرقی علوم بالخصوص اسلام کے مطالعہ کے لئے یورپ کی یونیورسٹیوں میں جو شعبے قائم کیے گئے وہاں مسلمان طلبہ کثیر تعداد میں استفادہ کے لئے جمع ہوئے، یہ طلبہ بعد کو اپنے ملکوں کے اداروں کے سربراہ بنے، مستشرقین کی مقبولیت بڑھانے میں ان طلبہ کا خاص حصہ تھا، ان پر مغربی استادوں کی تعلیم کا ایسا جادو تھا کہ "انچہ استاد ازل گفت ہا می گویم" کی کیفیت ان پر طاری رہتی تھی اور جن خیالات کی اشاعت خود مستشرقین کے لئے شاید ممکن نہ ہوتی، وہ ان طلبہ کے ذریعہ بہت آسان بلکہ موثر ہو گئی، اگر انیسویں اور بیسویں صدی کے ادائل کے اسلامی ملکوں کے علمی اداروں اور ان پر مستشرقین کے اثرات کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ ان شاگردوں کے ذریعہ مستشرقین کس طرح اسلامی دنیا کے پورے علمی افق پر چھل گئے تھے،

(۷) ان شاگردوں کی فکر کو منسلک اپنے نظریات اور تحقیقات کے حصار میں رکھنے کا کام ان استادوں نے انجمنوں،





کا ثبوت دیا، اور خود مستشرقین کے وضع کیے ہوئے ہتھیار ان کے خلاف استعمال کیے۔

ہندوستان میں مستشرقین کے پیدا کئے ہوئے اثرات کے خلاف جن علماء نے پیہم جدوجہد کی ان میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رحمت اللہ کیرانویؒ، مولانا شبلیؒ، مولانا محمد علی مونگیریؒ، ڈاکٹر محمد اقبالؒ اور سید امیر علیؒ کے نام تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیں گے۔ ہندوستان میں مشنری اور مشرق کی سازش نے نازک صورت حال پیدا کر دی تھی، میور نے خود لکھا ہے کہ اس نے اپنی کتاب پادری فنڈر کی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے لکھی تھی، مولانا کیرانویؒ اور مولانا مونگیریؒ نے مشنریوں اور مستشرقین کے اس اتحادِ عمل کا مقابلہ کیا اور بڑی ہمت اور استقلال سے بہت سے فتووں کا سبب کیا، مولانا کیرانویؒ کی کتابیں از آتہ الا وہام، از آتہ انشوک، احسن الحدیث، اظہار حق، فرانسیسی، انگریزی، جرمن اور ترکی زبانوں میں ترجمہ ہو چکی ہیں، مولانا مونگیریؒ کی کتابوں پیغامِ محمدی، ساطع البریان، برہان قاطعہ وغیرہ نے مشنریوں اور مستشرقوں کی سازش کو ناکام بنایا۔

مولانا شبلیؒ مدتِ عمر مستشرقین کے پیچھے ہونے لگے اور انہوں نے برسرِ پیکار رہے، قرآن کے عدیم الصحہ ہونے کا دعویٰ جب لندن ٹائمس میں کیا گیا تو مولانا شبلیؒ نے اس پر زور تنقید کرتے ہوئے کہا: ہم بتا دیں گے کہ قرآن مجید ہزاروں دلائل سے بھی انجیل نہیں بن سکتا، اس ایک جملہ میں اس ذہنی کاوش کا پورا پس منظر سمٹ آیا ہے، جو مستشرقین کی ان کوششوں کا محرک تھا، پادری بر دہلی نے تعداد ازواج پر اعتراض کیے تو مولانا شبلیؒ کا قلم حرکت میں آیا، جرجی زیدان کی کتاب تمدن اسلام کی پردہ دری کا کام بھی مولانا شبلیؒ ہی نے انجام دیا۔ آرمینیا کے جھگڑاؤں میں مستشرقین نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی تھی کہ اسلام میں عیسائی رعایا کے ساتھ ماضی میں شدید مظالم ہو چکے ہیں اور اسلام میں یہ ظلم جائز، بلکہ ضروری قرار دیا گیا ہے، مولانا شبلیؒ نے حقوق اللہ اور اجتزہ لکھ کر ان الزام تراشیوں کو بے اثر کر دیا، جب سیرۃ النبیؐ پر قلم اٹھایا تو سب سے پہلے مستشرقین کے پیدا کیے ہوئے اثرات کا جائزہ لیا، اسی مقصد کے پیش نظر مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ۱۹۱۱-۱۲ء میں الندوہ میں ایک طویل سلسلہ مضامین شائع کیا، جن میں مستشرقین کے کام کا جائزہ لیا گیا ہے۔

ڈاکٹر اقبالؒ نے انگریز، فرانسیسی اور جرمن مستشرقین کے افکار اور انداز تحقیق کا گہرا مطالعہ کیا، انہوں نے مسلم نوجوان سے جس کی آنکھیں مغرب اور مشرق دونوں خیرہ ہو رہی تھیں، خاموشی سے کہا ہے

معلوم ہیں مجھکو ترسے احوال کہ میں بھی مدت ہوئی گذرا تھا اسی راہ گذر سے

۱۵ مقالات شبلی ج ۱، ص ۴۲-۴۶، ۱۵ ایضاً ج ۲، ص ۱۳۳، الندوہ، جولائی ۱۹۱۱ء (۲۹-۱۸) اگست (۲۶-۲۰) نومبر (۲۲-۱۵) وغیرہ۔

۹۵۱۵۷



اور پھر اس کی خودی اور خود اعتمادی کے گرے ہوئے مینارے اور ٹوٹے ہوئے حصار کی تعمیر میں لگ گئے، اقبال نے مستشرقین کی غلی برتری کا طلسم توڑا، ان کے پُر فریب معروضی نقطہ نگاہ کو بے نقاب کیا، مسلمانوں کو خود اعتمادی کا بھولا ہوا سبق پڑھایا اور بتایا کہ جدید سائنس مغربی الاصل نہیں ہے، اس کی ابتدا مسلمانوں سے ہوئی ہے، یورپ نے اس کو روح انسانی کے کچلنے کے لیے استعمال کیا، مسلمانوں کو مغربی علوم کے سلسلہ میں "بولہب را حیدر کرار کن" پر عمل کرنا چاہئے، اقبال نے مسلمانوں کی نئی نسل کو اس ذہنی غلامی اور احساسِ کمتری سے نجات دلانی جو مستشرقین کی پیدا کی ہوئی تھی اور جس نے مسلمانوں کی فکر کے سوتے خشک کر دیے تھے، انھوں نے اپنے خطبات میں جس طرح مسلمانوں کی مذہبی فکر کی تشکیل جدید کا سوال اٹھایا ہے اور جس طرح علوم مغربی اور مستشرقین کے احساسِ برتری کو بے جان کر دیا ہے، وہ تاریخ اسلام میں یادگار رہے گا۔

کام کا اعتراف | مستشرقین کی سرگرمیوں کی یہ روداد بیان کرنے کے بعد ضروری ہے کہ "ہنرش نیز بگو" کے تحت ان کی خدمات کا اعتراف بھی کھلے دل سے کیا جائے، علوم اسلامی پر کام کرنے میں انھوں نے جس بے پناہ لگن، غیر معمولی انہماک اور مسلسل جدوجہد کا ثبوت دیا اور اپنی پوری پوری زندگیاں مختلف اسلامی علوم و فنون کے مطالعہ اور تحقیق میں بسر کر دیں اس کو نظر انداز کرنا حق اور دیانت کے خلاف ہوگا، مولانا ابوالکلام آزاد نے مستشرقین کے احسان کا ذکر کرتے ہوئے ایک بار کہا تھا: "تاریخ و ادب کی وہ بے بہا کتابیں جن کے الگ کر دینے کے بعد عربی اور مسلمانوں کا کچھ کول خالی ہو جاتا ہے، صرف یورپ کی سرپرستی سے آج دنیا میں نظر آرہی ہیں" مولانا شبلی نے طبقات ابن سعد، مناقب عمر ابن عبدالعزیز، تجارب الامم وغیرہ کی اشاعت پر مستشرقین کو مبارکباد دی تھی، اور ان کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کیا تھا، تاریخ جغرافیہ، لغت، طب، فلسفہ، ادب پر قدیم مسلمان علمائے جو پیش بہا علمی کام کیے تھے ان کو مستشرقین کے ذوق نے تباہی سے بچایا اور اعلیٰ حلقوں تک پہنچایا۔

نکلن کے متعلق اربیری (Arberry) نے ایک بار بتایا تھا کہ شنوی کارات دن مطالعہ کرتے کرتے اس کی بیانی جاتی رہی تھی، مارگویتھ کے متعلق مولانا شبلی نے سیرۃ النبی میں لکھا ہے: "اس نے" منہ نام بن بیل کی" چھ ضخیم جلدوں کا ایک ایک پڑھا ہے، اور ہم دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے زمانہ میں کسی مسلمان کو بھی اس وصف میں اس کی ہمسر ہی کا دعویٰ نہیں ہو سکتا۔"

گولڈر میر اور وین منگ (Wensinck) نے احادیث کی ترتیب کی طرف توجہ کی تو حدیث کے سارے

ذخیروں کو کھنگال ڈالا، حقیقت یہ ہے کہ نکلسن، میسی نیون، اریبری، گب وغیرہ کی پُر خلوص علمی کاوشوں کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، مشرقین کی اس لگن اور انہماک کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلامی تاریخ اور تمدن کے سارے ماخذ ان کے قابو میں آگئے، D.K. Niebuhr کا واقعہ اس سلسلہ میں بڑا سبق آموز ہے، اس نے عرب ممالک میں کچھ قدیم کتبات دریافت کیے، تو وہاں کا کوئی عالم ان کو نہ سمجھ سکا، جب ان کتبات کی نقلیں جرمنی میں Reiske کو بھیجی گئیں تو وہ اسی ڈاک بواب مل گیا، علمی اعتبار سے قطع نظر اگر محض جذبہ اور ادراک کی حیثیت سے دیکھا جائے تو اندازہ ہو گا کہ مسلسل اسلام کے مطالعہ نے ان کی زندگی کو کس حد تک متاثر کیا تھا، میسی نیون جب سورہ کہف پڑھتا تو اس کے چہرے پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی تھی، گوٹے Goethe قرآن پاک کے متعلق کہا کرتا تھا: "جب میں یہ کتاب پڑھتا ہوں تو میری روح میرے جسم میں کانپنے لگتی ہے" انامری شمل کی تصوف اسلام میں غیر معمولی دلچسپی جذبات و احساسات کی گہرائی کی غمازی، ایک بار ولی اللہ دہلوی کی تحریر دیکھ کر ان کے چہرے کی جو رنگت ہوئی اور جس طرح "برکت" کے خیال سے انہوں نے تحریر پرائنگلیاں پھیرنی شروع کر دیں اس سے ان کی قلبی کیفیات کا اندازہ ہوتا تھا، بعض اوقات جب مشرقین کی تنقید میں حصے زیادہ گرجوشتی دکھائی جاتی ہے تو بے اختیار خسرو کا یہ شعر زبان پر آ جاتا ہے، جو انہوں نے اپنے زمانہ کے مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے تھا۔

اے کہ طعنے زبت بہ ہند و بری ہم آموز از دے پرستش گری

راہ عمل | یہ ساری گفت گو بے معنی رہے گی اگر اس سوال پر غور نہ کیا جائے کہ آئندہ کے لئے راہ عمل کیا ہونی چاہئے؟ محض مشرقین کی تنقید کو مقصد بنا لینا یا ان کی علمی بددیانتیوں پر نوجہ کرتے رہنا قوائے ذہنی کے اضمحلال کی نشانی ہے

(۱) سب سے پہلی ضرورت یہ ہے کہ علوم اسلامی پر تحقیق کے نہایت اعلیٰ مرکز قائم کئے جائیں، اور دنیا کے ہر گوشے سے جدید سائنسی سہولتوں کو کام میں لا کر اسلامی علوم و فنون کے تمام ماخذ ان مرکزوں میں جمع کر دے جائیں، اس منصوبہ کی کامیابی کے لئے ضروری ہے کہ ہر ملک پہلے خود اپنے علمی سرمایہ کا جائزہ لے اور جس طرح مولانا سید عبدالحی مرحوم نے الثقافة الاسلامیۃ فی الہند میں ہندوستان کے علمی سرمایہ کا جائزہ لیا ہے، اسی طرح کے کام ہر ملک میں شروع کئے جائیں، بروکلین اور اسٹورٹ کی کوششیں چراغ راہ کا کام دے سکتی ہیں، لیکن منزل نیر بن سکتیں، ماخذ کے سلسلہ میں یورپ کی تمام علمی ختم ہونے کے بعد خود اعتمادی کا جو دور شروع ہو گا وہ علمی جدوجہد میں نئی توانائی پیدا کر دے گا۔



(۲) گویورپ نے اب تک حدیث، فقہ، تاریخ، ادب، جغرافیہ وغیرہ کے لاتعداد ماخذ شائع کیے ہیں، لیکن ابھی عربی، فارسی، ترکی زبانوں میں اسلامی تاریخ کے ایسے منابع موجود ہیں جن کی اشاعت سے تحقیق کی گزرگا ہیں روشن ہو سکتی ہیں اس کام کو بلا تاخیر شروع کر دینا چاہیے۔

(۳) اسلامی تاریخ، مذہب اور تمدن کے متعلق ایسی Encyclopaedia تیار کی جانی چاہئیں جن کی معلومات معتبر اور نقطہ نگاہ معروضی ہو، اور جن سے ان تمام غلط نظریات کی اصلاح ہو سکے جو مختلف طریقوں سے پھیلا گئے ہیں۔ جب انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے دوسرے ایڈیشن کا کام شروع ہوا تھا تو کچھ مسلمان فاضلوں نے اس کو یہودی مستشرقین کی منظم سازش سے تعبیر کیا تھا، لیکن وہ کام اپنی تکمیل کو پہنچنے والا ہے۔ اور مسلمان اپنی کوئی اسکیم اب تک بندے کا رہ نہ لاسکے اس سے بھی بڑھ کر افسوس کی بات یہ ہے کہ بعض مسلمان ممالک اسی انسائیکلو پیڈیا کو اپنی پنی زبانوں میں منتقل کر کے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ انھوں نے فرض کفایہ ادا کر دیا ہے، حال ہی میں مرسی الاٹڈ کی نگرانی میں ایک بڑا منصوبہ چودہ جلدوں میں انسائیکلو پیڈیا آف ریجن تیار کرنے کا بنایا گیا ہے، کیا مسلمانوں کے لئے اس طرح کے منصوبے تیار کرنے اور بروئے کار لانے کا وقت ابھی نہیں آیا؟ ڈاکٹر ذکی ولیدی طوغان نے مستشرقین کے غلط افکار و نظریات کی اصلاح کے لئے ترکوں کی تاریخ اور تمدن پر ایک بسیط کام کا خاکہ تیار کیا تھا، لیکن ڈاکٹر طوغان کی وفات کے بعد معلوم نہیں اس منصوبے کا کیا حشر ہوا، ایران نے Encyclopaedia Parsica کا منصوبہ تیار کیا ہے اور ہر چند کہ احسان یار شاطر کی نگرانی میں یہ کام ہو رہا ہے، لیکن حقیقی باگ ڈور امریکی مستشرقین ہی کے ہاتھ میں ہے، اس تجارت کا مقصد غلط نہ سمجھا جائے تو ان Encyclopa سے اپنے ذاتی تعلق اور معلومات کو بنا پر عرض کر دیں کہ جو عزم، لگن، جذبہ اور عالمانہ تیز نگاہی ان مستشرقین میں نظر آتی ہے، اس کا عشرہ بھی مسلمان فاضلوں میں نظر نہیں آتا۔

آج سائنس کے انقلابی انکشافات اور ترقیوں نے زمان و مکان کی پہنائیاں ختم کر دی ہیں، اور فکر و نظر کے نئے سانچے وجود میں آ رہے ہیں، بعض کام جدید سائنسی نظریات اور تجربات سے باخبر ہونے سے بغیر انجام نہیں دیے جاسکتے، اقبال فریضہ لکھتا تھا: "اسلامی ثقافت کے مورخ کی مشکل زیادہ تر اس سبب سے ہے کہ عربی کے ایسے علماء تقریباً مفقود ہیں جو سائنس کے مخصوص شعبہ جات کے تربیت یافتہ ہوں" اس لئے ضروری ہے کہ قدیم اور جدید علوم کے ماہرین ایک جگہ جمع ہوں اور اس کمی کو پورا

لے روزگار فقر۔

Prof. Mircea Eliade Encyclopaedia of Religion

Encyclopaedias

کریں، ہر عہد ایک نئے علم کا مطالبہ کرتا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس دور میں جب کہ انسان **وَسَخَّرَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ** اور اس نے تمہارے لئے رات اور دن اور سورج اور چاند کو مستخر کیا، کی مثال ہے ابھی کو پورا کیا ہوا نظر آ رہا ہے، نیا علم کا نام سائنس کو نظر انداز نہیں کر سہ گا، ایک زمانہ تھا جب علماء و مفکرین اور علماء نے (جن میں سر سید کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے، مذہب کے مسائل کے نظریات کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کی تھی، پھر ایک دور آیا جب مولانا ابوالکلام آزاد نے اعلان کیا کہ سائنس اور مذہب کی راہیں مختلف ہیں اور مذہب کو سائنس کے مطابق ثابت کرنا غیر ضروری ہے، لیکن آج وہ زمانہ آیا ہے کہ سائنس خود بچھاؤ پیکار کر رہی ہے کہ میں مذہب کے بنیادی نظریات کی تائید کرتی ہوں، وقت اور حالات کا یہ انقلاب عظیم اٹان ہے، ضرورت ہے کہ اس سے پوری طرح فائدہ اٹھایا جائے، اگر اس بنیادی ضرورت سے بے اعتنائی برتی گئی تو ہماری کوششوں کا حال یہ ہو گا کہ **خوب است و خوش است و بوند ارد**

بعض دینی علوم کا نئے انداز سے مطالعہ ضروری ہو گیا ہے۔ قرآن کے **Semantic** مطالعہ کو **Izutsu**

کے ہاتھ سے لے کر آگے بڑھایا جائے اور حدیث کے مطالعہ میں اور کے خطوط پر تحقیق و ترتیب کی نئی راہیں تلاش کرنی چاہئیں، علمائے اسلام نے علوم قرآن اور علم حدیث سے متعلق جو کام کیے ہیں وہ بلاشبہ مہتمم باشان ہیں، لیکن ضرورت ہے کہ ان کو آگے بڑھایا جائے، وقت کا ایک اور اہم تقاضا یہ ہے کہ فقہ اسلامی کی کتابوں کی ترتیب موجودہ دور کی ضروریات اور مزاج کے مطابق ہوتا کہ اسلامی نظام حیات کے افادی پہلو سامنے آسکیں آج جب کہ یورپ اور امریکہ میں اسلام سے چہیت دین غیر معمولی دلچسپی کا اظہار عوام میں ہو رہا ہے، اس کام کی ضرورت اور بڑھ گئی ہے، اس طرح نہ صرف میگزینوں، شاخات، اینڈرسن وغیرہ کے نظریات کی اصلاح ممکن ہو جائے گی بلکہ اسلام کے نظام حیات اور اسرار دین کے متعلق سوچنے کے نئے پہلو بھی آشکارا ہو جائیں گے، ڈاکٹر اقبال کی دور بین نگاہ نے اس کام کی اہمیت اور ضرورت کا اندازہ آج سے پچیس سال قبل لگایا تھا اور وہ خود مولانا انور شاہ صاحب کشمیری کی مدد سے فقہ اسلامی کو عصر حاضر کے مذاق کے مطابق پین کرنا چاہتے تھے، اس کام کو اب اور زیادہ ملتوی نہیں کیا جا سکتا۔

اس ساری جدوجہد میں اب درنگ اسی وقت پیدا ہو گا جب علی جذبہ سے سرشار مسلمان علماء اور فنکار عالم کو اپنی کھوئی ہوئی میراث سمجھ کر اس کام کی طرف متوجہ ہوں گے اور اپنے خون جگر سے اس کے خاکے میں رنگ بھریں گے، فاضل محترم مولانا ابوالحسن علی ندوی نے صحیح لکھا ہے کہ وقت کا تقاضا ہے کہ مسلمان علماء ایسی تصانیف تیار کریں جو اپنی تحقیقات کی اصلیت



Originality) مطالعہ کی وسعت، لفظ کی گہرائی، مآخذ کے استفادہ و صحت اور محکم استدلال میں مستشرقین کی کتابوں سے کہیں فائق اور تمماز ہوں<sup>۵۱</sup>۔

فرنگ سے بہت آگے ہے منزل مومن      قدم اٹھا! یہ مقام انتہائے راہ نہیں

# مشرقین اور علوم اسلامیہ

از

شیخ نذیر حسین، مدیر اردوان ایجوکیشنل سوسائٹی، لاہور

یورپ اور عالم اسلام کے باہمی تعلقات صدیوں سے قائم ہیں، یہ تعلقات شروع میں خالص تجارتی دینی اور علمی

تھے، بیت المقدس عیسائیوں کا دینی اور روحانی مرکز ہے، اس لئے فلسطین جانے والے عیسائی زائرین کی رہنمائی کے مختلف اوقات

میں ہدایت نامے، سفر نامے اور عربی بول چال کی کتابیں لاطینی رسم الخط میں لکھی گئیں، صلیبی جنگوں کے زمانے میں ایک دوسرے

کے علوم و فنون سے متعارف ہونے کے مزید مواقع پیدا ہوئے۔ ازمنہ وسطیٰ میں اندلس ہی تعلیم و تدریس کا مرکز تھا، لہذا اطالوی

اور فرانسیسی طلبہ ایشیلیہ اور قرطبہ کا رخ کیا کرتے تھے، ان کے طفیل کندی، فارابی، ابن سینا اور ابن رشد کی بہت سی کتابیں

لاطینی زبان میں منتقل ہوئیں، یورپ میں دیکھنے والے روم کا صدر مقام اور عیسائیت کی تعلیم و تدریس کا بڑا مرکز ہے، یہاں کے

فارغ التحصیل دینی مناصب پاتے تھے، اور اپنے اپنے ملکوں میں جا کر تعلیم و تعلم کا فریضہ انجام دیتے تھے، یہ طلبہ عربی زبان سے

بھی بقدر ضرورت واقف ہوتے تھے۔

عبرانی اور عربی زبانوں کی تحصیل کی طرف رغبت اور شوق کا ایک بڑا سبب کتاب مقدس کا علمی و تحقیقی مطالعہ تھا،

چنانچہ سولہویں صدی عیسوی میں تورات کے ترجمے مختلف یورپی ممالک میں شائع ہوئے جن کی اصل عبرانی اور عربی تھی، کتاب

مقدس کے تراجم میں لبنان کے عیسائی فضلاء کی علمی معاونت بھی شامل تھی، لبنان کے مارونی عیسائیوں کے پاپائے روم سے

صدیوں سے تعلقات چلے آتے ہیں۔

مشرقی بالخصوص اسلامی زبانوں کی ترویج و اشاعت کا دوسرا بڑا محرک یورپی استعمار تھا، انیسویں صدی عیسوی

میں فرانس نے الجزائر، مراکش اور تونس پر قبضہ کر لیا، برطانیہ نے ہندوستان پر اپنی حکومت قائم کر لی، ولندیزیوں نے انڈونیشیا

پر قبضہ جمایا، روس نے ترکستان کو غصب کر لیا، اطالیہ نے طرابلس کو ہتھیایا اور برطانیہ نے مصر پر اپنی سیادت قائم کر لی،

پہلی جنگ عظیم کے اختتام پر برطانیہ نے عراق اور فلسطین اور فرانس نے شام اور لبنان پر انتداب قائم کر لیا۔



ان مفتوحہ اور زیر حمایت ممالک کے علوم و آداب اور رسوم و رواج سے واقفیت پیدا کرنے کے لئے متعدد ادارے وجود میں آئے، ابتداء میں ان اداروں میں کام کرنے والے زیادہ تر اہل کلیسا تھے، جو ذہنی عصبیت سے محفوظ نہ تھے، ان کے بعد بہت سے حقیقی عالم بھی پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی زندگیوں میں علوم اسلامیہ کی تحقیق و اشاعت میں صرف کردیں، انہیں اسلام اور مسلمانوں سے کوئی خاص عناد یا بغض نہ تھا، ان میں سے ہر یورپی ملک کے شیدائیانِ علم اور ان کے علمی کاموں کا سطور ذیل میں تعارف کرایا جاتا ہے:

**اطالیہ** | جامعہ روما میں علوم عربیہ کا شعبہ ۱۲۲۸ء سے قائم ہے، اطالیہ کے دوسرے شہروں میں بھی علوم عربیہ کی تدریس و تحقیق کا انتظام ہے، ان میں پاپائے روم کا مدرسہ لغات مشرقیہ خاص طور پر قابل ذکر ہے جس میں سریانی، عبرانی، آرمی اور عربی زبانوں کی اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے، یہاں قلمی کتابیں بھی کثیر تعداد میں موجود ہیں، یورپ میں سب سے پہلے اطالیہ کے مختلف شہروں سے عربی کتب کی اشاعت کا آغاز ہوا، چنانچہ ابن سینا کا القانون فی الطب ۱۴۳۳ء میں میلان سے شائع ہوا، ابن رشد کی شروح مؤلفات ارسطو بارہ جلدوں میں ۱۵۶۰ء میں شائع ہوئی، اس کے بعد بہت سے تراجم شائع ہوئے انیسویں صدی عیسوی اطالیہ میں عربی زبان کے علوم و فنون کا زریں دور ہے، اس زمانہ میں بہت سے نامور علماء مشرقیات پیدا ہوئے، جن میں مندرجہ ذیل خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

امیر کایتانی (۱۸۶۹ء تا ۱۹۲۶ء)، اطالیہ کا مشہور فاضل اور امیر کبیر تھا، جس نے اپنی دولت عربی مخطوطات کے جمع کرنے میں صرف کر دی، اس کی زندگی کا سرمایہ تاریخ اسلام کی تالیف ہے، جس میں سنہ ۱۹۲۲ء تا ۱۹۵۶ء تک مذکور ہیں، اس کی صرف پانچ جلدیں جو ۱۳۲۰ھ تک محیط ہیں چھپ چکی ہیں، اس کا دوسرا سرمایہ عمر شخصیات العالم الاسلامی (علمائے اسلام کے تراجم، ان کے مؤلفات اور مصادر کا ذکر) ہے، جس کی دو جلدیں ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئیں بقایا کام ان کی موت کی وجہ سے پورا نہ ہو سکا، ان کا جمع کردہ کتب خانہ مخطوطات عربیہ کا بیش قیمت خزانہ ہے۔

اغناطوس گڈی (۱۸۲۲ء تا ۱۹۲۵ء) جامعہ مصریہ میں عربی زبان و ادب، تاریخ و جغرافیہ کا استاد تھا اور صحیح عربی زبان میں درس دیا کرتا تھا، کتاب الاغانی کی فارسی اس کی علمی یادگار ہے۔

کارلو نیلینو (۱۸۴۲ء تا ۱۹۳۸ء) عربی بے تکلف لکھتا اور بولتا تھا، اور جامعہ مصریہ میں علم الفلک کا درس دیا کرتا تھا، تاریخ علم الفلک عند العرب اس کی مشہور کتاب ہے۔

لوسانی (المولود ۱۹۲۱ء) نے قرآن پاک کا اطالوی زبان میں ترجمہ کیا ہے، اسے اردو اور فارسی سے زیادہ شغف تھا، محمد اقبال، دانتے و اقبال اس کی تصانیف ہیں، الشرق الحدیث (Orient Moderno) اطالیہ کا مشہور علمی و تحقیقی رسالہ ہے۔

فرانس | اہل فرانس اور عالم عرب کے درمیان تجارتی اور ثقافتی تعلقات صدیوں سے قائم ہیں، صلیبی جنگوں، تجارتنی سرگرمیوں، سفیروں کے تبادلے اور شمالی افریقہ اور شام و لبنان میں فرانسیسی اثر و نفوذ نے ان تعلقات کو مستحکم کرنے میں بڑی مدد کی ہے، فرانسیسیوں نے عربی علوم و فنون، اندلس اور صقلیہ (سسیلی) کے مدارس سے حاصل کئے، ۱۲۸۵ء میں علوم مشرق کی تدریس کے لئے ایک درسگاہ قائم کی گئی، چودھویں صدی عیسوی میں جامعہ پیرس میں شعبہ عربی کا قیام عمل میں لایا گیا، جو کہ سوریوں کے عربی شعبہ کی شاخ تھی، اس کے بعد فرانس کی بیشتر جامعات میں عربی زبان و ادب اور علوم اسلامیہ کی تدریس کا اہتمام ہوا، ۱۶۹۱ء میں عربی ٹیپ کا پرپس قائم ہوا، فرانسیسی سیاحوں نے شام اور مصر کا سفر کر کے متعدد سفر نامے لکھے۔ فرانسیسی علماء مشرقیات میں بیرن دی ساسی (۱۶۵۸ء تا ۱۸۳۸ء) اتاذ الاسانذہ کا درجہ رکھتا ہے، اس کا نمایاں علمی کارنامہ مقامات حریری (متن و ترجمہ) کی اشاعت ہے، اس کے بعد کا ترمیر (۱۶۸۲ء تا ۱۸۵۲ء) کا نام قابل ذکر ہے، جس نے مقدمہ ابن خلدون تین جلدوں میں شائع کیا۔

بیرن دی سلان (۱۸۰۱ء تا ۱۸۷۷ء) فرانس اور جرمنی کے متعدد علماء و فضلاء کا استاذ اور شیخ المستشرق تھا، اس کا بڑا کارنامہ مقدمہ ابن خلدون اور وفیات الاعیان (ابن خلدون) کا انگریزی ترجمہ ہے۔ ہارٹوک دیرتبرغ (۱۸۲۳ء تا ۱۹۰۵ء) نے مکتبہ اسکوریال (اپین) کے عربی مخطوطات کی فرست دو جلدوں میں شائع کی، کتاب (سیبویہ) کا متن اور فرانسیسی ترجمہ مفید حواشی کے ساتھ شائع کر لیا، تاریخ الفخری کی عمدہ اشاعت بھی اس کا کارنامہ ہے۔

پروفیسر (۱۸۹۳ء تا ۱۹۵۶ء) نے اپنی ملازمت کا آغاز جامعہ الجزائر سے کیا، اسے اندلس اور شمالی افریقہ کی تاریخ اور علوم و ادب سے دلچسپی رہی ہے، بے شمار مقالات کے علاوہ اس کا نمایاں علمی کام جمہورۃ انساب العرب (ابن حزم) کی تصحیح اور اشاعت ہے۔

لویس ماسینون (۱۸۸۳ء تا ۱۹۶۲ء) بیسویں صدی کا ممتاز فرانسیسی مستشرق تھا، اس نے مالک عربیہ



کے متعدد سفر کیے اور علاقے اسلام سے ذاتی تعارف پیدا کیا، اسکی دلچسپی کامرکز اسلامی تصوف رہا ہے، کتاب الطوائف (حلج) کو پہلے پہل اسی نے شایع کیا۔

لاؤسٹ (مولود ۱۹۰۵ء) کو امام ابن تیمیہ کے افکار اور ان کی تصانیف سے بڑی دلچسپی ہے، چارلس پیلا سوربون میں عربی زبان کا اتاذ اور مجلہ اریبیکا (Arabica) کا سکریٹری ہے اس نے جاحظ کے متعدد رسائل تصحیح و تعلیق کے ساتھ شایع کیے ہیں، قوی کتب خانہ پیرس میں عربی کی ہزاروں کتابیں ہیں، فرانسیسی زبان میں مستشرقین کی تحقیقی رسائل شایع ہوتے رہے جن کا موضوع عربی زبان و ادب اور عالم اسلامی کے حالات و مسائل ہوتے ہیں

ہالینڈ | فرانس کے بعد ہالینڈ عربیات اور اسلامیات کی تدریس کا بڑا مرکز ہے، لائپڈن یونیورسٹی میں عربی زبان کی تعلیم و تدریس کا شعبہ ۱۷۱۳ء سے کام کر رہا ہے، مشہور عالم مطبع بریل کو مشرق بریل نے ۱۸۱۷ء میں قائم کیا تھا، یہ مطبع پانچ سو سے زائد علوم مشرقیہ کی کتابچہ چھاپ کر شایع کر چکا ہے، جن میں نصف عربی زبان میں بڑی کتب خانہ لائپڈن یونیورسٹی میں عربی کی آٹھ جلدوں میں اشاعت ایک بڑا علمی کارنامہ ہے، الجامع الصبح للبخاری کا ایک عمدہ ایڈیشن ۱۸۷۰ء میں لائپڈن سے شایع ہوا تھا، انسائیکلو پیڈیا آف اسلام بھی لائپڈن سے چھپ کر شایع ہو رہا ہے، اس کی جدید اشاعت جس میں مسلم ممالک کے اہل علم کے مقالات بھی شامل ہیں، ہر لحاظ سے مستحق تعریف و تحسین ہے، ہالینڈ کے علاقے مشرقیات نے مختلف ادوار میں علوم اسلامیہ کی بڑی خدمت کی ہے، انہیں سے ممتاز علماء کے نام یہ ہیں:

ڈوزی (۱۸۲۰ء، ۱۸۸۳ء) نے تاریخ انڈس چار جلدوں میں لکھی، تکملة معاجم العربیة اس کی زندگی کا بڑا کارنامہ ہے۔

ڈوخویہ (۱۸۳۶ء، ۱۹۰۹ء) نے فتوح ابلدان (البلاذری) اور الطبری کی تاریخ الرسل والملوک دوسرے علماء کے اشتراک سے شایع کی، اس عظیم الشان کتاب کا انڈکس اور مختلف ذرائع علمی کام کرنے والوں کے لئے ایک بڑی نعمت ہیں۔

وینک (Wensinck) (۱۸۸۱ء تا ۱۹۳۹ء) المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی کی سات ضخیم جلدوں میں تدوین اور اشاعت اس کی زندگی کا بڑا کارنامہ ہے، اس کام میں اس کے اور اس کے رفقاء کے تین برس صرف ہوئے، یہ الفاظ حدیث کا انڈکس ہے جس کی مدد سے ہم بقید ابواب ہر حدیث کو اس کے مقام پر تلاش کر سکتے ہیں۔

جرمنی (المانیہ) | جرمنی کا عالم اسلام سے تلمیذ رابطہ دوسری عالمی جنگ (۱۹۱۴ء، ۱۹۱۸ء) سے شروع ہوا ہے جامعہ

ہائید لبرگ میں عربی زبان کا شعبہ چودہویں صدی کے اواخر سے کام کر رہا ہے، اٹھارہویں صدی عیسوی کے وسط اور شہنائہ فرڈینانڈ کے عثمانی مصلطین سے سیاسی و تجارتی تعلقات قائم ہوئے، انیسویں صدی کے آغاز میں روسی ساسی کے جرمن شاگردوں کے فیض سے علوم اسلامیہ کی اشاعت اور تحقیق میں بڑی ترقی ہوئی، ان میں سے سربراہ آدرہ علامہ کے نام یہ ہیں:

فریٹاغ (۱۸۶۸ء تا ۱۸۸۶ء) نے دیوان الحماہ بشرح البتیری مع حواشی و فہارس بون سے شایع کیا، عربی، لاطینی لغت بھی اسی کی علمی کاوش کا نتیجہ ہے۔

فلوگل (۱۸۱۳ء تا ۱۸۸۶ء) نے حاجی خلیفہ کی کشف الظنون (متن و لاطینی ترجمہ) تیرہ برس کی محنت شاقہ کے بعد شایع کی، نجوم الغرقان فی اطراف القرآن اس کا دوسرا کارنامہ ہے، یہ الفاظ قرآن کا انڈکس (اشاریہ) ہے۔

فلامیٹر (۱۸۰۱ء تا ۱۸۶۷ء) جمعیتہ الشرقیۃ الالمانیہ کا بانی تھا، اس نے تفسیر بوہنادی، المفصل (الزحشری)، اور دوسری کتابیں مفید حواشی کے ساتھ شایع کیں۔

دسٹفلٹ (۱۸۰۵ء تا ۱۸۶۹ء) نے ساٹھ برس عربی زبان، اس کے علوم و آداب کی خدمت کی، وفيات الاعیان (ابن خلکان)، تہذیب الاسامی (نوی)، طبقات الحفاظ (الذہبی)، کتاب المعارف (ابن قتیبہ)، تاریخ مکہ، سیرت ابن ہشام و معجم البلدان (یاقوت) وغیرہ کی تصحیح اور اشاعت اس کی زندگی کا عظیم الشان کارنامہ ہے۔

آلورٹ (۱۸۳۸ء، ۱۹۰۹ء) فرسٹ ملکہ برلن اس کی فضیلت پر شاہد ہے۔

یان (Jahn) (۱۸۳۷ء تا ۱۹۱۶ء) نے شرح المفصل (ابن یعیش) مفید تعلیقات کے ساتھ شایع کرنے کے علاوہ کتاب (سیبویہ) کا جرمن میں ترجمہ شایع کیا، جو حیرت انگیز کارنامہ ہے۔

زخاؤ (۱۸۴۵ء تا ۱۹۳۰ء) فلاشر کا شاگرد و رشید تھا، البیرونی کی تحقیق ماللہند (متن و انگریزی ترجمہ) اور الآثار الباقیہ (متن و انگریزی ترجمہ) اس کی یادگار ہیں۔

کارل بروکلمان (K. Brockelmann) (۱۸۶۸ء تا ۱۹۵۶ء) امام المشرقین ہے، اس کا غیر وانی کارنامہ تاریخ الادب العربی کی تالیف ہے (پانچ جلدیں، مطبوعہ لائیڈن) اس کی وسعت معلومات پر ایک طالب علم حیرت زدہ ہو کر رہ جاتا ہے، عالم عرب کی مطبوعات کے علاوہ امرتسر، دہلی اور بھوپال تک کی چھپی ہوئی کتابیں اس کی دسترس میں ہیں، سارے جہان کے کتب خانوں کی قلمی کتابوں کی فہارس اس کے پیش نظر ہیں، سوانح اور تراجم کی کتابیں اس کی نوک زبان

ہیں، لیکن افسوس کے ساتھ یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ اس کی تاریخ اسلام (جس کا عربی میں ترجمہ تاریخ الشعوب الاسلامیہ کے نام سے ہو چکا ہے) اس کے دامن فضیلت پر بدنامی دھبہ ہے، اس میں جا بجا یورپ کے روایتی مسیحی تعصب کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔

فیشر (۱۸۶۵ء تا ۱۹۳۹ء) نے معجم اللغة العربیة کی جمع و ترتیب میں چالیس برس گزار دیے، اس عظیم الشان لغت کا مدار قدیم عربی کتب لغت پر ہے، المجموع اللغوی (قاهرہ) کے اہتمام میں اس کے چند اجزاء شائع ہوئے ہیں، ہیلوٹ رٹر (H. Ritter) (۱۸۹۳ء تا ۱۹۶۶ء) نے اپنی عمر گراں مایہ کے تین سال استنبول کو کتنجانو میں نادر کتابوں کی تلاش میں بسر کر دیے، عربی کتابوں کی اشاعت کے لیے مکتبہ اسلامیہ استنبول میں قائم کیا جس کے اہتمام میں مقالات الاسلامیہ (اشعری) اور انسداد البلاغۃ (عبدالقادر الجرجانی) (تین و جرمین ترجمہ) وغیرہ نہایت آب و تاب سے شائع ہو چکی ہیں، الصفدی کی الوانی بالوفیات عربی میں سوانح و تراجم کا بڑا خزانہ ہے، اس کی سترہ جلدیں رٹر اور اس کے رفقا اور تلامذہ کے طفیل اب تک اشاعت پذیر ہو چکی ہیں۔

فواد سیزگین: ایک ترک عالم اور رٹر کا شاگرد رشید ہے، اس نے اجماع الصحیح البخاری کے مصادر و مآخذ پر ترکی زبان میں ایک کتاب لکھی ہے، مجاز القرآن (ابو عبیدہ معمر بن مثنیٰ کو نہایت محنت سے شائع کیا ہے، کارل برودکلان کی تاریخ الادب العربیہ کو نظر ثانی اور مفید اضافوں کے ساتھ جرمن زبان میں شائع کیا ہے، اب تک اس جلیل القدر کتاب کی پانچ جلدیں شائع ہو چکی ہیں جو فاضل مصنف کی فضیلت پر شاہد ہیں، اسے فیصل انعام بھی ملا ہے۔ انعام کی رقم کو اس نے یونیورسٹی میں اسلامی طب کی تاریخ کے مطالعہ کے لئے وقف کر دیا ہے۔

روڈی پیرٹ نے قرآن مجید کا جرمن زبان میں ترجمہ تین جلدوں میں شائع کیا ہے، کہا جاتا ہے کہ یہ ترجمہ سب جرمن ترجموں میں بہتر اور مستند ہے۔

آخر میں ایک جرمن نژاد مستشرقہ مسز این میری شیل کا ذکر بھی ضروری ہے۔ موصوفہ کو مولانا روم اور علامہ اقبال کے افکار و اشعار اور پھر خواجہ میر درد کے طریقہ محمدیہ سے بڑا شغف ہے۔ انھوں نے اقبال کے سوانح اور شاعری پر انگریزی میں ایک کتاب لکھی ہے، جاوید نامہ کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا ہے اور ہندوستان کے مسلمانوں کی تاریخ (۱۱ء تا ۱۹۳۴ء) پر ایک کتاب Islam in the Indian Subcontinent کے نام سے لکھی ہے



استنبول کے علمی شخصیات سے ہماری واقفیت اور شناسائی تمام ترجمان مستشرقین کی علمی مراعات کی مدد سے ہوئی ہے۔  
جرمنی کی ہیریورسٹی میں عربی اور اسلامی کتب کا پیشہ ہماؤ خیرہ موجود ہے، علوم اسلامیہ پر مباحث اور مقالات  
کے لئے مجلہ الاسلام (جرمنی) اور مجلہ عالم اسلام (لائپزگ) قابل ذکر ہیں، لائپزگ اور ہیریورس کے عربی پریس  
صحبت طباعت کے لئے سارے ہی پڑھنے والے اور ہیں۔

آسٹریا ہنگری | آسٹریائی مستشرقین کی قوم زیادہ تر ترکی ادبیات تک محدود رہی ہے، ان میں سمر بر آہرودہ عالم مشرقیات گولڈنیر  
(۱۸۵۰ء تا ۱۹۲۱ء) تھا، جس نے قاہرہ جا کر مفتی محمد عبدہ سے بھی استفادہ کیا تھا، اس کی تصانیف میں حدیث کے مطالعات کی  
یورپی حلقوں میں بڑی دھوم مچ رہی ہے، اس کتاب کا انگریزی میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔

عبدالکریم جرانوس (۱۸۸۳ء تا ۱۹۶۹ء) نے اپنی زندگی کا آغاز شانتی نکیتن میں اتاذ عربی سے کیا (۱۹۲۹ء تا  
۱۹۳۲ء) بعد ازاں انھوں نے جامعہ ملیہ جا کر اسلام قبول کر لیا اور قاہرہ پہنچ کر شیوخ ازہر سے علم کی تکمیل کی وطن واپس آکر بوڈا  
یونیورسٹی میں ایک عرصہ تک صدر شعبہ مشرقیات رہے، ترکی زبان و ادب کے متعلق ان کی تحقیقات اہم نتائج کی حامل ہیں، وہ حج  
سے بھی سرفراز ہوئے تھے۔

روس | روس کی جامعات میں عربی، فارسی اور ترکی زبانوں کی تعلیم و تدریس کا انتظام بڑے عرصہ سے قائم ہے، روسی علماء نے  
الفارابی، ابن سینا اور البیرونی کی کتابوں کے روسی زبان میں تراجم شایع کیے ہیں، جدید عربی زبان کے نادوں، ڈراموں اور  
افانوں کی بیشتر تعداد روسی زبان میں منتقل ہو چکی ہے۔

علمی تحقیقات کے سلسلہ میں کراٹشوہسکی (۱۸۸۳ء تا ۱۹۵۱ء) کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے، اس نے شام اور لبنان  
میں ایک عرصہ تک قیام کر کے وہاں کے ادب سے ذاتی مراسم پیدا کیے تھے، اس کی تصانیف میں قرآن مجید کا روسی ترجمہ خاص اہمیت  
رکھتا ہے۔

کتاب البدیع (ابن المعتز) اس کی تصحیح و تفسیر سے پہلی دفعہ شایع ہوئی، عرب جغرافیہ نویسوں کے حالات اور کارناموں کے  
متعلق اس کی کتاب کا عربی میں ترجمہ تاریخ الادب الجغرافی کے نام سے چھپ چکا ہے۔

کسی زمانہ میں قازان کے عربی مطابع ترکستان بھر میں مشہور تھے، لیکن اب عربی کی دینی کتب کی طباعت اور اشاعت  
حکماً ممنوع ہے، وسط ایشیا کی بعض جامعات نے فارابی، ابن سینا اور البیرونی کی چند کتابیں شایع کی ہیں، ادھر چند سالوں

سے صرف قرآن پاک کی طباعت سرکاری انتظام میں ہونے لگی ہے  
 انگلستان | آکسفورڈ اور کیمبرج کی جامعات میں عربی زبان و ادب کے شعبے اٹھارہویں صدی عیسوی سے قائم ہیں، لندن  
 میں سکول آف اوریینٹل اینڈ افریکن اسٹڈیز ۱۹۱۶ء سے کام کر رہا ہے، اور نامور مستشرقین مثلاً سرتھامس آرنلڈ اور سٹر  
 گب اس درسگاہ سے وابستہ رہے ہیں، انگلستان کے معروف مستشرقین اور ان کی علمی خدمات کا تذکرہ سطور ذیل میں  
 درج ہے۔

جارج ییل (۱۷۹۶ء، ۱۸۳۶ء) نے انگریزی زبان میں قرآن پاک کا ترجمہ کیا، جو غالباً فرانسیسی ترجمہ سے ماخوذ ہے  
 اس کے مقدمہ میں مترجم نے عجیب و غریب خیالات کا اظہار کیا ہے۔

ایڈورڈ ٹین (۱۸۱۶ء، ۱۸۶۶ء) : مد القاموس (عربی، انگریزی لغت) اس کی تین سالہ کاوش کا نتیجہ ہے، یہ  
 لغت نہایت معتبر اور مستند مانی جاتی ہے، الف لیلہ کا انگریزی ترجمہ (چھ جلدیں) اس کی علمی یادگار ہے۔

ایڈورڈ ڈہنری پامر (۱۸۳۰ء، ۱۸۶۶ء) عربی نظم و نثر پر کیاں قدرت رکھتا ہے، ترجمہ قرآن کریم اور دیوان البہار  
 زہیر (متن و انگریزی ترجمہ) اس کا بڑا کارنامہ ہے۔

ولیم رائٹ (۱۸۳۰ء تا ۱۸۸۹ء) نے ڈوزی سے علوم عربیہ کی تکمیل کی تھی اس کا علمی کارنامہ الکامل (المبرد) کی تین  
 جلدوں میں اشاعت ہے، عربی قواعد پر اس کی انگریزی کتاب نہایت مفید اور جامع ہے۔

سر ولیم میور (۱۸۰۹ء تا ۱۸۶۵ء) سابق گورنر یو۔ پی (اٹر پردیش) لائف آف محمد اور تاریخ الخلفاء کا مصنف،  
 یہ دونوں کتابیں متنازع فیہ چلی آرہی ہیں، سر سید نے لائف آف محمد کے جواب میں اپنی مشہور کتاب خطبات احمدیہ لکھی تھی۔  
 سر چارلس لائل، انڈین سول سروس کا ممبر اور سی۔ پی (مدھیہ پردیش) میں کسٹرن تھا، اشعار جاہلیت اس کا خاص  
 موضوع تھا، المفضلیات (الغنی، بشرح الانباری) متن و انگریزی ترجمہ کی اشاعت اس کی یادگار ہے۔

ایڈورڈ جارج براؤن (۱۸۹۲ء، ۱۹۲۶ء) کیمبرج میں عربی و فارسی کے ممتاز اساتذتھے، تاریخ ادبیات  
 ایران (چار جلدیں) ان کا عظیم الشان کارنامہ ہے، چار مقالہ (متن و انگریزی ترجمہ) اور بہاب الالباب کی اشاعت  
 بھی ان کی علمی کاوش کی مرہون منت ہے۔

سرتھامس آرنلڈ (۱۸۶۳ء، ۱۹۳۰ء) علی گڑھ کالج اور گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے پروفیسر تھے،

۱۹۰۵ء میں لندن یونیورسٹی کے اسٹاذ عربی بن کر واپس چلے گئے، شبلی اور اقبال کے علمی ذوق کو پختہ کرنے میں ان کا بڑا دخل ہے، ان کی مشہور کتاب پرینچنگ آف اسلام (دعوت اسلام) کا اردو، عربی اور ترکی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے، اخیر زمانے میں ان کی توجہ کامرکز اسلامی مصوری بن گئی تھی۔

مارگولیتھ (Margoliouth) (مرجلیوٹ) (۱۸۵۶ء تا ۱۹۴۰ء) آکسفورڈ یونیورسٹی کا نامور عربی فاضل جو

بے تکان عربی بولتا اور لکھتا تھا، تفسیر بیضاوی (سورہ آل عمران)، اور رسائل ابی العلاء المعری کا انگریزی ترجمہ اس کا مشہور علمی کارنامہ ہے، معجم الادبار (یا قوت حموی) اور کتاب الانساب (السمعیانی) کی اشاعت اس کی علمی کاوش کا نتیجہ ہے، اس کی لائف آف محمد علی حلقوں میں تنقید اور تردید کا موضوع بنی رہی ہے، اس کی غلط بیانیوں کو دیکھتے ہوئے مولانا شبلی مرحوم کو سیرۃ النبی کی ایف کا خیال پیدا ہوا تھا۔

ریٹارڈ نکلسن (۱۸۶۸ء تا ۱۹۲۵ء) کیمبرج یونیورسٹی میں عربی و فارسی کے استاد تھے، انھیں تصوف اسلام سے بڑی

دلچسپی تھی، منتخبات دیوان شمس تبریز، کشف المحجوب (داتا گنج بخش بھیروی)، اسرار خودی (اقبال) اور ثنوی مولانا کے اردم کے انگریزی تراجم ان کے قابل ستائش کارنامے ہیں۔

کرنکو (Krankow) (۱۸۶۲ء تا ۱۹۵۲ء) نسلا جرمن تھے، لیکن انگریزی قومیت اختیار کر لی تھی، اسلام

قبول کرنے کے بعد انھوں نے اپنا نام محمد سالم کر نکوی رکھ لیا، جمرۃ فی اللغۃ (ابن درید) اور تنقیح المناظر (قطب الدین شیرازی) اور الدرر الکامنه (ابن حجر) اور بہت سے عربی دواوین کی اشاعت ان کی زندگی کا بہترین کارنامہ ہے۔

آربری (Arberry) (۱۹۰۵ء تا ۱۹۷۵ء) جامعہ مصریہ قاہرہ میں قدیم زبانوں کے استاد تھے، پھر

انڈیا آفس لندن میں لائبریرین بن گئے، بعد ازاں کیمبرج یونیورسٹی میں شعبہ عربی اور فارسی کے استاد مقرر ہوئے، تصوف اسلام سے انھیں بڑا شغف تھا، کتاب التعرف (الکلاباذی) کتاب المواقف کی تصحیح و اشاعت اور قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ ان کی یادگار ہے، نثر فارسی کی تاریخ انگریزی میں لکھی ہے اور حکایات رومی کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے۔

برطانوی مستشرقین میں ہلٹن گب کا نام بھی ذکر کے قابل ہے، عالم اسلامی کی تحریکات سے انھیں بے حد دلچسپی

تھی، عربی زبان کے جدید ادب پر ان کی نظر بڑی گہری اور باقدار تھی

زمانہ حال میں معظمی داٹ کی کتابوں نے بڑی شہرت پائی ہے، لیکن وہ دوسرے درجے کا مستشرق ہے اور



اور اُس کی معلومات کا انحصار عربی کتب کے انگریزی و فرانسیسی تراجم پر ہے۔

امریکہ | امریکہ میں استشرق کی تاریخ کی ابتداء انیسویں صدی کے اوائل سے ہوتی ہے، لبنان کے عیسائی فضلا امریکہ کی یونیورسٹیوں میں علوم عربیہ کا درس دیتے رہے ہیں، ان میں قابل ذکر ذلیپ خوری ہٹا ہے جس کی ہسٹری آف عربز (عربوں کی تاریخ) مقبول عام کتاب ہے، اس نے لبنان اور شام کی تاریخ بھی انگریزی میں لکھی ہے۔

جارج سارٹن (۱۸۸۲ء تا ۱۹۵۶ء) بلجیم کا رہنے والا تھا، لیکن پہلی جنگ عظیم کے بعد امریکہ چلا آیا تھا اور امریکہ

شہریت اختیار کر لی تھی، اسے عربوں کے علوم و فنون کی تاریخ سے بڑی دلچسپی تھی، اس شوق میں اس نے بیروت میں ایک عرصہ قیام کر کے عربی زبان سیکھی، اس کا عقیدہ تھا کہ صرف عربی زبان کے ذریعہ قدیم یونانی علوم و فنون تک رسائی ہو سکتی ہے اور یونانی اور لاطینی زبانوں کے درمیان عربی ہی واسطہ العقده ہے، اس نے کئی سالوں کی محنت شاقہ کے بعد انگریزی میں

ہسٹری آف سائنس (Introduction to History of Science) (تاریخ العلوم) کے نام

سے ایک کتاب پانچ ضخیم جلدوں میں لکھی ہے جس میں مسلم علماء اور حکماء کے سائنسی کارناموں کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے، اس عظیم الشان کتاب کے بعض حصے عربی میں منتقل ہو کر قاہرہ سے شایع ہو چکے ہیں۔

فرانز رد زٹال ایک جرمن مستشرق ہے جو کسی امریکی یونیورسٹی سے متعلق ہے، اس نے مقدمہ ابن خلدون کا انگریزی

میں ترجمہ کیا ہے، مسلمانوں کی تاریخ نویسی کی تاریخ کے علاوہ اسلام میں علم کے تصور پر ایک بلند پایہ کتاب لکھی ہے جو سید مقبول ہوئی ہے۔

خاتمہ | یہیں تسلیم ہے کہ بعض مستشرقین کی کتابوں میں یورپ کے روایتی مسیحی تعصب کی جھلک بھی نظر آتی ہے، یہیں یہ

بھی اقرار ہے کہ ان سے دانستہ اور دانستہ غلطیاں بھی ہوتی ہیں، لیکن ساتھ ہی علمی دیانت کا تقاضا ہے کہ ان کی تلاش و محنت

اور شوق علم یا جنون علم کا کھلے دل سے اعتراف کیا جائے، یورپ کے مشرقی علوم کے فاضلوں کی محنت کی بدولت اسلامی تاریخ،

جغرافیہ، ادب، شعر، لغت، تفسیر اور فلسفہ اور دوسرے بہت سے علوم کے متعلق سیکڑوں کتابیں تصحیح و تعلق سے نہایت عمدگی

کے ساتھ چھپ کر شایع ہو چکی ہیں، جن کے نام صرف کتابوں میں مذکور تھے۔

جس محنت سے ایڈورڈ لین نے عربی، انگریزی لغت کو ترتیب دیا، زخاؤ نے کتاب السنہ کی تصحیح کی، ڈخویہ نے تاریخ الطبر

کو، فلوگل نے کشف الظنون کو، رائٹ نے المبرد کی الکامل کو، وٹسٹنفلٹ نے سیرت ابن ہشام کو، رٹر نے مقالات الاسلاب

اور عبدالقادر جانی کی اسرار البلاغہ کو اور دوسرے مشرقین نے سیکڑوں کتابوں کو برہمابرس کی جس محنت جانفشانی اور قہم اور تہیہ اور مختلف فہارس کے ساتھ چھاپ کر شایع کیا اس کے لئے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔

دینک اور اس کے رفقاء نے تین برس کی محنت شاقہ کے بعد کتب حدیث کا انڈکس بنام المعجم المفہرس لالفاظ الحدیث النبوی سات ضخیم جلدوں میں مرتب کر کے شایع کیا ہے، جو عصر حاضر کا عظیم کارنامہ ہے، مسلم ممالک کی تاریخی عمارتوں اور ان کے قیون لطیفہ پر) اکر یوں کی شہادتھانیف بھی قابل توجہ ہیں۔

ہمارے ہاں صرف شعر و شاعری کو ادب سمجھا جاتا ہے، مشرقین نے نثر کو بھی برابر کا درجہ دیا، ہمارے ہاں نقد الادب پر گفتی کی چند کتابیں تھیں، مشرقین نے ادبی تنقید کو ادب کی مستقل اور اہم شاخ بنا دیا ہے۔

ہمارے ہاں علماء، ادباء اور شعرا کے سیکڑوں تذکرے تھے، لیکن عمدہ عمدہ کی مسلسل و مربوط علمی و ادبی تاریخ ناپید تھی، مشرقین نے اس خلا کو پُر کیا

اسلامی ادبیات کی تاریخ کے لیے براؤن کی تاریخ ادبیات ایران، بروکلین کی تاریخ الادب العربی اور اسٹوری کی پرشین لٹریچر آج بھی مستند اور معتبر مآخذ کا درجہ رکھتی ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہمارے نوجوان علماء مشرقین سے شوق علم، لگن اور محنت کا سبق لیں اور ان کی غلطیوں کو تاملوں اور فرد گزشتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے علوم اسلامیہ کی خدمت ان سے بہتر اور احسن طریقہ پر سرانجام دیں۔

نذیر حسین، ۱۹۸۳ء/۲/۸

# پروفیسر اجناس گولڈزیر

از

مولانا سعید احمد اکبر آبادی، علی گڑھ

ولادت ہنگری کے ایک شہر (Szikesfehervar) میں ۲۲ جون ۱۸۵۰ء کو ہوئی، لکھنے

پڑھنے اور مطالعہ کا ذوق فطری تھا، اس لیے ابھی عمر پانچ برس کی تھی عمر عتیق کے عبرانی ادیشن کا مطالعہ شروع کر دیا، آٹھ برس کی عمر میں پوری تلمود پڑھ لی، اسی کا نتیجہ تھا کہ بارہ برس کی عمر میں گولڈزیر نے عبرانی زبان میں جو مناجاتیں ہیں ان کی اصل اور ان کے تمام پر ایک مقالہ لکھا اور اسے شایع کرایا، ابھی عمر سولہ برس کی تھی اور وہ اسکول بوائے ہی کہلاتے تھے کہ گولڈزیر نے فلسفہ اور قدیم زبانوں مثلاً فارسی اور ترکی کی کلاسوں میں جو بوڈاپسٹ یونیورسٹی میں ہوتی تھیں پابندی اور باقاعدگی سے شرکت شروع کر دی، اس کی تکمیل کر لینے کے بعد گولڈزیر کو مزید اعلیٰ تعلیم اور ریسرچ کے لیے ہنگری گورنمنٹ کی وزارت تعلیم کی طرف سے ایک وظیفہ مل گیا، تو اب وہ جرمنی چلے آئے، اور پیرنگ اور برلن کی یونیورسٹیوں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی، اس وقت ان کی عمر ۱۹ برس تھی، جرمنی سے وہ ہالینڈ گئے، اور لیڈن میں جو اس زمانہ میں اسلامیات کے درس و مطالعہ کا یورپ میں سب سے بڑا مرکز تھا، چھ مہینے قیام کیا، اس قیام کا نتیجہ یہ ہوا کہ گولڈزیر نے اب تک جو کام کیا تھا اگرچہ اس کا دائرہ بڑا وسیع تھا، لیکن اس کا تعلق زیادہ تر یہودی اور سامی زبانوں (جن میں عربی بھی شامل تھی) کے ادب و تہذیب کے مطالعہ سے تھا، مگر اب یعنی لیڈن میں قیام اور اسلامیات کے درس و مطالعہ کے بعد جیسا کہ گولڈزیر نے خود اپنی ڈائری میں تحریر کیا ہے، اسلام کا مطالعہ اور اس پر تحقیق اور ریسرچ ان کی اعلیٰ زندگی کا نہایت اہم مشن بن گیا۔

اس سلسلہ میں انھوں نے مشرق وسطیٰ کا سفر کیا اور ستمبر ۱۸۷۷ء سے اپریل ۱۸۷۸ء تک دمشق اور قاہرہ میں قیام کیا، جامع ازہر، قاہرہ میں کسی غیر مسلم کا داخلہ قانوناً ممنوع تھا، لیکن گولڈزیر نے خصوصی اجازت حاصل کر کے اس میں داخلہ لے لیا اور بحیثیت طالب علم وہاں پڑھنا شروع کر دیا، گولڈزیر نے جو زمانہ یہاں گزارا اس کو انھوں نے اپنی زندگی کی خوشگوار ترین اور مفید ترین مدت بیان کیا ہے۔



اگرچہ اپنے والد کی سخت علالت کے باعث جو مرض الموت ثابت ہوئی، وہ قاہرہ میں زیادہ قیام نہ کر سکے، اور وطن لوٹ آئے، پھر یہاں دیکھا کہ ان کے گھر کا تجارتی کاروبار بھی انحطاط پذیر ہے، علاوہ ازیں ہنگری گورنمنٹ کی وزارت تعلیم کا اب وہ پہلا سا ہمدردانہ اور جو عملہ افزا رویہ باقی نہ رہا تھا، اور ملک کی سیاسی صورت حال بھی بدل چکی تھی، ان تمام مشکلات اور موانع کے باوجود گولڈ زیمر نے باقاعدہ و بانسابطہ اسلام کا تحقیقی مطالعہ، انہماک اور کامل توجہ دیکھ سونے کے ساتھ جاری رکھا، چنانچہ ۱۸۹۲ء میں داسنا کی اپیئرل اکیڈمی کی روداد میں گولڈ زیمر کے علمی کارنامہ کی اشاعت ہوئی تو علوم شرقیہ اور خصوصاً اسلام اور اس کے متعلقات کے ایک جدید طرز کے محقق کی حیثیت سے لوگوں کی نگاہیں ان کی طرف اٹھنے لگیں، اور یہی واقعہ ان کی شہرت کا نقطہ آغاز بنا۔

یہ وہ زمانہ تھا، جب کہ ہنگری میں مسلمانوں کے خلاف تحریک بڑے زور شور سے چل رہی تھی، اور اس بنا پر یہودیوں کو اکثر بدبشیر علمی اعزازات و تقررات سے محروم کر دیا گیا تھا، گولڈ زیمر بھی اس کی زد سے نہ بچ سکے، چنانچہ وہ بلند پایہ علمی اور تحقیقی کارنامے جن کی دصوم مالک غیر کے حلقوں میں چھی ہوئی تھی، خود ان کے اپنے وطن میں ان کی کوئی قدر نہ تھی، یہ زمانہ گولڈ زیمر کے لیے بڑا صبر آزما تھا، ۱۸۹۲ء میں بوڈاپسٹ یونیورسٹی نے گولڈ زیمر کو پروفیسر مقرر کیا بھی تو محض آنریری، یعنی پروفیسر کا لقب رکھنے کے باوجود گولڈ زیمر کو نہ تنخواہ ملتی تھی اور نہ اور سہولتیں میسر تھیں، جو باتخواہ پروفیسروں کو حاصل ہوتی ہیں، اور وطن میں ان کے ساتھ یہ معاملہ اس وقت تھا جب کہ ۱۸۸۹ء میں آٹھویں انٹرنیشنل کانگریس آف اورینٹلسٹ ڈی گولڈ زیمر کو نئے علمی اور تحقیقی کارناموں کی قدر افزائی کی غرض سے ایک تمغہ طمانی دیا اور ۱۸۹۳ء میں کیمبرج یونیورسٹی نے گولڈ زیمر کو ڈبلور و برٹس اسمتھ کی جانشینی کی غرض سے پروفیسر شپ کی پیشکش کی تھی، جس کو خود گولڈ زیمر نے منظور نہیں کیا تھا۔

آخر معاشی ضرورتوں سے مجبور ہو کر گولڈ زیمر نے یہودی کمیونٹی کی سکریٹری کی حیثیت سے کام کرنا شروع کر دیا، جس کو مسلسل تیس برس ۱۸۶۶ء سے ۱۹۰۳ء تک کرتے رہے، اس میں اگرچہ تنخواہ کافی تھی، لیکن یہ کام گولڈ زیمر کی طبیعت اور مزاج و مذاق کے خلاف تھا، لیکن اس میں مصروفیت کے باوجود شام کے اوقات، تعطیل کے ایام اور ہفتہ وار چھٹی کے دن جو وقت ملتا تھا، گولڈ زیمر اسے علمی اور تحقیقی کاموں میں صرف کرتے اور انہیں شایع کرتے رہتے تھے، جس سے ان کی عظمت اور شہرت میں روز بروز اضافہ ہو رہا تھا، انجام کار ۱۹۰۳ء میں عمر میں پل مرتبہ ان کا تقرر ایک باضابطہ اور باتخواہ پروفیسر کی حیثیت سے بوڈاپسٹ یونیورسٹی میں ہوا، پہلے یہ سامی زبانوں اور ان کے ادبیات کے پروفیسر رہے، ۱۹۱۲ء سے فیکلٹی آف لاکے ماتحت

اسلامی فقہ کے صدر شعبہ ہو گئے، ۱۳ نومبر ۱۹۶۱ء کو ان کا انتقال ہوا۔

پروفیسر گولڈ زیمر کے بلند پایہ علمی اور تحقیقی کارناموں کی فہرست بہت طویل ہے، لیکن چند کتابیں نہایت اہم اور بڑی معرکہ آرا ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔ (۱) فرقہ ظاہریہ، ان کا مذہب اور ان کی تاریخ، ۱۹۶۴ء میں شایع ہوئی، (۲) "اسلامیات کا مطالعہ" یہ کتاب دو جلدوں میں ہے، اعداد اول الذکر کتاب کے چند برس بعد منظر عام پر آئی ہے، (۳) ایک بعد ۱۹۶۳ء میں گولڈ زیمر کو امریکہ کی طرف سے اسلامی دینیات اور اسلامی فقہ کے عمدہ بھدار تھا پرتھ لکچررز کی دعوت موصول ہوئی، گولڈ زیمر نے یہ دعوت منظور کر کے ایک برس کی مدت میں لکچر تیار کر لیے، لیکن کچھ صحت کی خرابی اور کمزوری اور چند اور ایسا ب کی بنا پر گولڈ زیمر کو امریکہ کے سفر کا ارادہ نسخ کرنا پڑا، اور انھوں نے یہ لکچر کتابی شکل میں اسلامی دینیات اور قانون کے نام سے چھپوایا (۴) اس سلسلہ میں چوتھی کتاب جو نہایت اہم ہے وہ "مذہب التفسیر الاسلامی" کے نام سے ہے، جس میں تفسیر قرآن کے مختلف منابع سے بڑی محققانہ بحث کی گئی ہے۔

یہاں تک ہم نے گولڈ زیمر کے ذاتی اور شخصی حالات دسوخ اور ان کے علمی کارناموں کا مختصراً ذکر کیا ہے، آئیے اب اسلامی نقطہ نظر سے گولڈ زیمر کا بحیثیت ایک نامور مشرق کے جائزہ لیں، جس زمانہ میں گولڈ زیمر بدو شعور کے ناخن لے رہے تھے، وہ زمانہ تھا جب کہ پیام مشرق کے مقدمہ میں علامہ اقبال کے بیان کے مطابق المانوی ادبیات کی تاریخ میں تھریک مشرقی پیدا ہو چکی تھی، گوئے کا دیوان اسی تحریک کا نتیجہ تھا، جس کی نسبت جرمنی کا اسرائیلی شاعر کہتا ہے:

"گوئے کا دیوان ایک گلدستہ عقیدت ہے، جو مغرب نے مشرق کو بھیجا ہے، اس دیوان سے امریکہ کی شہادت ملتی ہے کہ مغرب اپنی کمزور اور سرد روحانیت سے بیزار ہو کر مشرق کے سینہ سے حرارت کا امتلاشی ہے"

یہ تحریک مشرقی جس کا آغاز اس وقت ہوا جب ۱۸۱۲ء میں فان نے خواجہ حافظ شیراز کے دیوان کا مکمل ترجمہ شایع کیا، بعد کے شعرا پلاٹن، روڈرٹ اور بوڈن ہمیراٹاٹ نے اسے تکمیل کو پہنچایا، پلاٹن نے فارسی زبان سیکھی، تانیہ، رویت اور ایرانی قواعد و عرض کی پابندی سے غزلیں اور رباعیات لکھیں اور نیپولین کی مدح میں ایک قصیدہ بھی فارسی زبان میں لکھا، "روڈرٹ عربی، فارسی اور سنسکرت، تینوں مشرقی زبانوں کا فاضل اور ماہر تھا، علامہ اقبال لکھتے ہیں:

"روڈرٹ کی نگاہ میں مولانا جلال الدین رومی کے فلسفہ کی بڑی وقعت تھی اور اس کی غزلیات زیادہ تر مولانا کی

لے یہ معلومات ان کی کتاب اسلامک تھیولوجی اینڈ لاکے ترجمہ کے دیباچہ سے لیے گئے ہیں۔

تقلیدیں ہی لکھی گئی ہیں، مزید لکھتے ہیں۔ چونکہ ردِ کثرت السنہ مشرقیہ کا عالم تھا اس لیے اس کی مشرقی نظم کے آئینہ بھی وسیع تھے، مخزن الاسرار (نظام)، بہارستان جامی، کلیات امیر خسرو، گلستان سعدی، مناقب اہل بیت، چارداش منہاں الطیر عطار اور ہفت قدیم و غیرہ جہاں جہاں اسے حکمت کے موقی تھے ہیں ردل لیتا ہے، ..... اسلامی تاریخ کے بعض واقعات بھی اس نے نظم کئے ہیں، رہا بوڈن اسٹاٹ! اس کی نسبت علامہ اقبال رقم طراز ہیں، گوئے ٹا کے بعد مشرقی رنگ کا سب سے زیادہ مقبول شاعر بوڈن اسٹاٹ ہے، جس نے اپنی نظموں کا مجموعہ مرزا شفیع کے فرضی نام سے شائع کیا، یہ چھوٹا سا مجموعہ اس قدر مقبول ہوا کہ تھوڑی ہی مدت میں ایک سو پالیس دفعہ شائع ہوا، اس شاعر نے عجیب و غریب کو اس خوبی سے جذب کیا ہے کہ جرمنی میں مرزا شفیع کے اشعار کو لوگ عرصہ تک فارسی نظم کا ترجمہ ہی تصور کرتے رہے یہ جو کچھ ہم نے لکھا ہے اس سے دو باتیں صاف طور پر معلوم ہوتی ہیں۔ (۱) ایک یہ کہ گولڈزیر کی پیدائش کے وقت تحریک مشرقی نے جرمنی کے ادبی حلقوں میں ایک ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ عجیب گلشن علم و ادب کی بوئے جاں نواز سے اہل جرمنی کے دل و دماغ ہلک رہے تھے اور وہ اس کے ذریعہ سرور باطن و روح کا سامان کرتے تھے اور (۲) دوسری بات یہ ہے کہ تحریک مشرقی کا مقصد اور اس کی غرض و غایت فالس ٹلی اور ادبی تھی اور سیاست سے ہرگز اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔

پروڈنیس گولڈزیر جو فطرۃ مذاق استشرق لیکر پیدا ہوئے تھے، اس فضا سے متاثر ہوئے بغیر کس طرح رہ سکتے تھے چنانچہ جیسا کہ ہم شروع میں بتائے ہیں، گولڈزیر کی عمر بھی سولہ برس کی تھی کہ یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں پر جن میں فارسی اور ترکی زبانیں بھی شامل تھیں، لکچروں میں شامل ہونے لگے، ساتھ ہی شامی زبانوں کی طرف توجہ ہوئی تو عربی زبان بھی سیکھ لی ٹیڈن میں اسلامیات کا شوق پیدا ہوا تو اس کے درس و مطالعہ میں مصروف ہو گئے، یہاں تشنگی نہ بھی تو مشرق وسطیٰ کی راہ لی اور حدیث ہے کہ جامع ازہر قاہرہ میں داخل ہوئے، یہ گولڈزیر کی ایک ایسی خصوصیت ہے کہ غالباً کوئی اور مشرق اسیں ان کا شریک و ہم نہیں ہے، جامع ازہر کے ارباب بست و کشاد نے یقیناً گولڈزیر میں اسلامیات کے درس و مطالعہ کے لئے غیر معمولی تڑپ اور لگن محسوس کی ہوگی، اور اب تک جو کچھ انھوں نے لکھا پڑھا تھا اس کی انھوں نے قدر کی ہوگی، جب ہی تو انھوں نے جامع ازہر کی قدیم روایات اور اس کے قواعد و ضوابط کے خلاف ایک یورپین غیر مسلم کو جامع ازہر میں داخلہ کی اجازت دی، پھر تکمیل تحصیل کے بعد جب معاشی ضرورتوں سے مجبور ہو کر ایک دفتری ملازمت کرنے لگے تو اس عالم میں بھی اسلامیات کا تحقیقی مطالعہ بڑی لگن کے ساتھ کرتے رہے، جس کا نتیجہ نہایت بلند پایہ مقالات و تصنیفات کی شکل میں ظاہر



ہوا، یہ سب کچھ اس امر کی روشنی میں ہے کہ گولڈ زیمیر کو اسلامیات کے ساتھ فطری اور حقیقی رگڑ تھا، ان کا مقصد زندگی صرف علم کی خدمت تھا، ان کو غرض نہ سیاست سے تھی اور نہ مشنری کی طرح اسلام یا مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا کرنے سے تھی، اور یہ اس لئے بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ مشنری صلیبی لڑائیوں کے زخم خوردہ تھے، اس لئے وہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف رسوائے زمانہ کتابیں لکھ کر کھیانی بی کھیانی بیچنے کے مصداق اپنے دل کا بخار نکالنا چاہتے تھے، ان لوگوں کے برعکس گولڈ زیمیر یہودی تھے اور ان کے زمانہ میں یہودی خود عیسائیوں کے ستم زدہ تھے، اور یوں بھی یہودی مذہبی معاملات و مسائل میں اپنے آپ کو بہ نسبت عیسائیوں کے مسلمانوں سے زیادہ قریب سمجھتے تھے، ان وجوہ کے باعث گولڈ زیمیر نے اسلامیات پر جو کچھ لکھا۔۔۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسا لکھا کہ اس میں عبقریت کی شان نظر آتی ہے۔۔۔ اس کے متعلق بدعتی کا الزام نہیں دیا جاسکتا۔

لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ گولڈ زیمیر نے غلطیاں نہیں کی ہیں، انہوں نے کی ہیں، اور ان کی غلطیاں دو قسم کی ہیں، (۱) مستشرقانہ غلطیاں اور (۲) علمی غلطیاں، مستشرقانہ غلطیوں کے سلسلہ میں ہم کو بنیادی طور پر یہ یاد کر لینا چاہئے کہ کوئی مستشرق خواہ کیسا ہی انصاف پسند اور اسلام کی رفعت و عظمت کا دل و جان سے قائل ہو، بہر حال وہ غیر مسلم ہے، اور اس بنا پر وہ اسلام اور پیغمبر اسلام کا مطالعہ جس نقطہ نظر سے کرتا ہے، وہ بے شبہ ایک مسلمان کا نقطہ نظر ہرگز نہیں ہو سکتا، اور اس کا سبب یہ ہے کہ ایک شخص کے مسلمان ہونے کے لئے بعض جو بنیادی عقائد ناگزیر ہیں۔ اگر مستشرق بھی ان عقائد کا حامل ہو تو وہ غیر مسلم ہی کہاں رہے گا، مثلاً نبوت کا اسلام میں تصور اور اس تصور کے ماتحت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مرسل من اللہ ہونا، علاوہ ازیں معراج نبوی اور قرآن کا کلام الہی ہونا۔ یہ اور اس طرح کی چند اور باتیں ہیں جو مستشرقین میں عام ہیں، اور گولڈ زیمیر بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔

(۲) دوسری قسم کی غلطیاں جو گولڈ زیمیر سے ہوئی ہیں، وہ علمی غلطیاں ہیں یا تعبیر و بیان کی فرد گزشتہ ہیں، لیکن یہ غلطیاں نہ چنداں تعجب انگیز ہیں اور نہ ان سے گولڈ زیمیر کے بلند مرتبہ و مقام پر حروف آتا ہے، جو انہیں علم و تحقیق کی بارگاہِ معلیٰ میں بجا طور پر حاصل ہے، کیونکہ دنیا میں کسی علم و فن کا کوئی بڑا سے بڑا محقق اور دیدہ و در عالم بھی ایسا نہیں ہے جس سے غلطیاں نہ ہوئی ہوں اور جن کی نشان دہی خود اس کی زندگی میں یا اس کے بعد نہ کی گئی ہو، اس کی وجہ یہ ہے کہ زندگی ارتقا پذیر ہے، اور اس کی نمونہ گیری اور ارتقا کے ساتھ ساتھ انسان کی معلومات اور ذرائع و وسائل معلومات میں بھی ارتقا

اور تفرع پیدا ہوا رہتا ہے۔

اس موقع پر یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جہاں تک گولڈ زیمر کی مستشرقانہ غلطیوں اور فرد گزاشتوں کا تعلق ہے، مسلمان تو مسلمان، زمانہ حال کے بعض مستشرقین نے خود ان کا اعتراف کیا ہے اور گولڈ زیمر کی طرف سے ان کی ہمدردی کی ہے، چنانچہ گولڈ زیمر کی کتاب انٹروڈکشن ٹو اسلامک تھیولوجی اینڈ لاکے حالیہ انگریزی ترجمہ مطبوعہ ۱۹۶۴ء پر پروفیسر برنارڈ ٹیلیوس نے جو مقدمہ لکھا ہے۔ اس میں وہ لکھتے ہیں۔

”اس کتاب سے بوجہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ گولڈ زیمر کا زمانہ سیاسی اور عقلی حیثیت سے کس درجہ مختلف تھا، ہمارے زمانہ میں جو مغربی مصنفین اسلام پر یا کسی اور ایشیائی و افریقی موضوع پر کتابیں لکھ رہے ہیں، ان کے برعکس گولڈ زیمر اور ان کے برعکس گولڈ زیمر اور ان کے ہم عصر مصنفین کو اس کا خیال ہی نہیں تھا کہ ان کی کتابوں کے قاری مسلمان بھی ہوں گے، اس لئے یہ لوگ اپنا مخاطب مغرب کے قارئین کو ہی بناتے تھے، چنانچہ اس عہد کے دوسرے مصنفین کی طرح گولڈ زیمر بھی قرآن کو پیغمبر اسلام کی تصنیف کی حیثیت سے پیش کرتا ہے، مسلمانوں کے نزدیک ایسا کہنا اسلام کی سخت تنقیض ہے، علاوہ ازیں اسلام پر لکھنے والے عام مغربی مصنفین کی طرح گولڈ زیمر نے بھی قرآن و حدیث میں عہد جاہلیت کے بعض اور اجنبی اثرات پر بحث کی ہے، یہ موضوع بھی حاسن مسلمانوں کے لئے سخت تکلیف دہ ہے، اس بحث میں گولڈ زیمر نے جو زبان استعمال کی ہے وہ اب سے اکیسوا برس پہلے تو استعمال ہوتی تھی، لیکن مستشرقین اب ایسی زبان استعمال نہیں کرتے جو مسلمانوں کے لئے آزر دگی کا سبب ہو۔“

پروفیسر برنارڈ ٹیلیوس نے سطور بالا میں گولڈ زیمر کی مستشرقانہ غلطیوں کی ہی نشان دہی نہیں کی ہے بلکہ موصوف کی فرد گزاشتوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے، چنانچہ لکھتے ہیں

”محاضرات اسلام، یعنی گولڈ زیمر کی کتاب انٹروڈکشن ٹو اسلامک تھیولوجی اینڈ لاکے، بے شبہ اپنے زمانہ کی پیداوار ہے، چند مباحث میں، اور وہ بھی زیادہ تر تفصیلات و تشریحات کے معاملہ میں گولڈ زیمر کی تحقیقات کو نئی معلومات اور دلائل کی روشنی میں رد و بدل کیا جاسکتا ہے، جو گولڈ زیمر کے بعد سے اب تک حاصل ہو چکی ہیں، اور جن پر عصر حاضر کی تحقیقات نے مرتصدیق ثابت کر دی۔“

لیکن ان تمام غلطیوں اور فرودگذاشتوں کے باوجود اس زمانہ میں اسلامیات پر لکھنے والے مغربی مصنفین کے درمیان گولڈ زیمر کا انفرادی وصف اور امتیاز کیا ہے؟ پروفیسر برنارڈ لیوس نے اسپر ہی روشنی ڈالی ہے، لکھتے ہیں:

ہم نے اوپر جن فرودگذاشتوں کا ذکر کیا ہے، ان سے قطع نظر گولڈ زیمر نے اسلامی عقائد اور مسلمانوں کے کارناموں کے ساتھ جس غیر معمولی ہمدردی کا جا بجا اظہار کیا ہے وہ نہایت اہم سے اگر ایک طرف گولڈ زیمر میں ہمارے زمانہ کے مصنفین کی مٹا روش کی کمی ہے تو دوسری طرف اس تنقیص و تبخین کی روش سے جس کا اظہار اس ہمد کے یورپین مصنفین مسلمانوں اور ان کے مذہب تہذیب و تمدن اور ان کی مقدس کتابوں کی نسبت کرتے تھے، گولڈ زیمر کا قلم اس سے بالکل آزاد اور مترا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ یہ بہت اہم اور غیر معمولی بات ہے، اگرچہ گولڈ زیمر اس ہمد کی پیداوار ہے جس میں تبلیغ عیسائیت کا بڑا چرچا تھا، لیکن اس کا وجود گولڈ زیمر کی تحریروں میں اس کا کوئی اثر نظر نہیں آتا، اور صرف یہی نہیں، بلکہ گولڈ زیمر کے معاصرین یا ان کے پیش رو مصنفین میں سے جن لوگوں نے اسلام کی تعلیمات کو مسخ کر کے اور ان میں رد و بدل کر کے اسلام پر اعتراضات کئے تھے، گولڈ زیمر نے ان لوگوں کی پر وہ درمی کر کے اسلام کی حقانیت اور اصلیت اور ان کے استناد کو ثابت کیا، اس سلسلہ میں گولڈ زیمر عیسائیت کے ان علماء کے خلاف بھی سخت احتجاج کرتا ہے، جو عیسائیت پر بحث کرتے ہیں تو اپنی ایک طرف عقلیت پر بھروسہ کر لیتے ہیں، لیکن جب وہ اسلام پر گفتگو کرتے ہیں تو اس کے لئے معیار تنقید بہت سخت کر لیتے ہیں۔

سطور بالا میں پروفیسر برنارڈ لیوس نے گولڈ زیمر کے اسلام سے متعلق علمی اور تحقیقی کارناموں کا پانچ نظریے سے جو تحلیلی اور تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے، ہمارے نزدیک وہ بالکل صحیح، درست اور معروضی ہے، اور بڑی بات یہ ہے کہ عرب، علماء اسلام کا بھی نقطہ نظر یہی ہے، چنانچہ گولڈ زیمر کی دو نہایت اہم کتابوں کا عربی ترجمہ جو ہماری نظر سے گذرا ہے، ہم ان کا تعارف کرتے ہیں، اس سے اندازہ ہوگا کہ علماء عرب گولڈ زیمر کے علمی اور تحقیقی کارناموں کے کس درجہ قدر دان تھے، اور انھوں نے کس طرح ان سے خاطر خواہ استفادہ کیا۔

(۱) ایک ضخیم کتاب جس میں قرآن مجید کی تفسیر کے مختلف مناہج اور اسالیب سے بحث کی گئی تھی، اس کا عربی ترجمہ "مذہب التفسیر الاسلامی" کے نام سے قاہرہ یونیورسٹی کے اسٹاذ ڈاکٹر عبد الحلیم النجار نے کیا ہے، جو چار سو کے قریب صفحات پر پھیلا ہوا ہے، یہ ترجمہ پہلی مرتبہ ۱۹۵۵ء میں مصر سے شائع ہو کر اباب علم و ادب میں بہت مقبول ہوا۔ اس ترجمہ کے پیش لفظ میں فاضل مترجم لکھتے ہیں: "کتاب مذہب التفسیر الاسلامی" منہج اور اسلوب بحث اور قرآن مجید کے درس و مطالعہ کے مختلف سلاوڈ



گو نمایاں کرنے کے اعتبار سے اسلامی ثقافتوں کی تاریخ میں اپنی نوعیت کا واحد، منفرد اور ایک بالکل نئے طرز کا کاغذ نامہ ہے۔ اس حیثیت سے یہ کتاب علمی بحث و نظر اور قرآن مجید کی تفاسیر میں جو تنوع ہے، اس کے مطالعہ کے لیے نئے میدان مہیا کرتی ہے۔ کتاب کی اہمیت اور افادیت کا اس طرح بر ملا اعتراف کرنے کے بعد فاضل مترجم لکھتے ہیں: گولڈزیمر نے اس کتاب میں تمام مذاہب تفسیر کا استیعاب و استقصا نہیں کیا، علاوہ ازیں بعض دینی عواطف و جذبات کی تشریح میں دوسرے مستشرقین کی طرح مصنف سے بھی غلطیاں ہوئی ہیں، اور پھر کتاب اغلاط سے بھی خالی نہیں ہے، جن پر ہم نے اپنے حواشی میں تنبیہ کر دی ہے، لیکن گولڈزیمر کو بحیثیت ایک عالم اور محقق کے جو مرتبہ بلند حاصل ہے ان چیزوں سے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔

(۲) دوسری اہم کتاب جس کا عربی ترجمہ بڑے اہتمام اور کاوش سے کیا گیا ہے، وہ یہی ہے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ یعنی انٹروڈکشن ٹو اسلامک تھیولوجی اینڈ لا، اس ترجمہ کا نام ہے، "العقیدۃ والشریعة فی الاسلام، تاریخ التطور العقیدی والتشریحی فی الدین الاسلامی" اس کا ترجمہ جو حواشی کے ساتھ، ۴ صفحات پر ہے، مصر کے تین افاضل علماء ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ، ڈاکٹر علی حسن عبدالقادر اور پروفیسر عبدالعزیز عبدالحق نے مل جل کر کیا ہے، اس ترجمہ کے مقدمہ میں ڈاکٹر محمد یوسف موسیٰ مستشرقین پر ایک عام گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں یورپ کے جن علماء نے اسلام اور مسلمانوں پر کسی حیثیت سے خامہ فرسائی کی ہے ان میں دو طبقے ہیں، ایک طبقہ تو ان لوگوں کا ہے جو اپنی خواہشات کے بندے تھے، اس لئے وہ خود گمراہ ہوئے اور دوسروں کو بھی گمراہ کیا، لیکن ان کے برخلاف ایک طبقہ ایسا بھی پیدا ہوا جو انصاف پسند تھا، ان لوگوں کو تحقیق و تدقیق کے بعد حجاب حق نظر آئی اسے بر ملا کہا، اس کے بعد طبقہ ثانیہ کے چند نامور مستشرقین اور ان کے خاص خاص کارناموں کا ذکر کیا ہے، اور پھر پروفیسر گولڈزیمر کو بھی اس طبقہ میں شمار کیا ہے، پھر گولڈزیمر کی کتاب کا تعارف ان لفظوں میں کرتے ہیں، "یہ کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، عقیدہ اور شریعت کا نشوونما اور عہد بعد اس کا ارتقار زہد اور تصوف، مختلف اسلامی فرقے، مذہبی تحریکات، اور ان کے اسباب و علل، ان سب کا وسیع مطالعہ پیش کرتی ہے، مصنف نے اس کتاب کی تصنیف میں انہیں مراجع سے کام لیا ہے جو اسلام کے معتبر مراجع ہیں، اور ان مراجع سے استفادہ میں مصنف کی غیر معمولی ذہانت اور گہری بصیرت اس کی مراد اور مددگار رہی ہے، لیکن ہاں یہ ضرور ہے کہ اس کتاب میں غلطیاں بھی کم نہیں ہیں، اس کو وجوہ متعدد ہیں، ان میں ایک یہ بھی ہے کہ غیر مسلم ہونے کے باعث وہ اسلام کے مبادی اور اصول کی اصل روح تک پہنچنے سے قاصر رہا۔"

اس بنا پر فاضل مترجمین نے ایک طرف تو افادہ عام کی غرض سے بڑی محنت اور کاوش سے گولڈزیمر کی اس اہم کتاب کو عربی جامہ پہنایا اور دوسری جانب اس کتاب پر محققانہ حواشی لکھ کر مصنف کی نوع بنوع غلطیوں اور فردگذاشتوں کی نشاندہی کر کے ان کی تصحیح بھی کی،

پروفیسر اربری نے اپنی کتاب (Portraits of Persian Poets) کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ یورپ میں اسلام پر لکھنے والوں کے تین دور ہیں (۱) پہلا دور مشنریز کا ہے یہ لوگ لکھتے ہی تھے اسلام کو رسوا اور بدنام کرنے کی غرض سے (۲) دوسرا دور استعمار کا ہے، اس دور میں مستشرقین جو کچھ لکھتے تھے، مثلاً براؤن، نکلسن اور ڈینیسن اس اعلیٰ ذوق و تحقیق اور کاوش سے لکھتے تھے، لیکن استعماری طاقتیں ان سے یہ فائدہ اٹھاتی تھیں کہ ان کی کتابوں کے ذریعہ مسلمانوں کے مذہب و تمدن و تمدن اور ان کی تاریخ سے واقفیت ہوتی تھی، چنانچہ اس عہد کے مستشرقین برطانوی گورنمنٹ کے پولٹیکل ڈپارٹمنٹ سے بھی بحیثیت مشیرکار کے تعلق رکھتے تھے (۳) اس کے بعد جب استعمار کا دور ختم ہو گیا تو اب مستشرقین خالص اعلیٰ ذوق اور اسلامیات سے طبعی دلچسپی کی بنا پر لکھنے لگے، جہاں تک مشنریز کے کام کا تعلق ہے اس کی سخت مذمت خود پروفیسر اربری نے کی ہے اور مسلمانوں سے اس کی معافی مانگی ہے۔

ہمارے نزدیک پروفیسر اربری کی یہ تقسیم بالکل صحیح ہے، نمبر ۲ اور ۳ کے ماتحت جو مستشرقین آتے ہیں، مسلمانوں کو ان کے اعلیٰ اور تحقیقی کارناموں کی قدر کرنی چاہیے اور جو روش علماء عرب نے پروفیسر گولڈزیمر کی نسبت اختیار کی ہے وہی روش ہمیں گولڈزیمر جیسے دوسرے مستشرقین کے متعلق اختیار کرنی چاہیے۔

# مستشرقین، استشرق اور اسلام

از

ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی، ریڈر اسلاک ریسرچ انسٹیٹیوٹ، اسلام آباد

میرے مقالہ کا عنوان ہے 'مستشرقین، استشرق اور اسلام'، یہ سیمینار کے مرکزی موضوع 'اسلام اور مستشرقین' سے ذرا ہٹ کر ہے، سیمینار کے موضوع کا مطلب جہاں تک میں نے سمجھا ہے ہے کہ مستشرقین اسلام کو کس نظر سے دیکھتے ہیں اور اسلام کے ساتھ ان کا رویہ کیسا ہے، جب کہ میں نے اپنے مقالہ میں اس مسئلہ سے بحث کی ہے کہ اسلام مستشرقین کو کس نظر سے دیکھتا ہے۔ سب سے پہلے میں موضوع میں شامل الفاظ کی مختصر لغوی اور معنوی تشریح پیش کرتا ہوں، اس سے آئندہ مباحث کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

مشرق مشرق ہے استشرق سے، جس کا مادہ شرق ہے، جو ضد متصور ہوتا ہے غرب کا، میں نے متصور ہوتا ہے کہا، اس لئے کہ میرے نزدیک یہ تقسیم و تفریق حقیقی نہیں، اعتباری ہے، اور غیر صحت مندرجہ جانات کی پیداوار ہے، شرق و غرب کے دو اہم متضاد اور اردو میں متعل مترادفات مشرق و مغرب ہیں، عربی میں مشرق ہی نہیں خود اس کا اسم یا مصدر استشرق بھی مؤلف یعنی نیا اور بعد کی پیداوار ہے، چنانچہ قدیم عربی لغات میں اس مادہ کا باب استفعال سرے سے مفقود ہے، جدید لغات میں یا قدیم لغات کے جدید ایڈیشنوں میں البتہ مشرق اور استشرق کے الفاظ بطور اسم فاعل اور اسم مصدر کے ملتے ہیں، جن کا استعمال مخصوص بھی ہے اور محدود بھی ہے، استشرق بطور فعل کے ان لغات میں بھی مذکور نہیں ہے، عربی یا اردو لٹریچر میں بھی یہ لفظ زیادہ پرانا نہیں ہے، اور الفاظ پہلے استعمال میں آتے ہیں اس کے بعد ہی لغات میں جگہ پاتے ہیں، درحقیقت یہ الفاظ ترجمہ یا چربہ ہیں اور نیٹلٹ اور نیلزم کا جو اور نیٹ سے ماخوذ ہیں انگریزی میں اور نیٹ ایٹ کا ہم معنی ہے، اہل مغرب نے یہ نام اپنے ان نام نہاد اسکالروں کو دیا جنہوں نے بزعم ان کے مشرقی علوم و فنون زبان و ادب اور تہذیب و ثقافت کو جس میں مذہب بھی آجاتا ہے، اپنی دلچسپی کا موضوع بنایا، اور ان کا نھوھی مطالعہ کر کے براہ راست اس سے واقفیت حاصل کی، عربی میں اس کے لئے کوئی لفظ پہلے سے موجود نہیں تھا، اس لیے جب اس کی ضرورت پیش آئی تو انگریزی ہی کے طرز پر الفاظ وضع کر دی گئے۔



عربی زبان میں ایک ہی مادہ کو مختلف ابواب میں لے جا کر بذریعہ اشتقاق طرح طرح کے الفاظ بنانے کا ایک وسیع نظام موجود ہے، بایں طور کہ مادے کا اصل معنی باقی رہتے ہوئے اس میں تنوع پیدا ہوتا چلا جاتا ہے، عربی کی ایک نمایاں اور اہم خصوصیت جس کو خاصیت ابواب کہتے ہیں، اس باب میں بہت اہم کردار ادا کرتی ہے، مثلاً عربی کا ایک باب تفاعل ہے، اس کی خاصیت یہ ہے کہ یہ اصل مادہ کے مفہوم کو بناوٹی طور پر اختیار کرنے کا تصور دیتا ہے، مگر اس کا معنی یہ ہے، اس کے معنی یہاں ہونے کے ہیں، وہی مادہ باب تفاعل میں جا کر جب تفاعل بن جاتا ہے تو اس کا معنی ہو جاتا ہے، جھوٹ موٹ کا بیمار بننا، ایک اور مثال لیجئے، شعر سے شاعر بنا تو وہ واقعی شاعر کے لیے استعمال ہوا، لیکن باب تفاعل سے متشاعر بنا تو اس کا مطلب ہوا جھوٹا بناوٹی شاعر، اسی طرح تجاہل کے معنی جان کر انجان بنا۔

مثلاً ثی مزید کے ابواب میں سے باب استفعال جس کے وزن پر استشراق بنایا گیا ہے، اس کی ایک خاصیت صیرورۃ اور اتحاد ہے، جس میں بن جانا، اپنا نیا حاصل کرنا مفہوم ہوتا ہے، مثلاً استخرجوا الطین مٹی پتھر بن گئی، استوطن القریۃ بستی کو اپنا وطن بنالیا، استفادہ فائدہ حاصل کرنا۔ اسی اصول اور قاعدہ کے تحت جب کسی زمانہ میں کچھ لوگوں نے باہر سے آکر جزیرۃ العرب میں بود و باش اختیار کی اور وقت گزرنے کے ساتھ وہ بھی عرب ہو گئے، تو ان کو عرب کے قدیم اور اصلی باشندوں سے تمیز کرنے کے لیے اسی باب استفعال سے کام لے کر ایک لفظ بنایا گیا استعرب، عرب بن گیا، چنانچہ عرب کی قدیم تاریخ میں عرب، عازب اور مستعربہ کی اصطلاحیں ملتی ہیں، اردو میں ہم اسے اصلی عرب اور نقلی عرب بھی کہہ سکتے ہیں، نئے اور پرانے، سچے اور جھوٹے سب بھی تعبیر کر سکتے ہیں، اس سلسلہ کی میں نے تحقیق نہیں کی کہ عربی میں مستشرقین اور استشراق کا لفظ پہلے پہل کس نے وضع کیا، اسکے واضع خود مستشرقین ہیں، تو ان سے چوک ہوئی، اور اگر غیر ہیں تو ان کا تیر نشانہ پر لگا، استشراق کی حقیقت اور اس کی تاریخ جن کی نظر میں ہے وہ تسلیم کریں گے کہ یہ نام ان کے لیے انتہائی موزوں ہے، خود یہ نام ان کا راز فاش کرتا ہے، ان کے چہرے سے نقاب اٹھا کر ان کی اصلیت کو ظاہر کرتا ہے۔ حاصل کلام یہ کہ اردو عربی زبان استشراق کے معنی ہوئے، بہ تکلف مشرقی بننا اور مشرق کے معنی وہ شخص جس نے بہ تکلف مشرقیت اختیار کی یا مشرقی بنا، اور ظاہر ہے کہ اس فعل کی نسبت کسی مغربی ہی کی طرف ہو سکتی ہے، خود کسی مشرقی کا مشرقی بننا مہمل سی بات ہے لیکن عموماً اہل لغت اس کو ظاہر نہیں کرتے، چنانچہ جب وہ مشرق کے معنی لکھتے ہیں تو بلا کسی فرق و امتیاز کے علی الاطلاق اس کا ذکر کرتے ہیں۔

میں نمونہ ایک معمولی عربی لغت السنجد کا حوالہ دوں گا جو بہت متداول ہے، اس کے قدیم ایڈیشنوں میں تو

یہ لفظ موجود ہی نہیں ہے، جدید ایڈیشنوں میں ہے: المستشرق، العالم باللغات، والآداب والعلوم الشرقیة، یعنی مشرقی زبانوں، ادبیات اور علوم کا جاننے والا، کیا ہم مشرق سے تعلق رکھنے والے ایسے کسی عالم کو مستشرق کہہ سکتے ہیں جو مشرقی علوم دانہ کا ہلکا نہ ہو، اسی طرح کیا ہم کسی ایسے مسلمان کو مستشرق کہہ سکتے ہیں خواہ اس کا تعلق مغرب ہی کیوں نہ ہو؟ ظاہر ہے نہیں کہ کلمہ مستشرق اگر اصطلاحاً یا عرفاً یہ لفظ مخصوص ہے ان غیر مسلم علماء مغرب کے لئے جو مشرقی زبانوں اور علوم و ادب میں دلچسپی لیتے ہیں، خود مشرقی زبانوں اور علوم و ادب میں بھی تحدید کی ضرورت ہے، مشرق سے تعلق رکھنے والی غیر مسلم زبانوں یا غیر اسلامی علوم و فنون اور اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب کے عالم کو بھی مشرقی نہیں کہہ سکتے، چاہے وہ کوئی غیر مسلم اور مغربی ہی کیوں نہ ہو، سنسکرت، ہندومت اور بدھ مت کے کسی عیسائی مغربی اسکالر کو کوئی مشرقی نہیں کہتا، تو گویا بات یہاں تک پہنچی کہ مستشرق مغرب کے ان غیر مسلم خاص کر یہودی اور عیسائی اسکالروں کو کہتے ہیں جو اسلام، اسلامی علوم، اسلامی زبانوں اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے مطالعہ میں خصوصی دلچسپی لیتے ہیں، اور میں نے جہاں تک اندازہ لگایا ہے اس کا نفرنس کے مرکزی موضوع میں لفظ مستشرق کا یہی تصور مراد ہے، ورنہ اگر ہم المنجد کے مذکورہ الصدر مفہوم کو سامنے رکھیں گے تو اس سے کئی الجھنیں پیدا ہوں گی، میں نے تحقیق نہیں کی، مگر میرا اندازہ ہے کہ المنجد کا مؤلف خود مشرق ہے اور خود اس لفظ کی تعبیر و تاویل میں بھی اس کے استشرق کی دانستہ یا نادانستہ طور پر کار فرمائی موجود ہے، مدعا کی وضاحت کے لئے میں لغت ہی سے متعلق استشرق کی ایک مثال پیش کرنا چاہوں گا، الفراند الدریہ کا مصنف جنب کا مفہوم بیان کرتا ہے تو نہ صرف اپنی طرف سے اس میں ذم کا پہلو شامل کر دیتا ہے، بلکہ زبردستی مسلمانوں کے ساتھ اس کی نسبت قائم کرتا ہے، عربی زبان کے مطابق جنب اس شخص کو کہتے ہیں جو حالت جنابت میں ہو، یا جسے جنابت لاحق ہوگی، جنابت ایک ایسی حالت ہے جس میں فی نفسہ ذم کا کوئی پہلو نہیں، اور یہ حالت مسلم غیر مسلم کسی کو بھی پیش آسکتی ہے، لیکن الفراند الدریہ کا مصنف باوجود اس کے معنی لکھتا ہے تو اس کے ساتھ مسلم کا لفظ لگا کر اپنے استشرق کا مظاہرہ کرتا ہے،

جناب کی فصل ملاحظہ ہو:

جنب معنی polluted Muslim یعنی غلیظ یا پلید مسلمان

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ مستشرق کا مطلب بتاتے وقت جہاں لغوی اور اصطلاحی دونوں اعتبار سے اس کو مقید کرنے کی ضرورت تھی وہاں تو اس کو مطلق رکھا گیا لیکن جنب کا مطلب بیان کرنے میں جہاں تقید و تحدید کی کوئی گنجائش

نہیں تھی وہاں کس طرح اپنی طرف سے اقوال کا اضافہ کر دیا گیا، گویا کہ اسلام اور مسلم دشمنی کا دوسرا نام استشراق ہے، اور ہر وہ عالم شخص جو اس رجحان کا حامل ہو وہ مستشرق ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے میں ایک اور نکتے کی طرف اشارہ ضروری سمجھتا ہوں، بات مستشرق اور استشراق کی ہو رہی ہے جیسا کہ میں نے ابتدائی سطور میں عرض کیا، ان الفاظ کی اصل شرق یا مشرق ہے جو ضد ہے غرب اور مغرب کا، آپ ذرا غور کیجئے مشرق و مغرب کی تقسیم اور حد بندی کی حقیقت کیا ہے، یہ نکتہ بھی غور طلب ہے کہ اس کی ابتدا رکب اور کیسے ہوئی، اور اس کے پیچھے کیا محرکات کار فرما ہیں؟ جہاں تک کہ ان کے امر واقعہ ہونے کا تعلق ہے تو یہ کائناتی صداقتیں ہیں، یہ مظاہر فطرت ہیں، ان کے وجود سے کون انکار کر سکتا ہے، جس سمت سے سورج طلوع ہوتا ہے اس کو مشرق کہنا اور جس سمت میں غروب ہوتا ہے اس کو مغرب کہنا ایک قدرتی واقعہ کا اظہار ہے، لیکن اس کی بنیاد پر دنیا کو تقسیم کرنا انسانی تخیل کی رد کو متاثر کرنا ہے، یا اقبال کے الفاظ میں یہ تمیز فساد آدمیت ہے، یہ تدلیس ابلیس ہے، یہ فساد قلب و نظر کا شاخسانہ ہے، اہل ہوس نے ہوا نفس کی تکمیل کے لئے جو جیلے تراشے ہیں ان میں سے ایک گمراہ کن حیلہ یہ بھی ہے کہ ”ایک سازش ہے فقط دین و مروت کے خلاف“ اقبال نے جدید و قدیم کی تفریق کو ہدف ملامت بنایا۔

زمانہ ایک حیات ایک کائنات بھی ایک دلیل کم نظری قصہ جدید و قدیم

بالکل یہی حال مشرق و مغرب کی تقسیم کے اس انہوں کل ہے جو اہل مغرب نے اپنے غیر انسانی مقاصد کے لئے پھونکا ہے، آپ اپنی دنیا کی قدیم تاریخ پر نظر ڈالیے، کیا نام نہاد اہل مغرب کے ظہور سے پہلے بھی اس قسم کی تقسیم کا وجود اس تصور کے ساتھ کہیں ملتا ہے جو اہل مغرب نے دنیا کو دیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ شرق و غرب یا مشرق و مغرب کی تفریق و تقسیم اور ان کے مابین تضاد کا موجودہ تصور بھی دین ہے اہل مغرب ہی کی جس کو انہوں نے اپنے استعماری مقاصد کے لیے عام کیا، ورنہ اسلام کے نقطہ نظر سے مشرق و مغرب دونوں ایک ہی دریا کے دو کنارے ہیں اور ان میں تفریق و تقسیم کی کوئی بھی واقعی یا حقیقی بنیاد موجود نہیں ہے، قرآن کہتا ہے:

لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ  
اللہ ہی کے ہیں مشرق و مغرب،

(بقرہ: ۱۱۵ و ۱۲۲)

رَبُّ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (شعرا ۲۸، منزل ۹) رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ (رحمن ۱۲) مشرق و



مغرب سب کا خالق مانک پروردگار جب اللہ تعالیٰ ہے تو انسانوں کے ایک گروہ کو یہ کہاں سے حق حاصل ہو گیا کہ وہ دنیا کی بندر بانٹ کر کے اپنا حصہ ہی نہیں کھل کا کل بہنم کرنے کے لیے مکر و فن سے کام لیں۔

میں نے مشرق و مغرب کی غیر فطری تقسیم کے لیے بندر بانٹ کا استعارہ استعمال کیا ہے، اس کی بلاغت کا کماحقہ ادراک کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس استعارہ میں جو تلمیح ہے اس کو ذہن میں تازہ کر لیا جائے، دو بیوں میں کسی شی کی تقسیم پر جھگڑا ہوا، وہ خود جھگڑا طے نہ کر سکیں تو تصفیہ کے لیے ایک بندر کے پاس لے گئیں، بندر چالاک تھا، اس نے اس شے کے دو غیر مساوی حصے کیے اور ان کو ترازو کے دو پلڑوں میں رکھ دیا، اس کے بعد جو حصہ زیادہ تھا اس میں سے اتنا نکال کر کھالیا کہ جو حصہ زیادہ تھا وہ کم اور جو کم تھا وہ زیادہ ہو گیا، یہ عمل اس نے کئی بار دہرایا، سماں تک کہ دونوں پلڑے خالی ہو گئے اور بیوں کے لیے کت افسوس ملنے کے سوا کچھ باقی نہ رہا، ان دنیاوی فرنگ نے اب تک ہماری دنیا کے ساتھ کیا کیا ہے، جب سے ان کو دنیا کے معاملات میں عمل دخل کا موقع ملا ہے، ان کی بندر بانٹ جاری ہے، پہلے انھوں نے دنیا کو مشرق و مغرب میں تقسیم کیا اور حکمتِ علی یہ اختیار کی کہ مغرب تو ان کا ہے ہی کہ وہ مغرب کے ہیں اور مغرب ان کا ہے، رہا مشرق تو اس کو انھوں نے طرح طرح کے حربے اور ہتھکنڈے اختیار کر کے اپنے استعماری اور استعمالی عزم کی آماجگاہ بنا رکھا ہے، ان ہی حربوں اور ہتھکنڈوں میں سے ایک استشرق بھی ہے، یہ مشرق جنھیں اسکا لڑکا پُر فریب نام دیا جاتا ہے، یہ درحقیقت مغربی استعمار کے دو پاؤں میں سے ایک ہے، میں نے ان کے لیے ایجنٹ کا لفظ استعمال نہیں کیا، ایجنٹ دو مردوں کا کارندہ اور آلہ کار ہوتا ہے، یہ کسی کے آلہ کار نہیں، یہ ان کا اپنا کاروبار ہے، یہ فقط تقسیم کار ہے، ہاں ان کے آلہ کار بھی ہیں، ان کا ذکر بھی میں کر دوں گا، ان کے ذکر کے بغیر یہ داستان نامکمل رہ جائے گی۔

استشرقین کے نام میں بطورِ بڑی معصومیت ہے، اور نام ہی پر کیا موقوف ہے، ان کے کام کو بھی دیکھیں تو باری نظر میں اس میں برائی کی بات نظر نہیں آئے گی، آخر اس میں برائی کی کیا بات ہے، اگر بے چارے مغربی اسکا لڑا اور مفکرین مشرقی علوم و فنون کی تحصیل و تحقیق میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں، وقت ہی نہیں، سرمایہ اور ذہنی صلاحیتیں بھی، وہ کام جو ہمیں کرنا چاہیے، بے چارے وہ کر رہے ہیں، کیا یہ ان کا احسان نہیں ہے اہل مشرق پر؟ سادہ لوح اہل مشرق سادہ لوح مسلمان ان کا احسان مانتے ہیں، لیکن ساتھ ہی ان کو گلہ بھی ہے ع

مجھ پہ احسان جو نہ کرتے تو یہ احسان ہوتا

اس لیے کہ ع جوئے تم دوست جس کے دشمن اس کا آسماں کیوں ہو

اب میں عنوان کے تیسرے لفظ اسلام کی طرف آتا ہوں۔

اسلام کی دو تعبیریں ہیں، ایک لغوی، دوسری اصطلاحی، لغوی تعبیر کی رو سے اسلام ابتدائے آفرینش کا زائنت

کا آسمانی مذہب رہا ہے، آدم سے لیکر نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک معلوم نامعلوم، معروف غیر معروف تمام انبیاء دین اسلام ہی کے حامل، داعی اور نقیب تھے:

إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ

اللہ کا اصل دین اسلام ہے

(آل عمران: ۴)

نوح، ابراہیم، داؤد و سلیمان، موسیٰ، عیسیٰ علیہم السلام سب کا دین اسلام ہی تھا، اس لیے کہ انہوں نے جس دین

کی دعوت دی اس کی روح بنیادی طور پر ایک تھی، لیکن اصطلاحاً بطور اسم علم کے یہ نام اس دین کو اس وقت دیا گیا جب نبی آخر الزماں کو اس کے بار امانت سے سرفراز کیا گیا۔

اب میں نے تمہارے لئے دین کو کامل کر دیا اور

أَيُّوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَ

تم پر اپنی نعمت تمام کر دی، اور تمہارے

أَتَمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيْتُ

لئے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند فرمایا۔

لَكُمْ الْإِسْلَامَ دِيْنًا۔ (مائدہ: ۳)

اس کی شہادت قرآن میں مذکور اس دعار سے بھی ملتی ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے امت مسلمہ کے نام سے ایک نئی امت

متعارف کرانے کے لیے کی، غالباً اسی لئے قرآن نے وجہ تسمیہ کے ذکر میں اس کی نسبت حضرت ابراہیم کی طرف کی ہے: هُوَ

شَاكِرُ الْمُسْلِمِيْنَ (حج) (حضرت ابراہیم ہی نے تمہیں مسلم کا نام دیا) عرف عام میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے

ہوئے دین کے لیے اسلام کا لفظ خصوصیت کے ساتھ جو بولا جاتا ہے تو اس میں اسلام کی یہی اصطلاحی تعبیر مراد ہوتی ہے۔

اور آج کے موضوع میں بھی بالفعل اسلام کی یہی تعبیر مراد ہے، جس کی تاریخ خدا کے آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت

اور اس کی آخری کتاب قرآن مجید کے نزول سے شروع ہوتی ہے۔

استشراق کی تاریخ کا رشتہ یورپ کی نشاۃ ثانیہ اور تحریک احیائے علوم سے جوڑا جاتا ہے، لیکن یہ غلط ہے، استشراق

کے لفظ اور اس کے ظاہر سے دھوکہ نہیں کھانا چاہیے۔ ع

میرے ظاہر سے نہ کرنا اندازہ باطن میں

یہ تحریک بہت پرانی ہے، اس کے ڈانڈے ازل سے ملے ہوئے ہیں

تیزہ کا رہا ہے ازل سے تا امروز چسپانہ مصطفوی سے شرار بولہبی

زیر بحث مضمون کے دائرے میں ہم اسلام کے ساتھ اس کے تعلق کے آغاز اور اس کی نوعیت کا سراغ لگائیں اور عمدہ بہ عمدہ اس کی رفتار کار کا جائزہ لیں تو ہم جلد اس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں کہ الفاظ اور اصطلاحات سے صرف نظر کر کے دیکھیں تو نظر آتا ہے کہ روح استشراق روز ازل سے موجود ہے، موجود ہی نہیں فعال اور سرگرم عمل ہے، حالات و تحت وہ بھیس بدلتی رہی، اپنی حکمت عملی تبدیل کرتی رہی، اس کے طریق واردات، حربی تدابیر، زور آزمائی کے دائرے میں کمی بیشی ہوتی رہی، اُتار چڑھاؤ آتا رہا اور رد و بدل ہوتا رہا، مگر یہ عمل اس وقت سے لے کر اب تک جاری ہے، اور آئندہ بھی کسی نہ کسی صورت میں جاری رہے گا، اور اس کا مقصد ان کے اپنے نقطہ نظر سے جو بھی ہو، اور وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ان سے بھی نہیں، ہم سے بھی نہیں، مگر مقصد ہمارے نقطہ نظر سے یہ ہے کہ ہمارے دعویٰ ایمان اور جذبہ اسلام کا امتحان ہوتا رہے، اور اللہ یہ دیکھ لے کہ جو لوگ ایمان کے دعویدار ہیں ان میں کون اپنے دین پر ثابت قدم رہتا ہے اور کون گمراہ ہو کر دین سے پھر جاتا ہے، اس کا نشانہ ہی بھی قرآن مجید نے اپنے زمانہ نزول ہی میں کر دی تھی، سورہ بقرہ میں جہاں تجویل قبلہ کا ذکر ہے ذرا مختلف سیاق و سباق میں اس حکمت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا

اِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ

يَنْقَلِبُ عَلٰى عَقْبَيْهِ

(بقرہ: ۱۴۳)

اور جس قبلہ پر تم تھے ہم نے اس کو صرف اس لیے ٹھہرایا تھا کہ ہم الگ کر دیں ان لوگوں کو جو رسول کی پیروی کر نیوالے ہیں ان لوگوں سے جو پیٹھ پھیر کر جانے والے ہیں۔

یہی نہیں، ذرا دور تک گرائی میں جا کر وقت نظر سے دیکھا جائے۔ تصادم، کشاکش اور آویزش کی داستان اتنی ہی قدیم ہے کہ جتنا خود انسان، روز ازل، آدم اور ابلیس کا قصہ، پھر آدم اور شیطان کا ایک ساتھ ہبوط، دنیوی زندگی میں حق کے ساتھ باطل، اسلام کے ساتھ کفر، ایمان کے ساتھ کجاد کو بھی اپنا کاروبار جاری رکھنے کی کھلی چھوٹ کا مقصد کیا ہے؟ معرکہ خیز دُشمن دنیا میں کب برپا نہیں رہا، روز ازل سے یہ معرکہ جاری ہے اور رہتی دنیا تک جاری رہے گا، قصہ کوئی



یہ کہ وہ روح جسے استشراق کا خوشنام دیا جاتا ہے، بہت پرانی ہے، اس کا بھیس بدلتا رہتا ہے، اقبال نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں اگرچہ پیر ہے آدم، جو ان میں لات دربات

جیسا کہ میں نے کہا استشراق ایک تحریک ہے، اسکی ایک تاریخ ہے، اس کا ایک مقصد ہے، اس کے ہاں مقصد کے حصول کا طریقہ بدلتا رہتا ہے، مقصد نہیں بدلتا، اسلام بھی ایک تحریک ہے، اس کی بھی ایک تاریخ ہے، اس کا بھی ایک مقصد ہے، لیکن اس کے ہاں مقصد کی طرح طریقہ کار بھی نہیں بدلتا، ان دونوں میں فرق کی وجہ ان دونوں کا باہمی اختلاف ہے، یہ اختلاف سطحی نہیں، بلکہ بنیادی ہے، اور اس کا تعلق ان کی فطرت سے ہے، اسلام حق کا علمبردار ہے جو رنگ نہیں بدلتا، استشراق باطل کا حاشیہ بردار ہے جو موقع و محل دیکھ کر رنگ بدل لیتا ہے، اقبال نے اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے

باطل دوئی پسند ہے حق لا شریک ہے شکر کوئی میانہ حق و باطل نہ کر قبول

استشراق کی ابتداء کب اور کن حالات میں ہوئی اور اس کے پیچھے کیا مقاصد تھے، کس قسم کے اسکالروں نے اس کی طرف توجہ کی، ان کے اپنے حالات و کوائف کیا تھے، اس زمرے سے تعلق رکھنے والے مختلف اسکالروں کا رویہ اور طرز عمل مشرق بائیسویں اسلام کے ساتھ کیا رہا ہے، ہمدردی یا غیر ہمدردانہ، حقیقت پسندانہ یا متعصبانہ، جانبدارانہ یا غیر جانبدارانہ، روادارانہ یا جارحانہ اور معاندانہ؟ یہ ایسے سوالات ہیں جن کے متعلق کافی بحث ہو چکی ہے اور اب بھی کوئی شخص ان کا تاریخی جائزہ لینا چاہے تو اس کی ضرورت یا افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، مگر مجھے بالفعل ان سوالات سے تعرض نہیں کرنا ہے۔ یہ ایک سادہ حقیقت ہے کہ امتداد زمانہ کے ساتھ استشراق نے ایک روایت، تحریک بلکہ باقاعدہ منظم ادارے کی شکل اختیار کر لی جس کی اپنی ایک تاریخ ہے، یہ تحریک کس طرح پروان چڑھی، کس کے جلو میں مغرب کا یہ ابر رحمت مشرق میں آیا اور اہل مشرق پر سایہ فگن ہوا؟ یہ کوئی سربتہ راز نہیں، مغرب کے افق سے طلوع ہونے والا یہ سورج کیونکر دور دراز کا سفر طے کرتا ہوا مشرق میں لمعہ افگن ہوا، مشرق جسے مبداء فیاض سے خلقت یہ شرف حاصل رہا کہ اس کے آفاق و مطلق سے آفتاب عالم تاب کا نور ہی نہیں پھیلتا اور ماہتاب کی چاندنی ہی نہیں چھلکتی بلکہ علم کی روشنی اور دین و مذہب کا اُجالا بھی ہمیں سے نمودار ہوتا رہا، اسے کیسے گمن گام کیا؟ میں ان امور کو بھی نہیں چھیڑنا چاہتا، یہ طول طویل بحثیں ہیں، میں جن سے صرف نظر کر کے اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوتا ہوں

اسلام حق کا پیغام لے کر آیا تو اس کے راستے میں جو لوگ حائل ہوئے ان میں کفار قریش کے علاوہ یہود و نصاریٰ بھی تھے، یہود و نصاریٰ کی نفسیات بوجہ اس باب میں کفار قریش سے مختلف تھیں، ان میں نسلی تعصب کے علاوہ مذہبی عصبیت بھی تھی، لہذا ان کا تعلق حضرت ابراہیمؑ کی دوسری شاخ حضرت اسحاقؑ سے تھا، جبکہ داعی اسلام کا تعلق اس خاندان سے تھا جو حضرت اسماعیلؑ سے چلا، مذہبی اعتبار سے یہود و نصاریٰ پہلے سے حامل کتاب تھے اور اس بات کے منتظر تھے کہ آخری نبی کی بعثت بھی ان ہی میں ہوگی، خاندانی رقابت کا یہ احساس ان میں اس حد تک غالب تھا کہ انھوں نے قبائلی اور ذبح عظیم کے واقعہ کی اصلیت کو چھپانے کے لئے خود اپنی کتابوں میں تحریریں کیں، اسلام جب انہیں ایک غالب قوت کی حیثیت سے ابھرتا نظر آیا تو انھوں نے اس کا راستہ روکنے کے لئے اپنی چوٹی کا زور لگا دیا اور حالات کے تحت ادل بدل کر وہ تمام تدبیریں اختیار کر چکے تھے، ان ہی تدبیروں سے ایک تدبیر وہ بھی تھی جسے آج کی زبان اور اصطلاح میں استشراق کا نام دیا جاتا ہے، اہم یہ ہے کہ اس کی نسبت اسلام کا رویہ مذمت اور اظہار نکیر ہی کا ہو سکتا ہے۔

قرآن مجید نے اس زمانہ میں جو روح استشراق کی پردہ دری ان الفاظ میں کی ہے:

وَقَالَ الَّذِينَ كَفَرُوا لَا تَسْمَعُوا لِهَذَا

اور کافروں نے کہا اس قرآن کی باتیں نہ سنانا

الْقُرْآنِ وَالْغَوَافِرِ فِيهِ لَعَنَّاكُمْ تَلْبُوتُونَ

اور اس میں گڑبڑ پیدا کر دو، شاید اس طرح

(حم السجدة ۴: ۲۶) تم غالب آ جاؤ۔

آج اسرائیل اور بعض باطل پرست فرقے قرآن مجید کے غلط نسخے چھاپ کر پھیلانے کی جو ناپاک کوشش کر رہے

ہیں، کیا وہ اسی سلسلہ کی کڑی نہیں جس کا ذکر مذکورہ بالا آیت میں کیا گیا ہے؟

اہل کتاب کے ایک گروہ نے یہ حربہ اختیار کیا کہ ان کے آدمی صبح اسلام لاتے اور شام کو دائرہ اسلام سے

نکل جاتے تاکہ اس طرح لوگ اسلام سے برگشتہ ہوں جس کا ذکر آل عمران کی آیت ۷۲ میں کیا گیا ہے:-

وَقَالَتْ طَّائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ

اور اہل کتاب کا ایک گروہ کہتا ہے کہ مسلمانوں

أَمِنُوا بِاللَّهِ نَزَّلَ عَلَيَّ الدِّينَ

پر جو چیز نازل کی گئی ہے اس پر صبح کو ایمان

آمَنُوا وَجِبَ الْفَارِ وَأَكْفَرُوا آخِرًا

لاؤ اور شام کو اس کا انکار کر دیا کرو تاکہ

لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ . (آل عمران ۷۲)

وہ بھی اس سے برگشتہ ہوں۔

باطل پرستوں کی ایک چال یہ بھی ہوتی ہے کہ کچھ دوا اور کچھ لو کا معاملہ کر کے بیچ کا راستہ اختیار کریں، لیکن حق کے لیے یہ قابل قبول نہیں، آنحضرتؐ کے زمانہ میں بھی یہ حکمت عملی موجود تھی جس کی نشاندہی قرآن مجید نے سورہ نون کی آیت ۹ میں کی ہے:

وَدُّوا لَوْ تُدْهِسُونَ ﴿۹﴾  
 وہ چاہتے ہیں تم اپنے موقف سے بٹو تو وہ بھی بٹیں۔  
 (نون: ۹)

یہ رجحان اس زمانہ ہی میں نہیں تھا، بلکہ آج کے استشراق میں بھی موجود ہے، مسلم کر سچین ڈائیلاگ کے عنوان سے آج جو کوششیں ہو رہی ہیں، ان کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہے کہ بیچ کی راہ نکال کر دفع الوقتی کی جائے، جبکہ اسلام اسکو پسند نہیں کرتا، وہ صاف صاف کہتا ہے:

أَدْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً  
 اسلام میں پورے طور پر داخل ہو جاؤ

اس کے نزدیک دُوبی راستے ہیں، اسلام یا کفر:

أَفْتَوْهُ مِثْرًا مِّنْ بَعْضِ الْكِتَابِ وَ  
 کیا تم کتاب الہی کے ایک حصہ پر ایمان رکھتے

كَافِرُونَ بِبَعْضِ (بقرہ: ۸۵)  
 ہو اور اس کے دوسرے حصہ کا انکار کرتے ہو؟

یہ حکمت عملی اس کے نزدیک کفر ہی کی ایک صورت ہے، سورہ بقرہ کی آیت ۸۵ میں اس طرز عمل کی نشاندہی کر کے صرف دنیوی ذلت اور عذاب آخرت کی دھمکی دی گئی ہے، لیکن سورہ نسا کی آیت ۱۵۰ میں اس روش کو حقیقی کفر سے تعبیر کیا گیا ہے:

وَيَقُولُونَ نَحْنُ مُؤْمِنُونَ بِبَعْضِ وَكَفَرُوا بِبَعْضِ  
 اور وہ کہتے ہیں کہ ہم بعض پر ایمان لاتے ہیں

وَيُرِيدُونَ أَنْ يُتَّخَذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا  
 اور بعض کا انکار کرتے ہیں، اور وہ چاہتے ہیں کہ

أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا  
 ان کے درمیان کوئی راہ نکالیں، یہی لوگ حقیقت

کے کافر ہیں

(نسا: ۱۵۰)

قرآن شریف کی یہ چند آیات جو اوپر بیان کی گئیں ان کے آئینے میں ہم آج کے مستشرقین اور استشراق کا چہرہ برانگندہ نقاب دیکھ سکتے ہیں اور اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اسلام ان کے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے، قرآن و اشکاف الفاظ میں یہود



دنصاری کے ساتھ ربط و تعلق قائم کرنے سے منع کرتا ہے اور ایسے لوگوں کو جو ان کے ساتھ دوستی رکھتے ہیں ان کو انہی میں شمار کرتا ہے، سورہ مائدہ کی آیت ۵۱ میں کس قدر دو ٹوک انداز میں اس کی صراحت ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُودَ  
وَالنَّصَارَىٰ أَوْلِيَاءَ ۚ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ  
بَعْضٍ وَمَنْ يَتَّخِذْهُمُ  
مِّنْهُمْ إِيْنًا فَلَيْسَ مِنَ اللَّهِ  
وَالَّذِينَ آمَنُوا ۚ إِنَّ اللَّهَ  
لَيَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ

اسے ایمان والو! تم یہود و نصاریٰ کو اپنا  
دوست نہ بناؤ، وہ آپس میں ایک دوسرے  
کے دوست ہیں، اور تم میں سے جو ان کو اپنا دوست  
بنائے گا تو وہ انہی میں سے ہے، اللہ ظالموں کو  
راہ یاب نہیں کرے گا۔ (مائدہ: ۵۱)

عصر حاضر کے مستشرقین یہود و نصاریٰ نہیں تو اور کون ہیں، لیکن یا اللعجب کس قدر تعجب کا مقام ہے کہ آج مسلمانوں نے انہی یہود و نصاریٰ کے ساتھ مساویانہ حیثیت سے رسم و راہ رکھنا تو ایک طرف ان کو استاد کا درجہ دیکر اپنے دل و دماغ کی زمام کار ان کے ہاتھ میں دے رکھی ہے، اسلام اور مسلمانوں سے مستشرقین اور استشراق کے تعلق کے مختلف ادوار ہیں، ایک زمانہ میں انھوں نے مسلمانوں سے مختلف دنیوی علوم سیکھے، اس میں استاد کا درجہ حاصل کرنے کے بعد انھوں نے عربی اور اسلامی علوم کی طرف توجہ کی اور بڑی ہوشیاری سے آہستہ آہستہ ان کے بھی امام بن اور نوبت بایں جا رسید کہ آج کسی کو طبیعی اور سائنسی علوم میں ہی نہیں، عربی اور اسلامیات میں منہ فضیلت لینی ہوتی ہے تو وہ یورپ اور امریکہ کی ان جامعات کا رخ کرتا ہے جہاں یہ نام نہاد اسکالر دام تزدیر بچھائے دانہ ڈال کر شکار کی گھاٹی میں بیٹھے ہیں، کیا ان کا مقصد واقعی مسلمان نوجوانوں کو عربی اور اسلامیات پڑھا کر اسلام اور ملت اسلامیہ کی خدمت کرنا ہے؟ پورے پورے شعبے انھوں نے اس لئے کھول رکھے ہیں کہ مسلمان ذہن تیار ہوں؟ اسکالر رشپ میں بڑی رقمیں وہ اس لئے خرچ کرتے ہیں کہ مسلمانوں میں علماء اصبی کا نبیاء بنی اسرائیل پیدا ہوں؟ کوئی ہوشمند ایماندار آدمی اس کا جواب اثبات میں نہیں دے سکتا۔

استشراق کی تاریخ یہاں پونچ کر ایک نیا موڑ مڑ چکی ہے، وہ کام جو ایک صدی پہلے عیسائی مبلغین اور مستشرقین کر رہے تھے، اب اس کام کے لئے انھوں نے مسلمانوں میں سے آدمی تیار کر دیئے ہیں، اقبال کا مصرعہ یاد آتا ہے،  
انھوں نے ہمارے شاندار ماضی کے لئے کہا تھا

## پاباں مل گئے کعبہ کو صنم خانے سے

آج صنم خانہ کعبہ سے پابان حاصل کر رہا ہے، پہلے اس طرح کی اکاڈکامثالیں تھیں، آہستہ آہستہ ان میں اضافہ ہوتے ہوتے ان کی تعداد اتنی ہو گئی ہے کہ ہم اسے استشراق کے ایک طے شدہ دور سے تعبیر کر سکتے ہیں، میں نے بہت سوچا کہ استشراق کے ان علمبرداروں کو کیا نام دیا جائے، مستشرقین اور استشراق کی جو صحیح تعریف ہم نے آغاز کلام میں متعین کی تھی وہ تو ان پر صادق نہیں آتی، بعض لکھنے والوں نے ان کے لئے 'مستغربین' لکھا ہے، مگر اس کی موزونیت میں مجھے کلام ہی میں لفظیات اور اصطلاحات کے ماہرین کو دعوت دیتا ہوں کہ وہ اس کے لئے کوئی مناسب لفظ تجویز کریں۔

شیطان اس دنیا میں انسان کو گمراہ کرنے کا مشن لے کر آیا تھا، اس کو جب انسانوں میں ہی ایسے شاگرد مل گئے جو اس کے مشن کو اس سے زیادہ مستعدی کے ساتھ تکمیل کرنے لگے تو وہ فارغ ہو گیا، اسی طرح ہمارے مستشرقین بھی اب فارغ ہو چکے ہیں، کچھ وقت گزرنے کے بعد ان کا نام صرف تاریخ میں رہ جائے گا، لیکن اسلام رہے گا اور اس مستشرقین کی جگہ ایک نئی مخلوق سے واسطہ ہو گا جو کام انہی کا کرے گا، لیکن اس کا نام کچھ اور ہو گا، یہ مشیت الہی ہے، جو لوگ اسلام کے نام لیا ہیں، دل سے اسلام کی حقانیت کے قائل ہیں وہ خبردار ہو جائیں۔ وَمَا عَلَيْنَا إِلَّا الْبَلَاغُ

# سرپبلشن الیکٹرانڈرز اسکین گپ

(۱۹۶۱ء، ۱۸۹۵ء)

از

پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی، جامعہ ملیہ دہلی

مشرق کے مذاہب اور تہذیب و تمدن کے مطالعہ کے لئے مستشرقین نے جو کوششیں کی ہیں، ان کے مقام و مرتبہ کا ہمیں احساس ہے، اس میدان میں ان کی کاوشوں نے استشرق کو علم کا ایک ممتاز و دقیق شعبہ یعنی ایک مخصوص ڈسپلن بنا دیا۔ مستشرقین نے مشرق کے علمی خزینے کے ایک بڑے حصہ کو جو وقت کے دبیز دھند لکوں میں دفن تھا، نکالا، نادر اور نایاب کتابوں کا پتہ چلا کر اور انہیں حاصل کر کے ان کا مطالعہ کیا اور ان میں سے بہت سے نوادرات کو ایڈٹ کر کے نہایت اہتمام کے ساتھ شائع کیا، ان پر روشنی لکھی، بعض کی شرحیں کیں، مختلف زبانوں میں ان کے تراجم شائع کئے اور پھر ان سے مشرق اور مغرب کے عالموں اور محققین نے استفادہ کیا، انہوں نے تحقیق و تنقید کے ارتقار پذیر اصولوں اور طریقوں کی مدد سے اپنے تحقیقی کام اور علمی مقاصد کو باوقار بنانے کی بھی کوشش کی، اس کے علاوہ تہذیبوں اور مذہبوں کے مطالعہ میں انہوں نے دوسرے علوم مثلاً لسانیات، علم الالسنہ، فلسفہ، تاریخ اور سماجی علوم سے بھی مدد لی، اور اس طرح علم الاستشرق کو ایک

Inter disciplinary بنا دیا۔

ہیں ایسے مستشرقین کی علمی خدمات کا اعتراف ہے، لیکن ہیں اس کا افسوس ہے کہ ان کے علمی کارناموں کی جو کئی لحاظ سے قابل قدر ہیں، سب سے بڑی کمزوری ان کی موضوعیت اور داخلیت ہے، انہوں نے دعویٰ تو کیا معروضی مطالعہ کیا، لیکن حقیقت میں ان میں شاید ایک بھی ایسا نہیں جو اپنے ذہنی تحفظات اور مذہبی و تہذیبی تعصبات سے اپنا دامن محفوظ رکھ سکا ہو، خاص طور پر اسلام قانون اسلام، قرآن اور پیغمبر اسلام سے متعلق ان کے مطالعات غیر معروضی ہی نہیں، بلکہ اکثر مصنفین کے یہاں ان کا تعصب بھی صاف طور پر نمایاں ہے۔

مستشرقین میں عیسائی بھی ہیں اور یہودی بھی، لیکن عیسائیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے، اور اس کے تاریخی و



سیاسی اسباب ہیں، یہ لوگ اسلام اور پیغمبر اسلام سے نفرت اور تعصب کی جن روایات کے وارث ہیں، ان کی داستان صدیوں پرانی ہے، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو یہ سچا نہ ہوگا کہ یہ داستان چودہ سو برس پر پھیلی ہوئی ہے، اس میں کئی آثار چڑھاؤ ہیں اس کے کردار بدلتے رہے ہیں، اس کے پلاٹ میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں، لیکن داستان کا بنیادی نکتہ ایک اور صرف ایک رہا ہے۔

بیسویں صدی کے تیسرے دہے سے، اور خاص طور پر دوسری جنگ عظیم کے بعد مستشرقین کے رویے میں خاصی تبدیلی ہوئی ہے، اس تبدیلی کے سیاسی و معاشی اسباب ہیں، لیکن اس زمانہ میں علم الاستشراق یعنی اورینٹلزم کا اعلیٰ اعتبار سے انحطاط بھی ہوا ہے، اور اب ایسے عالم مستشرق نہیں ملتے جیسے کہ انیسویں صدی اور بیسویں صدی کے اوائل میں تھے، بس ایک سنجیدہ اور بردبار مستشرق نظر آتا ہے، جس کا علم بھی گہرا ہے اور نظر بھی دقیق ہے، لیکن وہ بھی مکمل طور پر غیر جانبدار نہیں ہے، اور ان کی بعض تحریروں میں ان نظریات و تصورات کی جھلک دکھائی دیتی ہے جو اسے اس شعبہ علم میں اپنے پیشرووں سے ورثہ میں ملے ہیں، ہماری مراد سرہیلٹن ایگزیکٹو ڈائرکٹور وکیلین گب سے ہے جو علمی دنیا میں ایچ۔ اے۔ آر۔ گب کے نام سے مشہور ہیں اور وہی مقالہ کا موضوع ہیں۔

سرہیلٹن گب ۲ جنوری ۱۸۹۵ء کو اسکندریہ میں پیدا ہوئے، جہاں ان کے والد ایک کمپنی میں ملازم تھے، ان کی تعلیم اسکاٹ لینڈ میں ایڈنبرا کے رائل ہائی اسکول اور ایڈنبرا یونیورسٹی میں ہوئی، ایڈنبرا یونیورسٹی میں وہ ۱۹۱۲ء میں داخل ہوئے، جہاں ان کے خاص مضامین سامی زبانیں یعنی عبرانی، عربی اور آرمی تھیں، پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی تو انھوں نے رائل فیلڈ آرٹیلری میں شامل ہو کر فرانس اور اٹلی میں فوجی خدمات انجام دیں، ۱۹۱۹ء میں انھیں ان کی درخواست پر یونیورسٹی سے زمانہ جنگ کی ڈگری ملی، اور پھر وہ لندن کے اسکول آف اورینٹل اسٹڈیز میں داخل ہوئے جہاں سے انھوں نے ۱۹۲۲ء میں عربی میں ایم۔ اے کی ڈگری حاصل کی، ۱۹۲۱ء ہی میں وہ سر تھامس آرنلڈ کی زیر نگرانی عربی کے لکچرر مقرر ہو گئے تھے، ۱۹۲۶ء میں انھوں نے مشرق وسطیٰ کا سفر کیا، جہاں وہ تقریباً ایک سال مقیم رہ کر جدید عربی ادب کا مطالعہ کرتے رہے، اس سے قبل وہ کئی مہینے شمالی افریقہ میں گزار چکے تھے، ۱۹۲۹ء میں وہ لندن یونیورسٹی میں تاریخ ادب عربی کے ریڈر مقرر ہوئے اور ۱۹۳۳ء میں آرنلڈ کے انتقال کے بعد وہ ان کے جانشین کی حیثیت سے اس شعبہ کے سربراہ بن گئے، آرنلڈ کے بعد وہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام کے انگریزی ایڈیٹر بھی مقرر ہوئے، اس حیثیت سے ۱۹۵۶ء تک

وہ اس انسائیکلو پیڈیا کی تالیف میں شریک رہے، اس کے دونوں ایڈیشنوں میں ان کے بہت سے مضامین شامل ہیں، لندن یونیورسٹی کے شعبہ عربی میں وہ ۱۹۳۷ء تک رہے، اسی سال وہ عربی کے پروفیسر ہو کر آکسفورڈ چلے گئے جہاں ان کا قیام ۱۹۵۵ء میں امریکہ کی مشہور یونیورسٹی ہارورڈ نے انھیں عربی کے پروفیسر کی حیثیت سے بلایا، اس خیال سے کہ امریکہ میں مشرق وسطیٰ سے متعلق علاقائی مطالعات کے وسیع امکانات ہیں، انھوں نے ہارورڈ یونیورسٹی کی پیش کش کو قبول کر لیا، ۱۹۵۷ء میں وہ ہارورڈ یونیورسٹی میں ڈل ایٹرن اسٹڈیز سینٹر کے ڈائریکٹر مقرر ہوئے، ۱۹۶۴ء میں وہ عربی کی پروفیسر شپ سے تو ریٹائر ہو گئے، لیکن سینٹر کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کرتے رہے، اسی سال وہ سخت بیمار پڑے اور ان پر فالج کا حملہ ہوا، اس کے بعد زندگی کے باقی دن انھوں نے آکسفورڈ میں گزارے جہاں ان کی اہلیہ لیڈی گب نے ۱۹۶۹ء تک، کہ اسی سال لیڈی گب کا انتقال ہوا، ان کی خدمت گزار اور تیماردار تھیں، لیڈی گب کی وفات کے بعد کوئی دو سال وہ اور زندہ رہے، لیکن یہ دو سال ان پر بڑے سخت گذرے، تنہائی اور بے بسی کی زندگی، مفلوج زندگی، اب وہ زیادہ عرصہ زندہ نہیں رہ سکتے تھے، آخر ۲۲ اکتوبر ۱۹۷۱ء کو انھوں نے اس دنیا کو خیر باد کہا۔

علمی دنیا نے سرہیلٹن گب کے علمی کارناموں کا خوب خوب اعتراف کیا، کئی اعزاز ان کو ملے، کئی علمی و ادبی سہ ماہیوں کے وہ ممبر رہے، لیکن ان سب کی تفصیلات کا یہ موقع نہیں، البتہ شاید اس بات کا جاننا لوگوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہو کہ گب قاہرہ کی اکیڈمی آف لنگویج اور دمشق اور بغداد کی عربی اکاڈمیوں کے بھی ممبر تھے، گب نے خود کافی لکھا اور بہت سی کتابوں کے ریویوز بھی لکھے، ان کے مضامین کی فہرست بھی خاصی طویل ہے۔ یہاں ان کی خاص تصانیف کی فہرست، تاریخ طباعت کی ترتیب سے درج کی جاتی ہے:

(۱) The Arab Conquest in Central Asia (London, 1923)

(۲) Arabic Literature (London) 1926 Revised Edition Oxford, 1963

(۳) On Saltula, Travels in Asia and Africa (London, 1929)

(۴) Damascus Chronicles of the Crusades (London) 1932

(۵) Modern Trends in Islam (Chicago, 1947)

Mohammedanism ( London, 1949 ) (۶)

اب تک اس کتاب کے پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

Islamic Society and the West, Vol. I (Part I ) (۷)

London 1950, Part II London, 1957, with H. Bowen

The Travels of Ibn Battuta (Cambridge, Vol. I (۸)  
1958. Vol. II, 1961

Studies on the Civilization of Islam (edd. (۹)

S. J. Shaw and H. R. Polk. Boston, 1962 )

The Life of Saladin from the Works of Imadudd- (۱۰)

in and Baha'ud-Din ( Oxford, 1973 )

مغرب میں سرہیلٹن گب کے عقیدتمندوں نے انہیں صف اول کے اسلامک اسکالرز میں شمار کیا ہے، ظاہر ہے کہ اس سے ان کی مراد مغرب کے ان علماء و محققین سے ہے جنہوں نے اسلام کے مطالعہ میں اپنی زندگی کا بیشتر حصہ صرف کیا، وہ مسلمان بھی ان کی محققانہ قابلیت اور مورخانہ ثروت بینی کے قائل ہیں جنہوں نے ان کی تصنیفات کا یہ نظر غائر مطالعہ کیا ہے، اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پروفیسر گب کی بعض کتابیں اور مضامین ان کے وسیع مطالعہ تعبیر و تشریح کی بھرپور صلاحیت، فکر کی شادابی و تازگی اور گہری تاریخی بصیرت کے شاہد ہیں، ذیل میں ہم ان کے چند مضامین کے عنوانات درج کرتے ہیں، یہ مضامین تھوڑے تھوڑے وقفہ سے دنیا کے مشہور علمی مجلات میں شائع ہوئے اور ان کے مضامین کے گراں قدر مجموعے Studies on the Civilization of Islam میں شامل ہیں۔

- (1) An Interpretation of Islamic History (2) Social Significance of the Shu'ubiya (3) The Evolution of Government in Early Islam. (4) The Asmies of Saladin. (5) The Achievement of Saladin. (6) Al-Mawardis Theory of the Caliphate. (7) The Islamic



## Background of Ibn-e-Khaldun's Political Theory

## (8) The Structure of Religious Thought in Islam

ان کے علاوہ جدید عربی ادب کے ارتقار پر بھی ان کے بعض مضامین ہیں، جن میں جدید رجحانات سے متعلق سیر حاصل بحث کی گئی ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کہ پروفیسر گب اپنے اکثر مباحث مشرقین کے مقابلہ میں عربی زبان و ادب سے کہیں زیادہ واقف تھے، بلکہ ان سے ایک گرا تعلق بھی رکھتے تھے، ان کے ایک مضمون Islamic Biographical Literature (اسلامی سوانحی ادب) سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ اسلام اور تاریخ اسلام کے مطالعات میں عربی ادب کے وسیع مطالعہ کو کتنی اہمیت دیتے تھے، وہ حقیقت عربی زبان کے شیدائیوں میں تھے، اور عربی ادب کے شہ پاروں کے تخلیقی حُسن کے بڑے قہر دان تھے، مقدمہ تاریخ ابن خلدون کوئی چالیس برس تک ان کے فکر و نظر کی جولان گاہ رہا، اور وہ اس سے علم و آگہی اور مسرت و انبساط حاصل کرتے رہے، اس کے ادبی محاسن کا ذکر انھوں نے کچھ اس طرح کیا ہے:

”ابن خلدون کا تخیل جو ایک حیات آفریں، براہ راست اور رنگین درعنا شخصیت کا حامل ہے، معنوی عظمتوں

کو چھوٹا ہے، اس کی طلاق سانی سے فرادانی اور وفور کا احساس ہوتا ہے۔ اس کے خیالات آثار آسا

بڑھے ہیں مگر کبھی کبھی یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ پُر جوش بے ربطی کی نیم ظلمتوں میں کھو جاتے ہیں، لیکن ابن خلدون

کی خوش وضع اور خوش آہنگ نثر بڑی حد تک انھیں مربوط رکھتی ہے، جلوں میں تراکیب اور فقروں

کی چست اور نفیس تنظیم انھیں قابو میں رکھتی ہے، وہ اپنے خیالات کا اظہار ایک ایسی تربیت یافتہ شائستگی

اور لطافت سے کرتا ہے کہ ہر لفظ معنوی طور پر اس کے دلائل کا تابع ہوتا ہے۔“

در اصل سرہیلٹن گب کا خاص میدان تاریخ و تمدن تھا اور ان دونوں کے ارتقار و نشوونما میں وہ زبان و ادب

کے رول کی اہمیت سے بخوبی واقف تھے، لیکن تاریخ و تمدن کے موضوعات پر انھوں نے جو کچھ لکھا ہے اس میں ہیں ان کی

تمام تعبیرات و تشریحات سے اتفاق نہیں ہے، اور بعض مقامات پر صاف معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے پہلے ہی سے کچھ نظریے

تاکم کر لیے ہیں، اور واقعات کو وہ اپنے انہی نظریوں کی روشنی میں دیکھتے ہیں، مثلاً اپنے مضمون - An Interpretation of Islamic History میں وہ پورے یقین کے ساتھ لکھتے ہیں کہ چونکہ ناگزیر معاشی محرکات نے عرب کے حالات نے استحکام کی کسی صورت کو تقریباً ناممکن بنا دیا تھا، اس لئے بادیہ نشین قبائل کی مخالفت کو فوجی طاقت کے ذریعہ دبا دینا مسئلہ کا مناسب اور مستقل حل نہیں ہو سکتا تھا، اس کے لئے ضروری تھا کہ ایسے حالات پیدا کئے جائیں جن میں عرب کے قبائل اگر اسلام میں پورے طور پر داخل نہ ہوں تو کم از کم اسلام سے اپنے دنیوی مفاد کو وابستہ سمجھیں، یہی وجہ ہے کہ حضرت محمدؐ کی وفات کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے سوچی سمجھی اسکیم کے تحت کئی سرداروں کی قیادت میں قبائل کو شام کی سرحدوں پر حملہ کے لئے بھیجا، مقصود گویا یہ دیکھنا تھا کہ اگر قبائل کی توجہ دوسرے ملکوں کی طرف پھیر دی جائے تو ان پر اس کا کیا رد عمل ہوگا، اس میں کامیابی ہوئی تو پھر جنگوں اور فتوحات کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔

تعبیر کا یہ وہ انداز ہے جسے ہم سراسر معاشی و مادی انداز فکر کہتے ہیں، اس میں آپ کو دین اسلام کی انقلابی اصلاحی تعلیمات کی تاریخ ساز کارفرمائی کہیں نظر نہیں آئے گی، یعنی یہ کہ بدوی قبائل نے اسلام کو اس کے اپنے انسانی وردہا اصولوں کی بنا پر نہیں اپنایا، بلکہ جب انہوں نے دیکھا کہ اس سے ان کا دنیوی و معاشی مفاد وابستہ ہے تو اسلام سے انہیں تعلق پیدا ہوا ایسا معلوم ہوتا ہے پہلے گب نے اپنے ذہن میں ایک کلیہ قائم کیا اور پھر شام و عراق میں اسلامی فتوحات کو اسی کلیہ کی روشنی میں پیش کرنے کی کوشش کی، ہمارے نزدیک یہ رویہ فن تاریخ نگاری کے جدید اصولوں کے مطابق بھی نہیں ہے، اس لیے کہ اس رویہ سے اسی تاریخی معروضیت کا وقار مجرد ہوتا ہے جس پر مغرب کے جدید محققین ناز کرتے ہیں۔

یہی رویہ گب کا حدیث کے بارے میں ہے، اسی مضمون میں وہ اپنے قاری کو حسن بیان اور اپنے مخصوص طرز استدلال سے مسحور کر کے یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ پہلی صدی ہجری کے ختم ہوتے ہوتے چونکہ قانون اور اس کو نفاذ کا پریچ مسئلہ پیدا ہو گیا تھا، اور صورت یہ تھی کہ خلافت کے مختلف شہروں اور صوبوں میں مقامی علماء اپنی اپنی فہم کے مطابق آزادانہ رائے دیتے تھے جو بسا اوقات باہم مختلف اور متضاد ہوتی تھیں اور اس پر مستزاد تھیں عرف و عادت اور اسطابق ضوابط سے پیدا ہونے والی پیچیدگیاں، اس لئے مذہبی رہنماؤں نے اس صورت حال کو خطرناک سمجھا، خاص طور پر جب مقامی قوانین قرآن کے اخلاقی اصولوں سے متصادم معلوم ہوتے ہیں، اس مسئلہ کا حل انہوں نے یہ ڈھونڈنا کہ

پیغمبر اسلام کے معاصرین کے واسطے سے احادیث بیان کرنی شروع کر دیں جہاں میں واضح معانی سے مستحق حضرت محمد سے روایتیں منقول ہوتی تھیں اور پھر یہ کہ ان احادیث کی پابندی ضروری ہے اور یہ کہ ان کی حیثیت آیات قرآنی سے مشکل ہی کمتر قرار دی جا سکتی ہے، اسی سلسلے میں آگے چل کر جہاں وہ حدیث اور علم حدیث کی تدوین کا ذکر کرتے ہیں تو وہ اسے علمائے حدیث کی تصنعی تخلیق سے تعبیر کرتے ہیں، ہم یہ نہیں سمجھتے کہ پروفیسر گب حدیث لٹریچر کے ارتقار سے قطعاً ناواقف ہوں گے یا انھیں اس اصول حسنہ کا علم نہ ہو گا جس کا واضح ذکر قرآن کریم میں ہے، اس لیے اس کے علاوہ اور کیا کہیے کہ وہ اپنی مذکورہ بالا تشریح اور "مصنوعی تخلیق" جیسے الفاظ و تراکیب سے حدیث کے اس دینی وزن اور تشریحی اہمیت کو اپنے مسلمان قاریوں کی نظر میں کم کرنا چاہتے ہیں جو ان کے دل میں اپنے محبوب پیغمبر سے اس کی اٹوٹ نسبت کی وجہ سے جاگزیں ہے اور جو گذشتہ چودہ سو برس میں اسلامی مذہبی ثقافت کے تسلسل و ارتقار میں بنیادی حیثیت کی حامل رہی ہے۔

دوسری بات یہ کہ پروفیسر گب نے اپنے طریقہ سے وہی نقطہ نظر دہرایا ہے جو حدیث کے سلسلہ میں گولڈ ٹیچر مارگولتھ اور لینس وغیرہ کا تھا اور جس کی کمزوریاں مسلمان علماء و محققین پہلے ہی واضح گمان کر چکے ہیں۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ پروفیسر گب کو سلطان صلاح الدین ایوبی کی شخصیت سے گہرا شغف تھا، انھوں نے بارہویں صدی عیسوی کی اس پرکشش اور غیر معمولی اسلامی شخصیت کا گہرا مطالعہ کیا اور ہر پہلو سے کیا *The armies of Saladin* کے عنوان سے ان کے مضامین جدید طرز کی تحقیق و تفحص کے اعلیٰ معیار کے نمونے ہیں، جہاں تک میں علم ہے اس موضوع پر اس دور کے مسلمان عالموں اور دانشوروں میں اس پایے کی تحقیق کا سراغ نہیں ملتا، لیکن سلطان صلاح الدین پر گب کا معرکہ الآرا مضمون *The Achievement of Saladin* کے عنوان سے ہے، اس مضمون میں انھوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ صلاح الدین ایوبی ایسی شخصیتوں میں سے نہیں تھے جو محض اپنے گرد و پیش کے حالات کی پروردہ ہوتی ہیں، بلکہ انھوں نے خود ایک بڑے مقصد کے لئے اپنی دینی اخلاق کے سہارے نہ صرف حالات کو اپنے موافق بنایا، بلکہ نئے حالات پیدا کئے اور سیاسی انحطاط اور اخلاقی زوال کے اس عہد میں اسلام اور مسلمانوں کی آبرو باقی رکھی۔

سے دیکھئے: سیرۃ النبی جلد اول اور جلد اولیٰ نمائی، مقالات سلیمانی جلد دوم از سید سلیمان ندوی اور اسلام از فضل الرحمن



پروفیسر گب نے لکھا ہے کہ عمد وسطیٰ کی تاریخ سے متعلق شاذ و نادر ہی ایسے مستند ماخذ ملتے ہیں جن کی مدد صحیح اور مثبت نتیجے نکالے جاسکیں اور جو تاریخی تنقید کے سخت سے سخت معیار پر بھی کھرے ثابت ہوں گے، سلطان صلاح الدین کی زندگی اور کارناموں سے متعلق خوش قسمتی سے عربی زبان میں اسی زمانہ کے پانچ مراجع دستیاب ہیں، ابن ابی مطر، ابن الاثیر (الکامل فی التاریخ) قاضی بہار الدین ابن شداد (النوادر السلطانیۃ) عماد الدین (البرق الشامی) اور القاضی الفاضل، گب نے ان پانچوں کی کتابوں اور تحریروں کو ہر پہلو سے جانچا ہے اور ان کی خوبیوں اور کمزوریوں کو تحقیق کے اعلیٰ معیار پر پرکھا ہے، ان مراجع میں وہ بہار الدین، عماد الدین اور القاضی الفاضل کی تحریروں کو جو سلطان سے بہت قریب اور اس کی زندگی کے ہر گوشہ سے واقف تھے، سب زیادہ اہم قرار دیتے ہیں، اور انہی سے استفادہ کر کے وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ صدیوں بعد یہ دیکھنے میں آیا کہ ایک مسلم حکمران مسلسل تین سال تک میدان جنگ میں اپنی افواج کے ساتھ اپنے ایک مستعد دشمن کے مقابلہ میں ڈٹا رہا، جب کہ اس عمد کا فیوڈل فوجی نظام ایسی طویل جنگ کا بمشکل تحمل ہو سکتا تھا، اور ان کے خیال میں یہ صورت صرف اس وجہ سے ممکن ہو سکی کہ باوجود اس کے کہ سلطان صلاح الدین کوئی بڑے ماہر جنگ یا تجربہ کار حکمران نہ تھے، وہی ایک ایسی شخصیت تھی جو صلیبی حملہ آوروں کے خلاف مسلمانوں کے مختلف النوع عناصر اور ان کی باہم متضادم سیاسی قوتوں کو اتحاد اسلامی کے لئے ایک مرکز پر متحد و مجتمع کر سکتی تھی، ہمت و شجاعت اور صبر و استقامت، ان سب اخلاقی خوبیوں سے تو وہ مستفید تھے ہی، اور یہ سب ان کے کام بھی آئیں، لیکن ان کی کامیابی میں ان خوبیوں سے زیادہ دخل تھا ان کی بے غرضی و بے لوثی، سخاوت و فیاضی اور اخلاق اسلامی کے اثبات برتری کو، جنہیں سلطان صلاح الدین نے دوست اور دشمن سبھی کے ساتھ یکساں برتاؤ، وہ سادہ لوح نہ تھے لیکن ان میں غضب کا انکار اور سادگی تھی، ان کی ایمانداری بے داغ تھی اور بلور کی سی چمک کھتی تھی ان کے دشمن حیران تھے کہ ان کی اس بات پر کہ سیاست اور جنگ دونوں میدانوں میں ان کے عزائم اور ان کے طور طریقے کیوں مختلف ہیں، مگر دفریب سے وہ کوسوں دور تھے اور دوسروں کے مکر و فریب کو شاذ ہی سمجھ پاتے تھے، ان کے اسدائی اخلاق نے انہیں معاہدوں کا احترام سکھایا تھا، وہ ہر قیمت پر معاہدوں اور وعدوں کی پابندی کرتے تھے، اور معاہدہ توڑنے والے دشمن کو ہمہ وقت یہ خیال رہتا تھا کہ اسے عمد گنی کی بھاری قیمت ادا کرنی ہوگی۔

1. Studies on the Civilization of Islam, p. 104

2. Studies on the Civilization of Islam, p. 99.

ہمارا خیال ہے کہ شاید ہی کسی عیسائی مورخ یا سوانح نگار نے مستند معاصر ماخذوں کی اچھی طرح چھان بین کر  
بعد اور تاریخی تنقید کے سارے اصولوں کو برت کر سلطان صلاح الدین کی ایسی خوبصورت اور سچی تصویر پیش کی ہو۔  
لیکن تاریخ و ادب سے ہٹ کر جب پروفیسر گب قرآن پاک اور سیرت رسول کے موضوع پر لکھتے ہیں تو اکثر  
مقامات پر وہ اپنی تاریخی بصیرت اور علمی معروضیت سے بے وفائی کرتے نظر آتے ہیں، ان کے اس رویہ کی توجیہ اسکے  
علاوہ اور کیا ہو سکتی ہے کہ ان کے مذہبی عقائد اور اس میدان میں تعصب اور جانبداری کی وہ روایات جو انھیں اپنے  
علمی ماحول اور اپنے پیش روؤں سے ورثہ میں ملی تھیں، ان کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہیں۔

قبل اس کے کہ دو تین مثالوں سے ہم اپنے اس خیال کی وضاحت کریں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان کا  
ایک قول یہاں نقل کر دیں، اپنی کتاب *Modern Trends in Islam* کے پیش لفظ میں وہ لکھتے ہیں کہ  
”ان استعاروں سے جن میں عیسائی عقیدہ روایتی طور پر محفوظ ہے، ذہنی طور پر میری تشفی ہو جاتی ہے، کیونکہ یہ استعارے  
اور علامتیں روحانی صداقت کی ان بلند ترین عظمتوں کی ترجمان ہیں جہاں تک میری فہم کی رسائی ہے، بشرطیکہ ان علامتوں  
اور استعاروں کی تشریح ایسی زبان میں کی جائے جس سے کسی تجسیمی و تشبہی عقیدے کا اظہار نہ ہوتا ہو، بلکہ ایسے عمومی  
تصورات کی صورت میں ان کا بیان ہو جو کائنات سے متعلق ہمارے بدلتے ہوئے نظریوں سے مطابقت رکھتے ہوں“  
قطع نظر اس کے کہ گب کے اس قول کے حقیقی ماہ اور ما علیہ کیا ہیں، اتنی بات صاف ہے کہ وہ عقیدہ  
کے عیسائی تھے، اور ہمارے نزدیک انھیں اس کا حق تھا کہ جس عقیدہ میں انھیں ذہنی دردھانی تسکین حاصل تھی، اسے  
وہ اپناتے، یہ بات خوشی کی ہے کہ وہ مسلمانوں کو بھی اس کا حق دیتے تھے، اور اسی لئے ان سے توقع کی جاتی تھی کہ وہ مسلمانوں  
کے عقائد اور حضور کی سیرت اقدس پر لکھتے وقت انصاف سے کام لیں گے، ہمارا خیال ہے کہ اس سلسلہ میں انکی عیسائیت  
تاریخی معروضیت اور مذاہب کے تقابلی مطالعہ کی اس بنیادی خصوصیت پر غالب آگئی جسے آج سے صدیوں پہلے ایک  
مسلمان عالم اور دانشور ابو ریحان البیرونی نے الآثار الباقیہ اور کتاب الہند کی تصنیف کے سلسلہ میں اپنایا تھا۔  
دوسروں کے مذہبی عقائد اور مذہبی روایات کے موضوعات پر لکھنے کی آزادی ہے، کسی ایک خاص مذہب  
کا پیروں دوسرے مذاہب کا مطالعہ کر سکتا ہے اور اپنے مطالعہ کے نتائج قلمبند بھی کر سکتا ہے، لیکن اس سلسلہ میں تصنیف

وتالیف کا اولین اور بنیادی اصول یہ ہونا چاہئے کہ پہلے زیر مطالعہ مذہب کے ماننے والوں کے عقائد پوری وضاحت کے ساتھ مکمل طور پر اس طرح بیان کر دیئے جائیں کہ اس شکایت کی کوئی گنجائش باقی نہ رہے کہ ان کے عقائد کو غلط طور پر یا تو طرور ڈر کر پیش کیا گیا ہے، اب اگر لکھنے والا کسی اور نظریے یا عقیدے کا حامل ہے اور وہ اپنے نظریے یا کسی اور کے نظریے کا ذکر کرنا چاہتا ہے تو اسے اس کا حق حاصل ہے، لیکن اسے چاہئے کہ وہ اپنے یا کسی دوسرے کے نظریے کو الگ سے اور پوری وضاحت سے پیش کرے۔

افسوس ہے کہ مشرقین قرآن پاک اور سیرت پر لکھتے وقت اس بنیادی اصول کو عموماً فراموش کر دیتے ہیں، اور کچھ اس طرح کا خلط بحث کرتے ہیں کہ صرف وہی لوگ جن کا اسلام کا مطالعہ اچھا ہے، یہ محسوس کر سکتے ہیں کہ لکھنے والا اپنے ذاتی خیال اور عقیدے کو اپنے قاریوں کے ذہن میں اتار دینا چاہتا ہے، حیرت ہے کہ پروفیسر گب جیسا بالغ نظر مصنف بھی جس کی علمیت و متانت کے بہت سے مسلمان بھی معترف ہیں، اپنا دامن اس عیب سے پاک نہ رکھ سکا۔

پروفیسر گب نے اسلام پر جو کتاب لکھی ہے، اس کا نام محمد بن ازم ہے، مارگو لیتھ کی کتاب اسی نام سے ۱۹۱۱ء میں چھپی تھی، پروفیسر گب نے اس خیال سے کہ بقول ان کے ۱۹۱۱ء کی علی فضا اور تھی، نظریے اور تھے، ذہنی جذبہ باقی تحدیدات مختلف تھے، اور چونکہ ہر دور کے ذہنی تحفظات و تعصبات کی پرچھائیں اس دور کی تحریروں میں باقی رہتی تھیں، خواہ ان سے بچنے کی کتنی ہی کوشش کیوں نہ کی جائے، اس لیے انھوں نے اسلام پر ایک نئی کتاب کا لکھنا ضروری سمجھا۔

وہ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو یہ پسند نہیں کہ انھیں محمد بن اور اسلام کو محمد بن ازم کہا جائے، لیکن اس کے باوجود انھوں نے اسلام کو محمد بن ازم کہنا ضروری سمجھا، ان کے خیال میں ایسا کہنا غلط بھی نہیں، کیونکہ ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ مسلمان بڑے فخر سے اپنے آپ کو "امت محمدیہ" کہتے تھے، دوسرے یہ کہ جب مسلمان لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ کہہ کر اسلام پر اپنے یقین کا اقرار کرتے ہیں تو اس کلمہ کے دوسرے حصہ کی اہمیت ان کے ذہن میں اس کے تمام مضمرات کے ساتھ خصوصیت کے ساتھ موجود رہتی ہے، کیونکہ کلمہ کے پہلے حصہ پر مسلمانوں کے علاوہ بہت سے غیر مسلموں کا بھی اعتقاد و ایمان ہو سکتا ہے، حضرت محمد کے زمانہ سے لیکر اب تک کوئی ایسی مثال نہیں کہ اس کلمہ کو دوسرے حصہ کے منکرین کو کبھی مسلم کہا گیا ہو، یا انھیں اسلامی برادری کا رکن سمجھا گیا ہو، برخلاف اس کے راسخ العقیدہ شارحین اسلام کا موقف ہر دور میں یہی رہا ہے کہ کسی ایسے شخص کو جو علانیہ پورے کلمہ کا اقرار کرتا ہو، غیر مسلم نہیں کہا جاسکتا ہے۔



دیکھا آپ نے، کتنی چابکدستی سے اور کتنے لطیف پیرایے میں پروفیسر کب نے محمدؐ ان ازم کی اصطلاح کو برحق ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، اور حقیقت اس ضمن میں وہ مارگو لیتھ ہی کے پیرو ہیں، اور ان دونوں کی کتابوں کے مضمولات میں بڑی حد تک یکسانیت بھی ہے، اس لئے ان کی اس بات کا کھوکھلا پن صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ مارگو لیتھ کے زمانہ کی علمی فضا اور تھی اور آج کی اور ہے، مسلمان یہ چاہتے ہیں کہ انھیں مسلم کہا جائے، لیکن کہا یہ جاتا ہے کہ محمدؐ ان کتنا بھی سچا اور غلط نہیں، قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ خدا کو ایک اور صرف ایک ماننے والے اور محمدؐ کو رسول اور آپ پر ختم نبوت کا اقرار کرنے والے "مسلم" ہیں، لیکن پروفیسر کب اپنے مسلم اور غیر مسلم قاریوں کو یہ بتاتے ہیں کہ اسلام کے لئے محمدؐ ان ازم اور "مسلم" کے لئے محمدؐ ان کی اصطلاح بھی صحیح ہے، دراصل یہ وہی تعصب اور اسلام کو مسخ کر کے پیش کرنے کا جذبہ ہے جو صدیوں سے عیسائی دنیا پر سلطہ ہے، اور کسی نہ کسی شکل میں ظاہر ہوتا رہتا ہے۔

اپنی اس کتاب کے پہلے ہی صفحہ پر پروفیسر کب یہ کہتے ہیں کہ "اسلام" کا لفظ حضرت محمدؐ نے بعد میں اپنے مذہب کے امتیازی نام کے طور پر اختیار کیا، دراصل ان کا یہ نظریہ ان کی اس بحث کا پیش خیمہ ہے جو انھوں نے کتاب کے تیسرے باب میں جس کا عنوان "قرآن" ہے، اٹھائی ہے، یہ بتاتے ہوئے کہ کس طرح پیغمبر اسلام کے ذہن میں نظریہ توحید کا ارتقار ہوا ہو گا، ان کا کہنا ہے کہ قرآن میں توحید کا جو نظریہ پیش کیا گیا ہے، اس کا تعلق درحقیقت ان "خفقار" کے اعتقاد سے ہے جس کے بارے میں ہمیں کچھ زیادہ معلوم نہیں۔ حضرت محمدؐ نے اس پر فخر کیا اور اسے حضرت ابراہیمؑ سے ایک امتیازی شان کے ساتھ دالہ کر دیا، قرآن کی اس آیت مَا كَانَ اِبْنًا هَيْمًا يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا وَلَكِنْ كَانَ حَنِيفًا مُسْلِمًا کی ابتدائی شکل (قرارت: Reading) میں جو اس سے مختلف تھی، اس بات کا اشارہ ہے جو خود تھا کہ حضرت محمدؐ جس عقیدہ کی تبلیغ کرتے تھے اس کے لئے حنیفیہ کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے تو بعد میں ہوا کہ حنیفیہ کی جگہ اسلام نے لے لی۔

بیان القرآن (طبری) تفسیر کبیر (رازی) در المنثور (سیوطی) روح المعانی (آلوسی) اور فتح البیان (صدیق

حسن قنوجی) میں سے کسی میں بھی آیت مذکورہ کی کسی مختلف قرارت Varient Reading کا سراغ نہیں ملا

اور خود پروفیسر موصوف نے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے، ایسی صورت میں جہاں تک ہم سمجھتے ہیں کسی کمزور روایت کا سہارا لے کر یا خود اپنے طور پر پروفیسر کب نے یہ تیسرا آرائی کی ہے کہ پہلے حضرت محمدؐ نے اپنے عقیدہ توحید کو حنیفیہ

سے تعبیر کیا اور بعد میں اسلام کہا۔

درحقیقت تخیل کا یہ سارا فساد اس لئے ہے کہ پروفیسر گب قرآن کریم کو وحی الہی کے بجائے پیغمبر اسلام کی تصنیف سمجھتے ہیں، چنانچہ محمدؐ ان ازم کے تیسرے باب کا آغاز ہی اس جملہ سے ہوتا ہے۔

The Koran is the record of those formal utterances and discourses which Mohammed and his followers accepted as directly inspired.

جس سے مغرب کی علمی دنیا میں سائنٹفک تاریخی اصول تحقیق کا چرچا ہوا، اُس وقت سے مستشرقین یہ ثابت کرنے میں لگے ہوئے ہیں کہ قرآن کریم کی اساس یہودی و نصرانی روایات ہیں، پروفیسر گب نے بھی مخالف انداز سے یہی بات کہی ہے۔ غرض پچھلے دو تین سو برس کی طویل مدت میں اس سلسلہ میں بڑی بڑی قیاسی ادویاں کی گئی ہیں، اور ان قیاس آرائیوں سے دور رس تاریخی ادبی اور دینیاتی نتائج نکالے گئے ہیں، اور پھر اس مفروضے اور ان نتائج کو اتنی بار دہرایا گیا ہے کہ انہیں حقیقت و واقعیت کا مرتبہ حاصل ہو گیا ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ آج بھی یہ مفروضہ ویسے ہی ایک مفروضہ ہے جیسے دو سال پہلے تھا۔

کیسی عجیب بات ہے کہ ایک طویل عرصہ تک تمام ذہنی و مادی وسائل کے ساتھ تاریخی تنقید و تحقیق کے جدید اصول کو برت کر عیسائی دنیا اس بات کا کوئی قطعی اور فیصلہ کن ثبوت فراہم نہ کر سکی کہ قرآن کریم پیغمبر اسلام کی تالیف ہے، جسے آپؐ نے یہودی و عیسائی روایات سے استفادہ کر کے اور توراہ و انجیل سے بہت کچھ مستعار لے کر مرتب کیا، اس سلسلہ میں ہمارے نزدیک اگر کوئی معاصر اور زندہ شہادت ہے تو وہ خود قرآن کی ہے، جس سے اس طرح کا کوئی امکان خارج از بحث قرار پاتا ہے، تاریخی تنقید و تحقیق کے مستند اور جدید اصول کے مطابق اس بولتی ہوئی معاصر دستاویزی شہادت کو جس کے علاوہ اس مرتبہ کی کوئی اور شہادت موجود نہیں، تمام لایعنی قیاس آرائیوں سے بالاتر اور یقینی سمجھنا چاہئے، لیکن مستشرقین اس زندہ حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں، کیونکہ اس سے ان کے نظریے اور عقیدے کی مکمل طور پر نفی اور تردید ہوتی ہے۔ رسول اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی زندگی کی پوری تفصیلات موجود ہیں، کسی دوسرے نبی یا دنیا کی بڑی سے بڑی شخصیت کے حالات ہمیں اتنی تفصیل سے نہیں معلوم ہیں، لیکن پروفیسر گب اس سلسلہ میں اپنے قارئین کو شبہ میں مبتلا کرنا ضروری سمجھتے ہیں، اس لئے وہ بڑی چابکدستی سے آپؐ کے بچپن سے لے کر بعثت تک کے حالات و واقعات نظر انداز کر دیتے ہیں، بعثت سے

قبل کی آپ کی پاک سات زندگی، بے مثال امانت و دیانت، دانشمندی و بصیرت، اہل مکہ کی اخلاقی پستی پر آپ کی غمگینی و دلسوزی، کمزوروں، مظلوموں، مسافروں اور اجنبیوں کی سیکسی و بے بسی پر آپ کا جذبہ درد مندی اور گرد و پیش کے عمومی حالات پر آپ کی روحانی بے چینی ان سب باتوں میں آپ کی انسانی عظمت کے کوئی آثار نہیں نظر نہیں آتے، اور تاریخی معروضیت کے تمام تر بلند بانگ دعوؤں کے باوجود بالکل مار گولیتھ کے انداز پر پروفیسر گب کو یہ کہنے میں کوئی عار نہیں "پیغمبر اسلام کی شروع کی زندگی اور حالات سے متعلق ہمیں یقین کے ساتھ کچھ معلوم نہیں" اور یہ کہ "ان کی کامیابی کی وجہ یہ تھی کہ وہ مکہ کے رہنے والے تھے"۔<sup>۱</sup> ناطقہ سر برگریاں کہ اسے کیا کہیے۔

اب جب پروفیسر گب جیسے شریف طبیعت اور سنجیدہ عالم کو جن کا شمار صف اول کے مستشرقین میں کیا جاتا ہے اور جن کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ اسلام کا مطالعہ ایک ایسے عیسائی کی حیثیت سے کرتے تھے جسے دونوں مذاہب میں مشترک روحانی اقدار کی تلاش تھی، قرآن پاک کو یہودی عیسائی روایات سے مستعار سمجھنے اور وحی نہ ماننے پر اصرار ہوا پیغمبر اسلام کی سیرت میں انسانی و روحانی عظمت کا کوئی پہلو نظر نہ آتا ہو، تصور وحی، منصب نبوت اور شعور نبوت سے متعلق اسلامی موقف کا کوئی شعور نہ ہو تو بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ دوسری صف کے مستشرقین مثلاً گیلوم روزنیتھال برنارڈ لوئیس B. Lewis گرونے بام Grunebaum مونٹگری واٹ M. Walsh اینڈرسن Anderson جوزف شاخت J. Schacht اور کینتھ کریگ K. Crag وغیرہم نے قرآن پاک اور سیرت اقدس سے متعلق کیا کیا گل افشائیاں کی ہوں گی۔

Guillaume

Rosenthal

1. Morgoliouth, Mohammadanism, London, 1911. p. 51-52

2. Mohammadanism. p. 24. 3. Ibid. p. 25.





اُن سے یورپ میں نشاۃ الثانیہ کا دور شروع ہوا۔

۱۱۰۰ء سے لیکر ۱۲۰۰ء تک صلیبی جنگیں بھی کسی نہ کسی شکل میں جاری رہیں۔ جن کی بدولت مشرق و مغرب میں شدید تصادم بھی ہوا اور پھر امتزاج بھی، مغرب نے مشرق کے اثرات قبول کئے اور اس کے علمی خزانہ سے استفادہ کیا، اور ان تمام اسباب نے مل کر جدید یورپ کی تشکیل کی، جو نشاۃ الثانیہ دور اصلاح اور ایجاد و دریافت سے عبارت ہے،

بحیرہ روم کے مشرق میں بھی کم و بیش یہی صورت تھی، ۱۲۰۰ء سے ۱۵۰۰ء تک اسلام اور عیسائیت میں مسلسل آویزش رہی، مسلمان اپنے دلولہ انگیز مذہب، اپنی فصیح و بلیغ مذہبی زبان اور اپنی ہمہ گیر تہذیب کی بدولت تمام ایشیا اور افریقہ و یورپ پر چھائے گئے تھے عثمانی ترک قسطنطنیہ (۱۴۵۳ء پر آگ، اور وائینا ۱۵۲۹ء تک پہنچ گئے تھے، ۱۵۲۶ء میں ہنگری ان کی ملکیت میں شامل ہو گیا تھا، اور اسی سزہ میں ہندوستان میں بابر نے سلطنت مغلیہ کی بنیاد ڈالی اور ان کی حکومت بڈاپسٹ سے لیکر بنگال تک قائم ہو گئی، اور تجارت کے بیشتر بحری اور بری راستے ان کے قبضہ میں آ گئے، مصر، یورپ اور ایشیا کے درمیان دیوار بنا ہوا تھا، پانچویں صلیبی جنگ اسی کو لینے کے لئے لڑی گئی تھی، لیکن اس میں عیسائیوں کو ناکامی ہوئی، بحیرہ ہند میں جو اب تک عربوں کی جھیل سی معلوم ہوتی تھی ان کا اقتدار تھا، ۱۴۹۸ء میں پرتگالیوں نے ہندوستان کا بحری راستہ معلوم کر کے عربوں کے اس بحری اقتدار اور تجارت کو سخت نقصان پہنچایا اور اسی کا یہ نتیجہ ہوا کہ مصر کی اقتصادی حالت تباہ ہو گئی۔ ترکوں اور مصریوں نے مل کر بحیرہ ہند میں پرتگالیوں کی بحری قوت کا مقابلہ کیا لیکن شکست کھائی (۱۵۳۸ء) ترک بار بار کہتے تھے، کہ اللہ نے زمین تو ہمیں دے دی ہے، لیکن سمندر عیسائیوں کو بخش دیا ہے، اس وقت ترک سلاطین ہندوستان کو مغل بادشاہ اور قلمرو ایران کے صفوی حکمران یہ تینوں بری طاقتیں اس لائق نہیں تھیں کہ یورپ کی بحری قوت کا بچھو یا بجز اوقیانوس میں مقابلہ کر سکتیں، یورپ کو ایک نیا راستہ ہی نہیں، امریکہ کا ایک نیا براعظم بھی مل گیا تھا پرتگال کو مسلمانوں سے جو عداوت رہی اس کو اس زمانہ کے تاریخی حالات کی روشنی میں سمجھا جاسکتا ہے صلیبی جنگوں سے جو کدورت اور دشمنی کا جذبہ پیدا ہوا تھا، وہ جزیرہ نماے میں پندرہویں اور سولہویں صدی کے اندر تیز تر ہو گیا، اس کی ایک توجہ یہ تھی کہ مسلمان اسپین میں طاقتور حکمران کی حیثیت سے موجود تھے، اور

پرتگال کو ان سے ہر وقت ڈر رہتا تھا کہ وہ بھی ضم نہ ہو جائیں، ان سے جنگ، مذہبی ضرورت بھی تھی، اور ملکی مصلحتیں بھی اس لڑائی کی تقاضی تھیں۔

یورپ کے بحری اقتدار سے تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے، رفتہ رفتہ ان کی حاکمیت، ایشیا اور افریقہ کے بڑے حصوں میں قائم ہو گئی، اور سیاسی اور اقتصادی استحصال کے لئے ان کو بڑے بڑے ملک مل گئے، اطالوی اور فرانسیسی، شمالی افریقہ میں حکمراں تھے، جرمن ترکی میں بڑھ رہے تھے، روسی وسط ایشیا کو زیر کر رہے تھے اور ہندوستان، مصر اور عراق میں تاحد نظر، برطانوی اقتدار کا پرچم لہرا رہا تھا، اسی نقطہ سے مسلمانوں کا زوال اور یورپ کا عروج شروع ہوتا ہے۔

یورپ کی یہ توسیع سترائیسویں صدی کے خلاف تھی، ان کی کمزوری ہی پر جو ۱۹۰۰ء سے ۱۹۱۴ء تک اپنی آخری حدوں کو پہنچ گئی تھی، یورپ کی ترقی کا محل تیار ہوا تھا، اس بات کے اعادے میں بھی مضائقہ نہیں کہ یورپ کی ترقی سے پہلے مسلمانوں کی سلطنت، ایشیا اور افریقہ میں پھیلی ہوئی تھی، اور اسی لئے یورپ کی توسیع پسندی اور سامراجیت کا خاص ہدف ایشیا اور افریقہ کے مسلمان ممالک تھے۔

اقوام یورپ نے اپنی حاکمانہ اور اقتصادی گرفت کو نظر ثانیوں سے مضبوط کیا، جس کی تفصیل آگے آئے گی، اس وقت یہ اشارہ کافی ہے کہ مشرق میں قدیم و جدید سائنس اور مذہب اور اسلام اور عیسائیت کی آویزش، خطرناک حد تک بڑھ گئی تھی، اور اس نے پوری پوری آبادیوں کو جڑوں سے اکھاڑ دیا تھا، اس وقت ایشیا کا سیاسی، مادی اور اخلاقی تنزل انتہا کو پہنچ چکا تھا، یہاں اگر کچھ رہ گیا تھا تو صرف اوہام کا تار و پود۔ قوائے عمل شل ہو گئے تھے اور شعاع حیات سرد ہو رہا تھا۔ اور منفی طرز فکر نے ان کو بے عمل بے ذوق، کاہل اور ناکارہ بنا دیا تھا۔ یورپ کا یہ حملہ صرف بگرد برہی پر نہیں تھا، یہ حملہ ان کے عقائد، ان کے فلسفہ، ان کی روایات، ان کی تاریخ، ان کی بلند ترین شخصیتوں پر بھی تھا، ۱۸۵۷ء کے بعد تو بقول ٹوئن بی "مغرب کا تیر مشرق کی روح میں پوری طرح پیوست ہو گیا تھا، اور وہ مرغِ نسیل کی طرح تڑپ رہے تھے، چند غیر معمولی اشخاص کو چھوڑ کر، سب ہی پر یاسِ دالم کے بادل چھا گئے تھے، شاعر جنازہ بردار عالم تقلید پرست اور ذوق و جستجو سے عاری، صوفی، فنکے راستہ میں مستغرق، اساذ تکوینی جوہر سے نا آشنا اور نئی تقاضوں سے یکسر بے خبر۔"



مشرق کے خلاف، یورپ کی جارحیت ہمہ جہت تھی، ان کے حملے صرف فوجوں کے ذریعہ نہیں ہوئے، اس میں ان کے دانشور مستشرقین، اہل فکر، شعراء، علماء اور اساتذہ بھی شامل تھے، اسی لئے اقبال نے مغربی مدرسوں کی کورنگا اور بے ذوقی کی شکایت کی ہے۔

ع نہ زندگی، نہ محبت، نہ معرفت، نہ نگاہ

مغربی اثرات کے چیلنج کا رد عمل، مشرق پر ایک دائرہ کی شکل میں رونما ہوا جس میں رد و قبول، تقلید، ایجاد، تنقیدی فکر اور بہترین اقدار کا انتخاب اور اعتماد کے ساتھ، اپنی صالح مشرقیت پر جے رہنے کا انداز کار فرمایا، لیکن مغرب نے نئے نئے دام بچھائے تھے اور ایک ایسی نسل کو تیار کیا تھا، جو اپنی ذہنیت اور مرغوبیت میں بالکل مغرب زدہ اور مشرق سے بیزار تھی، دراصل اہل کلیسا کا یہ نظام تعلیم اقبال کے الفاظ میں :-

ایک سازش ہے فقط دین و مردت کے خلاف

اقبال نے علامہ سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں صراحت سے لکھا ہے، کہ لندن میں مشرقی و افریقی علوم کا ادارہ صرف برطانوی سامراجیت کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کے لئے قائم کیا گیا ہے، اسی قسم کے خیالات انھوں نے حافظ فضل الرحمن انصاری کے نام ایک خط میں ظاہر کئے ہیں :-

”جہاں تک اسلامی ریسرچ کا تعلق ہے۔ فرانس، جرمنی، انگلستان اور اٹلی کی یونیورسٹیوں کے

اساتذہ کے مقاصد خاص ہیں، جن کو عالمانہ تحقیق اور احقاق حق کے ظاہری طلسم میں چھپایا جاتا ہے“

سادہ لوح، مسلمان طالب علم اس طلسم میں گرفتار ہو کر گمراہ ہو جاتا ہے“

اقبال کو افسوس تھا کہ مغربی کالجوں کے پڑھے ہوئے مسلمان نوجوان، روحانی اعتبار سے فرومایہ ہیں ان کی نظر مسادات شکم سے آگے نہیں جاتی، وہ روح کو معدہ میں تلاش کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ روح کی قوت و حیات کا جسم کو کوئی تعلق نہیں، یہ اور اس کے بہت سے خیالات ان مغربی دانش وروں کے ذریعہ پھیلے، جن کے آگے زانوئے تلمذتہ کو بغیر ترقی ممکن نہیں تھی۔

جب اقوام مغرب نے مشرق کا بحری راستہ معلوم کیا اور مشرق پر اپنی حاکمیت قائم کرنا شروع کی تو اسکی ضرورت بھی محسوس کی کہ ان کی زبانوں کو، ان کے مذاہب کو اور ان کی تہذیب و تمدن کو سمجھیں، اور ان کو اپنے رنگ میں

رنگ میں اس طرح پیش کریں کہ مغرب مقابلۃ اعلیٰ و ارفع نظر آئے اور ان کی صنعت و حرفت اور سامان تجارت بہتر ٹھہرے۔

جن عالموں نے اس اقلیم میں قدم رکھا، وہ مشرق کملائے اور پورا ایک نیا علم اور نیٹلز م کے نام سے وجود میں آگیا، یہ مشرق اور نیٹ (ایٹ نہیں) اصل میں مغرب کا زائیدہ فکر ہے، جہاں تخیل ہی تخیل ہے، رومانس ہی رومانس ہے، اس میں شدید جبلت ہے، عیش و عشرت کی بہتات ہے، بھوک اور بے رحمی ہے، اس کی میزان قدر میں قرآن پاک اہم نہیں ہے، الف لیلہ اہم ہے جو عربی ادبیات میں معمولی درجہ کی کتاب ہے، یہ مشرق مغرب کی مادی تہذیب کا حصہ بن گیا ہے، اس میں عجیب و غریب آدمی رہتے ہیں، نیم وحشی، نیم تمدن، نیم برہمن، خواجہ سگ پرست بھی، نعمان سیاح بھی، زائد بھی، رند بھی، اس مشرق کی دولت بے کراں ہے، اس کی خام پیداوار کے بغیر مغرب کے کارخانے نہیں چل سکتے، یہ مشرق تہذیب کا گہوارہ اور مذاہب کا سرچشمہ ہے، یہ مشرق، مغرب کے مادی مفادات کا مرکز و محور ہے، اس مشرق کو یورپ نے سماجیاتی، فوجی، جنگی اور سیاسی طور پر پیدا کیا ہے اور اس پر اتنی کتابیں لکھی گئی ہیں، کہ ان سے ایک اچھا خاصا کتب خانہ تیار ہو سکتا ہے۔

اس مشرق کا جو کلیۃً مغربی تصورات اور مفادات کی پیداوار ہے، کچھ تھوڑا سا اندازہ دانتے کی مشہور و معروف نظم طربیہ خداوندی سے ہو سکتا ہے، ۱۳۱۴ء اور ۱۳۲۱ء کے درمیان تصنیف ہوئی، اس سے معلوم ہو سکتا ہے کہ عہد وسطیٰ میں اہل یورپ، مشرق کے بالخصوص اسلام کے متعلق کیسے گھناؤنے تصورات رکھتے تھے، اور ان کا بس نہیں چلتا تھا کہ عشق محمد ان کے دل سے نکال دیں اس لئے کہ اسی آئیدیل پر انکی عظمت قائم تھی، اس نظم نے یورپ کے ذہن و ضمیر پر بے انتہا اثر ڈالا ہے، اور اتنے ماہ و سال گزرنے کے بعد تو اس میں تاریخ کی سی تقدیس اور سچائی پیدا ہو گئی ہے، طربیہ خداوندی کے تین حصے ہیں، دوزخ، برزخ اور فردوس، دانتے مشرق و مغرب کی اہم شخصیتوں سے واقف تھا، مثلاً وہ ورجل، ہومر، ابن سینا اور ابن رشد سے واقف ہی، اور مسلمانوں اور یہودیوں کی تاریخ سے بھی نا آشنا نہیں تھا، اُس میں عیسائیوں کی کورنگھی، تنگ دلی، اور عصبیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے، اس کا یہ ایمان ہے کہ مغفرت کے سزاوار صرف کیتھولک عیسائی ہیں، باقی سب دوزخ کا کندہ ہیں، دانتے نے دوزخ Inferno Canto 28 اور نویں طبقہ جہنم یعنی اقلیم عذاب

میں حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی نعوذ باللہ بڑی ہی ہیبت ناک تصویر کھینچی ہے، نقل کفر، کفر نباشد، یہ دکھلایا ہے کہ شکم مبارک چاک ہے اور حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی نعوذ باللہ انتڑیاں باہر نکل رہی ہیں، اور وہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جن کو خود نعوذ باللہ دو حصوں میں چیر دیا گیا ہے۔ فرماتے ہیں دیکھو میری حالت یہ سیاہ ترین بدستوں اور بد کاریوں کا نتیجہ ہے، یہ عیسائیت کو مسخ کرنے، فریب اور ریاکاری اور نفاق کو پھیلانے اور اختلاف کا بیج بونے کی سزا ہے۔ استغفر اللہ۔۔۔۔۔ دانتے کو پاپائیت اور کیتھولک فلسفہ اور عقیدے پر پورا یقین تھا، اور اس کے تخیل کے سارے نقش و نگار، اسی مذہبی تعصب کے پیدا کردہ ہیں، طریقہ خداوندی کی تعمیر و ترکیب میں بھی یہودیوں، عیسائیوں اور مسلمانوں کی روایتوں، تمثیلوں اور یونانی، رومی اور عرب ضمیات کے علاوہ سب سے زیادہ دخل اُس تعصب کو ہے، جو صلیبی جنگوں سے عیسائیوں کے دلوں میں، جاگزیں تھا اور اس میں سب سے بڑی کوشش سازی اُس زہریلے تخیل کی ہے، جو دانتے کی شاعرانہ تخیلات کا حصہ بن گیا تھا، اس کا اتنا گہرا اثر، مغرب پر ہوا کہ انھوں نے طریقہ خداوندی کو ہوائ آسمانی میں شمار کر لیا تھا۔

میرا عرض کرنے کا یہ مقصد ہے کہ دانتے سے لے کر انیسویں صدی کے ڈاکٹر اسپرنگر اور سر ولیم میور اور بیسویں صدی کے مانٹ گری واٹ تک اسلام کا وہ پیش ہی تصور ان کے سامنے رہا ہے، اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں منہوتان میں، جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز افسر آئے وہ بھی یہی تخیل رکھتے تھے، اور وہ عیسائیت کی سب سے بڑی خدمت یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو عیسائی بنالیں۔ ان کی عظمت دیرینہ کو ختم کر دیں اور ان کے دل سے حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت نکال دیں وہ خوب جانتے تھے کہ اس محبت کے بغیر اسلام کی عمارت ڈھ جائے گی، ۱۸۵۶ء سے ۱۸۵۷ء کے درمیان مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان جو مناظرے، پہلے آگرے، اور پھر دہلی میں ہوئے، ان میں بھی یہی تخیل اور یہی تعصب کار فرما ہے۔

۱۸۵۳ء میں عیسائیوں نے دہلی میں قدم جائے اور ۱۸۵۳ء ہی میں حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی ذریعہ فتویٰ دیا کہ مہنگی سے لے کر دہلی تک سارا علاقہ، انگریزوں کے زیر اثر آ گیا ہے، اس لئے ان کے خلاف لڑنا ہمارا دینی فریضہ ہے، لیکن اسی کے ساتھ ہمیں ان کے نئے علوم کو بھی سیکھنا چاہئے، ۱۸۴۲ء اور ۱۸۵۰ء میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی، ڈاکٹر وزیر خاں اور Rev Pfander کے درمیان آگرے میں جو مذہبی بحثیں اور مناظرے ہوئے ان میں بھی عیسائیوں



کی یہی کورنہی، تنگ نظری اور عصبیت جھلکتی ہے جو صلیبی جنگوں اور دانستے کی بدولت اُن کو دراثہ ملی تھی، سرسید کا یہ خیال صحیح ہے کہ اسی کی وجہ سے ۱۸۵۷ء کی تحریک آزادی میں علماء نے قلم چھوڑ کر تلوار اٹھالی تھی۔

۱۸۳۳ء میں جو چارٹر ایکٹ آیا اس نے بھی مسیحی مبلغین کو بالکل بے لگام کر دیا تھا، اور انھوں نے مسلمانوں کی دل شکنی اور دل آزاری میں کوئی کسر اٹھانیں رکھی تھی، اس کی شہادت ڈپٹی نذیر احمد اور سرسید کی تحریروں سے بخوبی مل جاتی ہے۔

اٹھارہویں صدی اور انیسویں صدی میں مشرق کے زوال اور مغربی استحصال کے ساتھ ساتھ اسلام اور اسلامی ممالک کی غلط تعبیر کے لئے ایک نیا ڈسپلن وجود میں آیا جس کو اور نیٹلز م کہا جاتا ہے، میں اس کا کھلے دل سے اعتراف کرنا چاہتا ہوں کہ اس شرہیں خیر بھی شامل تھا، اس سے بالواسطہ تحقیق کی نئی راہیں بھی کھلیں اور سماجی اور سائنسی علوم کی مدد سے ریسرچ، پہلے کے مقابلے میں زیادہ خزینہ دار اور تو نگر بن گئی، لیکن انیسویں صدی کے اواخر تک یہ کوشش جھوٹی سچی روایتوں اور افواہوں افسانہ طرازیوں اور صحیح و موضوع حدیثوں کا مجموعہ تھی، جس کے پیچھے سامراجی مقاصد تھے، ان مقاصد پر خوبصورت پردے پڑے ہوئے تھے اور عام طالب علم، ان پردوں کے نقش و نگار ہی کو حقیقت سمجھ بیٹھے تھے، ڈاکٹر اسپرنگر کی کتابیں بزبان انگریزی

Life of Mohammed from

Original Sources by Dr. Sprenger, Alhd. 1851

Life and Doctrines of Mohammed from Sources hither

to un-used in 3 Volumes by A. Sprenger.

اور بزبان جرمن جو برلن سے ۱۸۶۵ء میں شائع ہوئیں، اس کے ثبوت میں پیش کی جاسکتی ہیں، اسپرنگر کا ماخذ واقعہ یہ ہے، جس کے متعلق تمام دنیا یہ جانتی ہے کہ وہ اندھیری رات میں لکڑیاں چننے والا تھا، اور اس کی غلط روایتوں افسانہ طرازیوں اور جھوٹے قصے کہانیوں، اور بے سند باتوں کی وجہ سے اسے تمام علمائے اسلام نے جھوٹا اور نامعتبر قرار دیا ہے۔

یہی حال سرولیم میور کا ہے جن کے اعتراضات سے سرسید کا پھلنی ہو گیا تھا، اور اسی کا جواب لکھنے کے لئے

وہ انگلستان گئے، اور اس کا جواب انہوں نے خطبات احمدیہ لکھ کر دیا جس کو انہوں نے ۱۸۷۶ء میں اپنے برتن پچ پیچ کر لندن سے شائع کیا، یہاں یہ جملہ معترضہ بھی بے محل نہ ہو گا کہ اس وقت ہندوستان دولت سے خالی ہو گیا تھا، اور یہ اسی کے خزانے تھے، جن کی بدولت انگلستان میں صنعت کو فروغ حاصل ہوا، ملک و مال کے جلنے کے بعد ہندوستان کا اعلیٰ خزانہ بھی خالی ہو گیا تھا، ۱۷۹۹ء، ۱۸۵۶ء اور ۱۸۵۶ء کے بعد یعنی میسور، اودھ اور دہلی کے سقوط کے بعد ہماری کتابیں بھی انگلستان چلی گئی تھیں، اسی لئے سرسید کو ضروری کتابیں دیکھنے کے لئے انگلستان جانا پڑا۔

غنی روزیہ پیر کنعاں راتما سٹاکن کہ نور دیدہ اش روشن کند چشم زلیخا را

سرسید سرولیم میور کی لائف آف محمدؐ کا جواب لکھنا چاہتے تھے، میور نے یہ کتاب پادری فٹ کے حکم پر اودھ کے مشن کو تقویت پہنچانے کے لئے لکھی تھی، یہی وجہ ہے کہ سرولیم میور نے حضور رسالتؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں بڑی بڑی گتائیاں کی ہیں، اور غور سے ان کو بازی کر، فتنہ پرداز، عیش پسند، فریبی اور ریاکار کہا ہے، غرض وہ تمام رکبک اور بے ہودہ الفاظ استعمال کئے ہیں، جو اس سے قبل صلیبی جنگوں اور داستانے کے ذریعہ راج ہو چکے تھے۔

کارلائل اور گبن کے یہاں چند اچھے کلمات بھی مل جاتے ہیں، لیکن ان کی استثنائی حیثیت ہے، اور نہ وہ صحیح معنوں میں مستشرق ہیں، انیسویں اور بیسویں صدی کے اوائل تک حضور رسالتؐ کو اور اسلام کو مسیحی تعصب سے جانچا گیا، اور اسلامی تاریخ کو مسخ کر کے اسکولوں اور کالجوں میں پیش کیا گیا، عیسائیوں نے مسلمانوں کی عظمت دیرینہ اور تہذیبی برتری پر کاری ضرب لگائی، اس لئے بقول اسپرنگر جو قدیم دہلی کالج کا پرنسپل تھا، اسی عظمت کے احساس نے ان کو لکھنؤ اور دہلی کی مدافعت میں جو ۱۸۵۶ء اور ۱۸۵۷ء میں آئی ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا کر دیا تھا کہ وہ موت سے آنکھ ملا سکیں اور بے پناہ اور ناقابلِ تسخیر بن جائیں۔

بیسویں صدی میں سائنس اور بائیو سکا لوجی نے بے حد ترقی کی ہے، آج زمین کی طنائیں کھج گئی ہیں اور ہم اس وقت یہاں بیٹھے بیٹھے دنیا کی خبریں دیکھ اور سن سکتے ہیں، اس صدی کو صحافت اور ٹیلی کمیونی کیشن کی صدی بھی کہا جاتا ہے، لیکن انگلستان اور امریکہ کے بیشتر اخبارات New Statesmen لندن سے لے کر نیویارک کے Times تک یہودیوں کے قبضہ میں ہیں اور انہوں نے اس آویزش و پیکار میں جو صلیبی جنگوں سے شروع ہوئی تھیں، ایک نئی جہت کا اضافہ کیا ہے، اس معاملہ میں ہماری بے نیازی کا یہ عالم ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا ایک بھی انگریزی اخبار، حالانکہ ان کی آبادی ۵۰ ملین

کے قریب بتائی جاتی ہے۔

بیسویں صدی میں عیسائیوں کے ضمیر نے ایک نئی کر دٹ لی ہے، یا یہ پرانے شکاری ایک نیا جال لائے ہیں، یا تیل کی اہمیت کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے بارے میں اپنی رائے کچھ نرم کرنا چاہتے ہیں، بہر حال اسی وجہ سے علم کی خاطر کم اور سیاست

کی وجہ سے زیادہ  
Hood Brooke College نے

Christian Muslim Dialogue شروع کیا ہے، اس سے امید بندھتی ہے کہ تعصب

کے پردے چاک ہوں گے، اور اگرچہ ہے کس کس خرابی سے وٹے بائیں ہمہ مسلمانوں اور عیسائیوں کی باہمی علمی کوشش سے ایک صحیح تصویر ابھرے گی۔

یہاں عالم اسلامی کے سب سے بڑے سیرت نگار اور دیدہ ورمورخ علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر ضروری ہے، جن کی ساری زندگی جہاد علمی میں گزری اور انھوں نے مستشرقین کا جواب اپنی گراں قدر تصانیف کے ذریعہ دیا۔



# مُستشرقین اور اسلام

از

اساتذہ ائوراجندی، قاہرہ، مترجمہ عمیر الصدیق ندوی دیوبادی رفیق دارالمصنفین

قرآن کریم، سیرت رسول اللہ ﷺ اور سنت نبوی سے متعلق مستشرقین کے افکار کا تجزیہ کرنے سے پہلے ایک مختصر جائزہ اس لئے پیش کرنا ضروری ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ اسلام کے بارہ میں وہ کس انداز سے سوچتے ہیں۔

بنیادی طور پر اسلام کے بارہ میں مستشرقین کا موقف ان کے مغربی طرز کے مذہبی فہم و ادراک سے ماخوذ و مستعماً ہے، یہ فہم بیک وقت کوتاہ، محدود اور گنجلک ہے، کیونکہ اس کی بنیاد اسلام کی وہ تشریحیں اور تعبیریں ہیں جن کو یہودی عالموں اور پادریوں نے پیش کیا ہے، اسلام اپنے آپ کو تمام آسمانی مذاہب کا خاتم کما ہے اور ان سابقہ مذہبوں کی تصدیق کرتا ہے، لیکن یہودیوں اور عیسائیوں کی تشریحیں، اسلام سے کسی قسم کا تعلق پسند نہیں کرتیں، اور یہیں سے وہ اسلام کو صحیح طور سے سمجھنے میں رکاوٹیں پیدا کر دیتے ہیں، حالانکہ یہ امر واقعہ ہے کہ گزشتہ الہامی کتابوں میں اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ متعلق خوشخبریاں اور پیشین گوئیاں موجود تھیں، لیکن یہودی اور عیسائی علماء کی کوتاہ نظری اور بے بصیرتی نے اس آئینہ حق کو ہمیشہ گرد آلود ہی دیکھنا پسند کیا، انھوں نے اسلام پر اگر نظر بھی ڈالی تو اس طرح کہ گویا اسلام ان لوگوں کے اعتقادات و خیالات سے مخالف کوئی چیز ہے، یا پھر ان کی مذہبی کتابوں سے ماخوذ مسخ شدہ کوئی مذہب ہے، حتیٰ کہ سارے مذاہب خدا کی جانب سے ہی تھے، اور ان مذہبوں کا سلسلہ ازل سے تکمیل کے مراحل میں تھا، اسلام سے اس سلسلہ کی تکمیل ہوئی، دیکھا جائے تو یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ ان مختلف مذہبوں اور شریعتوں میں عقیدہ سے متعلق خدا کے دین کے تمام اصول تقریباً یکساں ہیں، اور یہ قطعاً حیرت انگیز بات نہیں، لیکن اصولوں میں اس اشتراک کی وجہ سے شبہات پیدا کر دینا، یا موازنہ کرنیکی کوشش بھی کرنا صحیح نہیں، جیسا کہ مستشرقین کرتے ہیں، دوسری الہامی کتابوں میں تحریف و ترمیم کا عمل ایک تاریخی حقیقت ہے، اور یہ حقیقت بھی اپنی جگہ پر ہے، کہ صرف قرآن ہی وہ الہامی کتاب ہے جو آج تک بعینہ نص ربانی کے مطابق اپنی اصلی شکل میں محفوظ و موجود ہے، مستشرقین کے رخ کو سمجھنے کے لئے حسب ذیل چند نکات بھی نہایت اہم ہیں،

۱. مستشرقین نے اسلام کو سمجھنے کے لئے ردِ حاکمیت سے صرف نظر کر کے خالص مادی نقطہ نظر سے بحث کی ہے وہ یہ نہیں تسلیم کرتے کہ وحی، نبوت اور قرآن پاک کا سرچشمہ ذاتِ باری تعالیٰ ہے، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ دوسرے مذہبوں کے بارہ میں بھی ان کا دائرہ نظر محدود ہے، یہاں تک کہ وہ انجیل کو کلامِ الہی نہیں مانتے، بلکہ اس کو کلامِ الرسل ہی کہتے ہیں، اور اس طرح وہ الوہیت اور نبوت کے درجات میں خلط مبعوث کر دیتے ہیں،

۲. اسلام کو جس طرح اچانک اور وسیع پیمانہ پر فروغ ہوا، اور جزیرہ عرب میں وہ جس طرح باسانی برسرِ اقتدا ہوا، مستشرقین اس کا بھی جائزہ لیتے ہیں، لیکن ان کا تجزیہ صرف حقیقت کے برعکس ہی نہیں ہوتا بلکہ وہ اس جوہرِ خاص کی قدر و قیمت کو بھی کم کر کے پیش کرتے ہیں، جس کو اسلام نے انسانیت کے لئے خصوصاً ان قوموں میں پیش کیا، جو عرصہ سے رومیوں کے پنجہ استبداد میں جکڑی ہوئی تھیں، ان مستشرقین کا حاصل مطالعہ یہ ہے کہ عرب ایک ابھرتی ہوئی قوم تھی، ان کی اپنی تہذیب تھی، وہ ترقی کی صلاحیت رکھتی تھی، ایسے میں نبی کریم کا ظور ہوا، اور آپ نے صرف یہ کیا کہ اس ابھرتی ہوئی قوم کی قیادت کی، اور اس طرح عرب شاہراہ ترقی پر گامزن ہو گئے، یہ تجزیہ بنیادی طور پر حقیقت کی تصویر کشی نہیں کرتا، بلکہ اس اسلامی دعوت کی اہمیت کو کم کر دیتا ہے، جو واضح طور پر انسانیت کو تاریکی سے روشنی میں لانے کا سبب بنی اسلام کی تاریخ شاہد ہے کہ عرب کس طرح شروع کے تیرہ برسوں میں، اس دعوت کے ساتھ پیش آئے، اہل مکہ کے سخت عنان اور انتہائی مخالفت کے بعد نبی کریم ایک ایسے دوسرے ماحول و معاشرہ کی تلاش کرنے پر مجبور ہوئے، جو خدا کی دعوت کو قبول کرنے کی زیادہ صلاحیت رکھتا تھا، اپنے یہ مطلوبہ معیار شرب کی بستی میں پایا، اور اس طرح ہجرت کا تاریخی عمل وجود میں آیا، پھر یہ دعویٰ کرنا نری جہالت ہے کہ عرب ایک ترقی پذیر قوم تھی، یہ عرب عروج اور ترقی کی سمتوں اور جہتوں سے بالکل نا آشنا تھے، وہ بتوں کے پجاری، مُردار کھانے والے بچوں کو زندہ درگور کر دینے والے، شراب نوشی کے عادی، قتل و غارتگری اور زنا کے خوگر تھے، تمدنی ترقی کی کوئی رمق ان میں موجود نہ تھی، یہ صرف اسلام تھا جس نے حیرت انگیز ترقی کے ساتھ ان کو خدا کے واحد پریمان لانے اور اپنے رب کے لئے جانی و مالی قربانیاں دینے کے لئے تیار کیا، ان اخلاقی کمالات سے آراستہ ہو کر جب وہ آگے بڑھے، تو غیر قوموں اور غیر ملکوں نے خود اپنے دروازے ان کے لئے وا کر دیئے اور مسرت کے جذبات کے ساتھ ان کا استقبال کر کے ان کی عدل گستری اور رحم دلی پر اعتماد کیا،

۳. مستشرقین نے اسلام سے پہلے کے زمانہ جاہلیت اور عربوں کی بت پرستی کے مطالعہ پر خصوصی توجہ دی اور

کوشش کی کہ ان جھردوں سے عرب اور اسلام کے مختلف گوشوں کا جائزہ لیں، زمانہ جاہلیت کے وحیاناہ افعال و اعمال میں ان مستشرقین کو زیادہ دلکشی نظر آئی، چنانچہ اس دور کو عہد شجاعت قرار دیا، ہیلٹن گب نے دور جہالت میں قوت و ثروت کے بعض مظاہر کو نمایاں کر کے یہی ثابت کرنا چاہا ہے، یہ صحیح ہے کہ اس بدترین معاشرہ میں کہیں کہیں قوت و حمیت اور سخاوت کی ایسی چنگاریاں بھی تھیں، جو دین ابراہیم اور اسمعیل کے خاکستر میں کبھی کبھی چمک اٹھتی تھیں، لیکن ان جزئی و لمحاتی خوبیوں کو ایک پورے عہد کی خوبی قرار دینا صرف مستشرقین کا کارنامہ ہے، جن کا مقصد عربوں کی مدح نہیں بلکہ وہ تحسین ناشناس ہے، جس کے ذریعہ دور جاہلیت کو سر بلند قرار دیا جاتا ہے، اور اسلام کو اس سر بلندی کا محض ایک خوشہ چیں ثابت کیا جاتا ہے، مدینہ میں مسلمانوں اور یہودیوں کے تعلقات میں اسی قسم کے سلسلے قائم کئے گئے، اسلام سے پہلے کے مذاہب اور عرب کی پڑوسی حکومتوں اور غسان و منذر کی سلطنتوں کو بھی ان مستشرقین نے اسی لئے زیادہ اہمیت دی تاکہ کسی طرح یہ ثابت کیا جاسکے کہ انہی سارے پس منظروں میں مسلمانوں کی اپنی راہ کا تعین کیا،

۴۔ واقعات کے استنباط میں مستشرقین کا طرز استدلال واضح طور پر ان کی بدینتی کی غمازی کرتا ہے، مثلاً ہیلٹن گب اپنی کتاب بنیۃ الفکر الدینی فی الاسلام میں لکھتے ہیں، حالات و ماحول کے ماتحت قدیم عربی تہذیب کا احیا ہو رہا تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق اسی ماحول سے تھا، طبعاً آپ پر اس ماحول کے اثرات مرتب ہوئے، آپ نے اس قدیم عربی تہذیب میں چند مذہبی عقائد کا اضافہ کر کے اسے اسلام کی صورت میں پیش کر دیا، گب قدیم عربی تہذیب کے احیا سے توہم پرستی اور جاہلانہ اعتقادات مراد لیتے ہیں، مثلاً جادو، ٹونا، تارہ پرستی، اور کہانت وغیرہ، گب کی اس رائے کو یہاں نقل کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اس سے مستشرقین کے اس رویہ کی وضاحت کی جائے کہ یہ لوگ اول تو چند مفروضات قائم کرتے ہیں، پھر وہ واقعات اور قرآن سے ان مفروضات کو قطعی اور یقینی بنانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کوشش میں وہ واقعات کو گھڑنے میں یا ان میں کتر بیونت کرنے میں یا تحریف و تغیر میں ذرا بھی نہیں ہچکچاتے ہیں، گب نے مندرجہ بالا رائے کی تائید میں حجۃ اللہ البالغہ سے شاہ ولی اللہ دہلوی کا ایک قول نقل کیا ہے، حالانکہ چند ہی سطروں کے بعد ان کی رائے کی نفی میں شاہ صاحب کا قول موجود ہے، گب صاحب ایسے ہی مفروضات قائم کر کے یہ فیصلہ دیتے ہیں کہ حضرت محمد نبی نہیں تھے، عربوں کے وہ رسم و رواج جن کو عہد ابراہیمی کا ورثہ سمجھا جاتا تھا، دراصل ان عربوں کے اپنے قائم کئے ہوئے تھے، حضرت ابراہیم سے ان رسموں اور رواجوں کا تعلق نہیں تھا، خود کعبہ کو تقدس



میں دلعے ابراہیمی کا کوئی اثر نہیں تھا، کعبہ کی حرمت، عرب ماحول کی ایک رسمی سی چیز تھی، گب یہ بھی کہتے ہیں کہ جنات محض ایک ہی مخلوق ہیں، اور ان کے بارے میں قرآن میں جو کچھ کہا گیا ہے، یاد دوسرے واقعات میں ان کا جو ذکر آتا ہے وہ بھی نرا دہم ہے، گب ان تمام مفروضات کو ثابت کرنے میں جملوں کے ہیر پھیر اور عبارت کو معمہ بنانے میں سارا زور صرف کرتے ہیں،

۵۔ مستشرقین جب واضح اور اہم حقیقتوں کا معروضی مطالعہ کرتے ہیں، اُس وقت بھی وہ عصبیت بلکہ اپنے نفس کے اسیر و مرید نظر آتے ہیں، مثلاً تاریخ کے صفحات شاید ہیں کہ مسلمان کثرت سے جنگوں میں فتح یاب ہوئے، اور ان معرکوں میں ان کی افرادی و عدوی قوت ان کے دشمنوں کے مقابلہ میں کمزور و کمتری رہی، لیکن تعداد میں کم ہونے کے باوجود وہ فہمند اور غالب رہے، لیکن جنرل گلوب اپنی کتاب الفتوحات العربیۃ الکبریٰ میں ایسا پیرایہ بیان اختیار کرتے ہیں، جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان فن حرب سے نا آشنا یا اس فن میں پس ماندہ تھے، حالانکہ فوجی صلاحیتوں اور جنگ کے حربوں میں مسلمانوں کی برتری ایک مسلمہ حقیقت ہے، انصاف پسند مورخوں نے مسلمانوں کی ترقی یافتہ صلاحیت جنگ، موقع و محل کے انتخاب اور نیکینگی اعتبار سے اُن کی قائدانہ مہارت کی برتری کا اعتراف کیا ہے، اسلام کے آغاز میں جو جنگیں ہوئیں، اور جو اسلامی فتوحات حاصل ہوئیں، وہ تو اپنے امتیاز کی وجہ سے صدیوں اپنی مثال آپ رہیں، (علم الحرب منیر شفیق)

عصر اول میں مسلمانوں نے جنگ کے میدانوں میں ساری بلندیوں سے برتر بلندی پر اپنا علم نصب کیا، اور نپولین کے دور تک کوئی بھی اس چوٹی کو سر نہ کر سکا، اس کے علاوہ اسلامی جہاد کا مقصد صرف جنگ ہی تو نہیں ہے، بلکہ اس کے جلو میں خدا پر ایمان اس کی راہ میں جان کی قربانی اور وہ جذبہ رحمت بھی جلوہ گر رہتا ہے، جو شوق شہادت کا سامان فراہم کرتا ہے۔

۶۔ اسلام میں دنیا و آخرت کا جو تصویر پیش کیا گیا، ان مستشرقین نے اس کا بھی جائزہ لیا، اور نتیجہ یہ پیش کیا کہ اسلام کا تصویر حیات، دنیا سے روگردانی کی تعلیم دیتا ہے، ایک مستشرق فون در بنادم کا خیال ہے کہ اسلام مسلمانوں کو دنیا اور دنیا کے مظاہر سے کنارہ کش رہنے کی تعلیم دیتا ہے، وہ مسلمانوں کو صرف آخرت اور اس کی ابدی نعمتوں کی تحصیل کی ترغیب دیتا ہے، زندگی کے بارہ میں اسلام کے اس نقطہ نظر سے یہ ثابت ہوتا ہے، کہ علم، ادب، سیاست اور اقتصادیات وغیرہ ذاتی علوم ہیں، جو ہر حیات تو صرف نماز، روزہ جیسی عبادتیں ہیں، گویا موجودہ زمانہ میں مسلمانوں کی پس ماندگی و دراندگی

کی وجہ اُن کی رہبانیت ہے، اس غلط طرز فکر کا جواب ایک عرب اہل قلم ڈاکٹر ابراہیم محمد زرقانہ نے یہ کہہ کر دیا کہ مسلمانوں کی موجودہ خستہ حالی کی یہ تعبیر اسلام کی روح کے ساتھ میل نہیں کھاتی، اسلام عبادت کو عمل پر غالب نہیں کرتا، بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ عمل ہی عبادت پر حاوی ہے، یہ تو سب پر روشن ہے کہ مسلمان صدیوں تک علم کے علمبردار رہے، یورپ کی موجودہ نشاۃ ثانیہ اور اس کے علمی عروج کے اسباب انہی مسلمانوں ہی کے تو ہوا کر وہ تھے، مسلمانوں نے یہ مہیا نہ کیے ہوتے تو شاید یورپ ابھی موجود ہی رہتا، مسلمانوں کی خستہ حالی کی وجہ اسلام کا تصور حیات نہیں ہے، یورپ نے مسلمانوں پر سیاسی بالادستی حاصل کی تو ان کی سامراجیت نے عالم اسلام کو منظم طریقہ سے علمی معاشی اور فوجی لحاظ سے مفلوج بنا کر رکھ دیا تاکہ پھر یہ مسلمان ان میدانوں میں پیش قدمی نہ کر سکیں، مسلمانوں کی موجودہ پس ماندگی اُن کے دشمنوں کی وجہ سے ہے، اس میں اُن کو تہذیب کی تعلیمات کی مطلق کارفرمائی نہیں ہے، اور عجب کیا کہ مستقبل قریب میں مسلمان پھر یہ ثابت کر دکھائیں کہ ان کا دین کبھی پسماندگی کی تعلیم نہیں دیتا، بلکہ یہ تو اسلام ہے، جو ہر ترقی کا ہمیشہ محرک اور سبب بنتا رہتا ہے، اسلام نے دین و دنیا میں ہمیشہ ایک مضبوط ربط قائم کر رکھا ہے، تہذیب کی صحیح روح کو سمجھنے کا فطری ثمرہ علم و عمل، سیاست و معاشیات میں ترقی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے، دین و دنیا میں اگر صحیح مطابقت قائم نہ ہو سکی تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ عیب خود مسلمانوں میں ہے، یا دنیاوی پس ماندگی مسلمانوں کی تہذیب کا ایک لازمہ ہے، مسلمانوں کی پس ماندگی کے اسباب تاریخی ہیں، اُن کے ازالہ کے ساتھ یہ پسماندگی خود بخود ختم ہو جائے گی، پھر مسلمانوں کو بھی اس بات کا احساس ہے کہ وہ پس ماندہ ہیں، اگر یہ پس ماندگی ان کی تہذیب کا جزو ہوتی، تو پھر یہ احساس ہی کیوں پیدا ہوتا، آج مسلمان اپنی زبوں حالی کا تجزیہ کر رہے ہیں، اور تقریباً سارے مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اُن کی خستگی کا سبب یہ ہے کہ وہ اسلام سے روگرداں ہو گئے، اور اس روگردانی میں سامراج کا بڑا ہاتھ ہے، مغربی مادیات اور نظریات سے ان کو ایک عرصہ تک مسحور کئے رکھا، مغربی اہل قلم نے سارا زور اس پر صرف کیا کہ وہ مسلمانوں کو اپنی تہذیب سے بیگانہ کر کے دوسری شاخائے نازک پر آٹیانہ بنانے کی ترغیب دیں،

۔۔ مستشرقین نے اپنی خواہشات اور جذباتِ تعصب کی بنا پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ اسلام کا کوئی مستقبل

ہی نہیں، مارگو لیتھ نے ۱۹۰۳ء میں اپنے اسی نتیجہ فکر سے دنیا کو باخبر کیا، لانس نے ۱۹۳۳ء میں یہی نعرہ بلند کیا، اور دوسرے مستشرقین اسی قسم کی گفتگو کرتے رہے، مگر حالات و اوقات اور اسلام کی روز افزوں اشاعت، زبان حال سے ان کا احوال کی تردید کرتی رہی، پاکستان اور انڈونیشیا کی صورتوں میں نئی اسلامی ملکیتیں وجود میں آئیں، خلافت ختم ہوئی، لیکن اسلام

زندہ رہا، حالانکہ یہ مشرقیین کہا کرتے تھے کہ خلافتِ عثمانیہ کے سقوط کے بعد اسلام کا بھی سقوط ہو جائے گا، نئے تمدن کے ساتھ جب اسلام دوچار ہوگا، تو لامحالہ پاش پاش ہو جائے گا، لیکن مغربی تہذیب کا سامنا اسلام نے کیا، اور بجائے مرعوب و مغلوب ہونے کے اس نے جرات کے ساتھ مغربی تہذیب کے ناسوروں کی نشاندہی کی، اس کے طوفان کا مقابلہ پامردی سے کیا، اور اس کے غلبہ سے خود کو آزاد رکھا، اور فکرِ اسلامی از سر نو اپنے ادلین سرچشموں سے سرسبز اور شاداب ہو رہی مشرقیین کا خیال تھا کہ مغرب کی مسیحی مشنریاں، اسلام کا خاتمہ کر دیں گی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اپنی ساری قوت، ثروت اور وسائل کے باوجود یہ مشنریاں مسلمانوں کو اپنے مذہب سے برگشتہ نہ کر سکیں، ان ملکوں میں جہاں اسلام کا سیاسی اثر و نفوذ نہیں ہے، اور جہاں مسیحی مشنریاں لاکھوں کی رقم خرچ کر کے فلاحی ادارے قائم کر رہی ہیں، وہاں اسلام اپنی فطری سادگی آسانی اور نرمی کی وجہ سے لوگوں کو اپنی جانب متوجہ کرنے میں کامیاب ہو رہا ہے۔

گپ کوغہ تھا کہ مغرب زدگی سے اس وقت سارا عالم اسلام متاثر ہے، لیکن اب مغربیت کا یہ طلسم ٹوٹ رہا ہے، مسلمانوں کو اپنی متاعِ گمشدہ کا احساس ہو چلا ہے، وہ اپنے ادلین سرچشموں کے آپ نشاط انگیز کی افادیت سے باخبر ہو رہے ہیں، وہ اپنی زندگی میں شریعت کے نظام کو پھر سے جاری و ساری رکھنا چاہتے ہیں، اقتصادیات، سیاسیات، سماجیات کو میدانوں میں اسلام کا جوہر کھل رہا ہے، گو خود شناسی کا یہ جوہر بعد از خرابی بسیار آشکارا ہوا ہے۔

مارگو لیتھ جب اسلام کے بارہ میں گفتگو کرتے، تو وہ ایک سیاسی مورخ برائیں کا یہ قول بار بار دہرتے، کہ اسلام کی زندگی اب صرف دو صدی اور ہے، اور مسلمانوں کی انتہائی تعداد دو کروڑ سے زیادہ نہ ہو سکے گی، لیکن آج مستند اعداد و شمار کے مطابق مسلمانوں کی تعداد ایک ارب تک پہنچ چکی ہے، اور اسلام کی وسعت اور فروغ کا عالم یہ ہے کہ وہ استعمار کے گھر اور اس کی توپوں کے پیچھے یورپ تک جا پہنچا ہے، امریکہ میں وہ ایک مانوس حقیقت ہے، اور پانچویں براعظمتوں میں کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں کسی نہ کسی مینارہ سے اللہ اکبر کی صدائیں نہ بلند ہوتی ہوں، انہی یہودی مارگو لیتھ نے بعد میں کہا کہ یہ کہنا کہ اسلام جلد ہی ختم ہو جائے گا، غور طلب مسئلہ ہے، اسلام روئے زمین پر ایک زندہ حقیقت ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے، کہ انسانیت روز بروز سائنس کی مدد سے اپنے رب کو پہچان رہی ہے، اور سارے دہوں اور غلط تعبیروں کو ختم کرتی جاتی ہے، اور یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلام بڑی سیاسی اور فوجی حکومتوں کے اثر و نفوذ سے آزاد ہوتا جا رہا ہے، اور ان حکومتوں کے اقتصادی اور ثقافتی اثرات سے نبرد آزما ہے،



مستشرق لائسنس کا خیال تھا کہ خلافتِ اسلامیہ کے سقوط کے اثرات یقینی طور پر اسلام کے مستقبل پر پڑیں گے، لیکن حالات نے دوسرا ہی رخ دکھایا، مسلمانوں نے سقوطِ خلافت کے بعد وحدت کی بنیادیں پھر سے استوار کیں، مسلمانوں کے مسائل کو متفقہ طور پر حل کرنے کے لئے اجتماعات اور مشاورتی جلسے منعقد ہوتے رہے، شیعہ، سنی، ہم آہنگی نے ان مفروضوں کو غلط ٹھہرایا، جو یہ دعویٰ کرتے تھے کہ وطنی تحریکیں، محدود قومیتیں اور نسلی تفریقیں مسلمانوں کی فکری وحدت کا خاتمہ کر دیں گی، اور ان کے عقائد اور ان کی ثقافت کو قطعاً پارہ بنادیں گی، اس عرصہ میں عرب قوم پرستی، فرعونیت، تہذیب کا انحیار اور فینیقیت جیسے وقتی رجحانات ابھرے، مزور، لیکن مسلمانوں کا اسلام پر اعتقاد ایسا رازدارانہ رہا کہ یہ رجحانات زیادہ محسوس نہ ہو سکے،

موجودہ دور میں مسلمانوں کی آبادی میں بس قدر اضافہ ہو رہا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ عددی تقویٰ مستقبل میں مسلمانوں کی ذات میں بہت موثر ثابت ہوگا،

اسی طرزِ مغربی ادراک اور ذہنی اثرات سے چھٹکارا پانے کی کوشش کے ساتھ اب قرآن کی تعلیم از سر نو عام ہو رہی ہے اور مسلمان بجا طور پر یہ یقین کرنے لگے ہیں، کہ عالمِ اسلام کی ترقی اور کامرانی صرف ایسی شریعت کے زیر سایہ ممکن ہے جس میں علم، دین، روح، مادہ دنیا اور آخرت کی جامعیت ہو،

مستشرقین کی نسبت سے اسلام کے بارے میں یہ ایک عمومی جائزہ تھا، اب ہم پہلے قرآن کریم اور مستشرقین سے متعلق علحدہ گفتگو کریں گے،

مستشرقین اور قرآن کریم | اسلام کے بارے میں مستشرقین کا رویہ خصومت اور انکار کا ہے، اور یہی سلوک ان مستشرقین کا قرآن کریم سے ہے، اور جو ان مستشرقین کی فطرت کا عین غماز ہے، کیونکہ قرآن کریم، موجودہ توریت و انجیل کے متعلق مانا کرتا ہے کہ یہ دونوں تحریف شدہ کتابیں ہیں اور یہ وہ نہیں ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے آسمان سے اتارا تھا، قرآن نے موجودہ توریت و انجیل کی پیش کردہ خرافات کی صحیح نقاب کشائی کی، عقیدہ توحید سے متعلق قرآن نے صراحت سے کہا کہ توحید ہی دینِ حق کی روح ہے، عقیدہ تعددِ الہ اور عقیدہ تثلیث اس روح کے منافی عقائد ہیں، حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں قرآن نے کہا کہ وہ خدا کے پیغمبر تھے، خدا نہ تھے، عیسائیوں کے عقیدہ کے برخلاف ان کو نہ قتل کیا گیا، نہ سولی دی گئی، بلکہ انہیں آسمان پر اٹھایا گیا، قرآن نے اس مضحکہ خیز عقیدہ کی بھی تردید کی کہ حضرت عیسیٰؑ نے مصلوب ہو کر ساری قوم کے لئے

نجات کا سامان فراہم کر دیا، قرآن نے اس تصور کو بھی باطل قرار دیا کہ کوئی خاص قوم خدا کی محبوب قوم ہے، ان کے علاوہ دوسرے کسی متنازعہ مسائل میں جن کے متعلق قرآن نے قطعیت سے اپنی رائے کا اظہار کیا، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ، حضرت داؤد اور حضرت لوط علیہم السلام جیسے انبیائے معصومین سے متعلق تو ریت و انجیل میں بہت سی روایتیں ایسی داخل کر دی گئی تھیں، جن سے ان انبیائے معصومین کا مرتبہ نبوت فروتر نظر آتا تھا، قرآن نے ان روایتوں کو باطل ٹھہرایا، قرآن کریم کی اس صدق بیانی کو مستشرقین کیسے گوارا کر سکتے ہیں، چنانچہ ان مستشرقین کی کتابوں میں اس خیال پر عام اتفاق ہے کہ قرآن کا سرچشمہ وحی الہی نہیں، بلکہ وہ حضرت محمد کا اپنا کارنامہ ہے، مستشرقین کے دوسرے دعوؤں کی طرح یہ دعویٰ بھی بے دلیل اور بے سند ہے، اس دعویٰ کی تہ میں یا تو قرآن دشمنی کا جذبہ کار فرما ہے، یا پھر وہ وحی کی فہم سے نا آشنا ہیں، یا ان کے پیمانے ایسے لوگوں کے قائم کردہ ہیں، جو صرف مادی نظریہ پر یقین رکھتے ہیں، ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انجیل کے بارہ میں ان کا اعتقاد ہے کہ وہ کلام الہی نہیں، بلکہ نتیجہ فکر پیمیر ہے، اسی لئے وہ قرآن کو بھی اسی حیثیت سے جانچتے ہیں، قرآن کا کلام الہی ہونا ان مستشرقین کی سمجھ میں نہیں آتا، وہ بار بار اس سے متعلق اپنی شکوک و شبہات کی تکرار کرتے رہتے ہیں، اس شک کا اظہار اس کثرت سے ہوا کہ طہ حسین اور زکی مبارک وغیرہ جیسے عربی انشا پرداز اور دانشور بھی اس سے کسی حد تک متاثر ہو گئے،

قرآن کریم کے مضامین اور خاص طور سے قرآنی قصوں کے بارہ میں ان مستشرقین کی رائے یہ ہے کہ نبی کریمؐ کو یہ عیسائی اور یہودی علماء سے ربط ضبط رکھتے تھے، ان سے یہ قصے سن کر آپ نے ان کو قرآن میں پیش کر دیا، لیکن مستشرقین کے اس شبہہ کا ازالہ اسی وقت ہو جاتا ہے، جب تو ریت و انجیل کے روایت کردہ افسانوں اور قرآن کے پیش کردہ قصوں کا موازنہ کیا جاتا ہے، قرآنی اسلوب، بلاغت و حکمت کے اعلیٰ معیار اور وسیع و دقیق معلومات کی بدولت یہ بات خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے کہ کلام ربانی اور کلام انسانی میں کس قدر فرق ہے، صدق مقالی، عیرت خیزی سادگی و پرکاری، حکمت و دانائی، افسانوی تفصیلات سے دوری، اور ایک مرتب ہم آہنگی قرآنی امتیازات ہیں، اور یہ وہ اسلوب ہے جس کے ذریعہ عالم انسانیت، سلامت فکر کے نئے دور اور ایک زندہ و پائیدہ پیغام کے بعد میں داخل ہوا، لیکن اس کے ادراک کے لئے نگاہ بصیرت کی ضرورت ہے، مستشرقین کا اعتراض کوئی نئی بات نہیں، ہر دور میں اسلام کے دشمنوں کی زبان سے ایسے ہی کلمات سرزد ہوئے، نبی کریمؐ کے دور میں مشرکین مکہ کا الزام ہی تھا

کہ آپ نے یہ حکایتیں، مکہ میں مقیم ایک غیر عرب زبان دان سے سُن کر بیان کی ہیں،

مستشرقین میں گولڈ زیمر اور ام بلیشر نے انہی اندیشوں کا اظہار کیا کہ نبی کریم نے شام کے سفر میں عذرا عتیق کی روایتیں سُنیں، اور پھر ان کو قرآن میں دہرا دیا، گولڈ زیمر اور نواد کی نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ نبی کریم کی وفات کے بعد قرآن میں تحریف کی گئی، وہ مثال دیتے ہیں کہ آپ کا نام فتم یا فتامہ تھا، لیکن جب آیت وعبشراً بوسول یاتی من بعد اسمہ احمد (اور فتم شجر) دینے والے ایک ایسے پیغمبر کی جوانی کے بعد آئے گا اس کا نام احمد ہوگا اتری تو آیت کو منطبق کرنے کے لئے آپ کا نام بدل دیا گیا اور بجائے فتم کے محمد نام رکھا گیا، اس تحقیق انہی کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ آپ کے بہت سے صحابی نام ہیں، آپ کے دادا عبدالمطلب نے محمد نام رکھنے سے پہلے فتم نام تجویز کیا تھا، اس روایت کو ان مستشرقین نے کہیں سے کہیں پہنچا دیا،

حالت وحی میں نبی کریم کے چہرہ مبارک سے گراں باری اور شدت کی کیفیت کا اظہار ہوتا تھا، مستشرقین نے اپنی تحقیق کے ذریعہ اس کیفیت کو نعوذ باللہ صرع کے دورے سے تعبیر کیا، وہ کہتے ہیں کہ نبی کریم اپنا موش کھوس بیٹھے تھے پیدہ جاری ہو جاتا، تشخی کیفیت طاری ہوتی، منہ سے جھاگ نکلنے لگتا، اور جب آپ کو آفاقہ ہوتا، تو آپ فرماتے، کہ مجھ پر وحی آئی تھی، اور پھر آپ اپنے اصحاب کے سامنے آیات قرآنی تلاوت کرتے، رسول اللہ کی بشری حالت میں حضرت جبریل کے ملکوتی وجود سے ہم مدی وہم رازی، اور اظہار وحی ایسے اہم مسائل میں سے ہیں، جن کے بارہ میں علماء و محققین نے داد تحقیق دی اور جس کے صحیح ادراک سے مادی علم و فہم عاجز و قاصر ہیں، لیکن مستشرقین کی تحریروں میں تعصب، عیب جوئی اور الزام تراشی کی کار فرمائی کے بعد یہ تحقیق ننگ تحقیق بن جاتی ہے، جس پر ناطقہ سر بگریباں ہونے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتا، قرآن کی بعض سورتوں کا آغاز حروف مقطعات سے ہوتا ہے، مستشرقین نے یہاں بھی داد تحقیق دی ہے، نولدکی اس نتیجہ پر پہنچے کہ حضرت زید بن ثابتؓ، کاتب وحی نے قرآن کے متعدد نسخوں کو ایک مصحف میں جمع کرنا چاہا، اس سلسلہ میں قرآن کے متعدد نسخوں کے مالکوں سے انھوں نے مدد لی، چنانچہ یہ حروف مقطعات، ان مالکوں کے مخفف نام ہیں، یہ تحقیق بعید از قیاس بلکہ مضحک ہے،

ایک مستشرق ابدورڈ جونسر کا خیال ہے کہ یہ حروف مقطعات سورتوں کے قدیم ناموں کا اختصار ہیں، یہ خیال یوں خام نظر آتا ہے، کہ اگر یہ حروف سورتوں کے نام ہوتے تو ان کو بسم اللہ سے پہلے لکھا جاتا، نہ کہ بعد میں، اور اگر ایسا ہوتا



توقدیم مفسرین کو اس کا علم ضرور ہوتا، اور وہ اس کی جانب اشارہ کرتے، اصل بات یہاں بھی وہی ہے کہ مقصد<sup>۱۰</sup>، موٹنگانی نہیں ہے، صرف ثابت یہ کرنا ہے کہ یہ حروف مقطعات، وحی کے کلمات نہیں ہیں، بلکہ ان کو نبی کریم کے بعد قرآن میں داخل کیا گیا ہے، حالانکہ یہ حروف نبی کریم کی زبان مبارک سے ادا ہوئے، اور آپ نے ان کو اصل قرآن ہی میں شمار کیا۔

مشرق لوٹیں جا رہے اور پادری قنواٹی نے اپنی کتاب فلسفۃ الفکر الدینی بین المسیحیۃ والاسلام میں یہ دعویٰ کیا کہ قرآن کی ترتیب اور سورتوں اور آیتوں کی تقسیم حضرت عثمان کے دور خلافت میں ہوئی، حالانکہ تاریخی حقیقت یہ ہے کہ قرآن کی سورتوں اور آیتوں کی ترتیب نبی کریم کے عہد ہی میں مکمل ہو چکی تھی، حضرت عثمان کے دور خلافت تک مختلف لوگوں کے پاس نامکمل مصاحف موجود تھے، حضرت عثمان کے دور میں صرف یہ ہوا کہ ان نامکمل مصحفوں کے بجائے قرآن کو مصحف کامل کا رواج عام ہوا،

بعض مستشرقین نے قرآن کریم کی موجودہ اور اصل ترتیب سے ہٹ کر اپنے طور پر ایک نئی ترتیب قائم کرنے کی کوشش کی، ان مستشرقین میں ولیم موبیر، ویل، روڈ ویل وغیرہ کے نام آتے ہیں، لیکن ظاہر کہ یہ سعی لاجواب تھی، چنانچہ کچھ حاصل نہ ہوا، بعض مستشرقین نے چند ضعیف بلکہ موضوع حدیثوں کی بنیاد پر قرآن کی زبان میں شکوک و شبہات کا اظہار کیا کہ بعض صحابہ کرام کو قرآن کریم کے بعض جملوں کی ساخت و ترکیب سے اتفاق نہیں تھا، لیکن مستشرقین کی اس کوشش کو طفلانہ کوشش کے سوا کچھ نہیں سمجھا گیا۔

۳۔ مستشرقین نے زبان و بیان کی غلطیاں دکھانے کے بعد معنوی اعتبار سے بھی قرآن کا مرتبہ کم ثابت کرنے کی کوشش کی، ان کا خیال ہے کہ قرآن کوئی مکمل نظام نہیں ہے، اصلاح معاشرہ کی ایک وقتی کوشش ہے، نبی کریم نے اپنی قوم کے طبقاتی نظام کی خرابیوں کو دیکھا تو اس کی جانب اس قرآن میں توجہ دلائی، اسی لئے آپ نے روز قیامت کے خوف کو نمایاں کیا، کم تو لے اور ناپنے والوں سے متعلق، اور یتیم پر ظلم ڈھانے سے متعلق اور مسائل کو دھتکارنے اور ڈانٹنے کو بارہ میں آیتیں پیش کیں، گویا قرآن بجائے ایک ضابطہ حیات کے صرف وقتی مسائل کے حل کرنے کی حد تک محدود تھا، حالانکہ ہر غیر متعصب اور انصاف پسند انسان قرآن کے مطالعہ کے بعد اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیگا کہ قرآن کی صورت میں خدائے تعالیٰ نے ایک مکمل و جامع، ضابطہ حیات پیش کر دیا ہے، جو ہر زمان اور ہر مکان کے لئے

سامان ہدایت ہے، خواہ حالات اور واقعات کتنے رنگ بدلیں، قرآن کی تعلیمات کی جامعیت ہمیشہ موثر رہے گی قرآن کی یہ جامعیت خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ کوئی انسانی کارنامہ نہیں ہے، بلکہ اس کا سرچشمہ ذات باری ہے۔ مستشرقین کا دعویٰ ہے کہ نبی کریمؐ میودی اور نصرانی عالموں کی تعلیمات سے متاثر ہوئے تھے، (حالانکہ نبی کریمؐ کا اتنی ہونا ہی اس دعویٰ کی تردید کرتا ہے) لیکن قرآن کے نظام حیات، معرفت کائنات، قوانین فطرت، تہذیبوں اور قوموں کے عروج و زوال کے اسباب جیسے قرآنی مضامین کی ایک جھلک بھی توریت و انجیل میں نہیں پائی جاتی، حد تو یہ ہے کہ اولین مسئلہ یعنی مسئلہ توحید ہی میں ان کے درمیان شدید اختلاف ہے، لیکن مستشرقین پھر بھی یہی دہرائے جاتے ہیں، کہ نبی کریمؐ کی تعلیمات کے اصل ماخذ یہودی اور عیسائی علماء تھے،

۵۔ قرآن پر ایک اعتراض یہ ہے کہ وہ اپنے اسلوب میں سجع اور قوافی کا پابند ہے، لونی ماسین یوں ایسے ہی مستشرقین کی نمایندگی کرتے ہیں، حالانکہ واقعہ صرف یہ ہے کہ قرآن کے متعدد اسالیب ہیں، ان میں سے ایک سجع کا اسلوب بھی ہے، مگر یہ عام سجع سے منفرد اور انتہائی اثر آفریں ہے، اور کامیوں کے سجع سے بالکل جدا ہے اور کہیں برتر ہے، اسی لئے ایک اہل زبان نے کہا تھا کہ بخدا یہ قرآن نہ تو شعر ہے، نہ سحر ہے، اور نہ ہی عمل کمانت ہے، یہ تو کچھ اور ہی شے ہے،

مغربی زبانوں میں قرآن کریم کے ترجمے کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی، تاریخ اس سوال کا دلچسپ جواب پیش کرتی ہے، صلیبی جنگوں کے خاتمہ کے بعد جب عیسائی فوجی اپنے اپنے وطن میں واپس آئے تو اپنے ساتھ مسلمانوں کے حسن سلوک اسلام کی تہذیب اور اس کی خوبیوں کی داستانیں بھی ساتھ لائے، چنانچہ یورپ میں اسلام کے خلاف نفرت اور دشمنی کے بجائے قربت اور دوستی کا سازگار ماحول بنا شروع ہو گیا، اس نئی رائے عامہ سے اربابِ اقتدار کا پریشان ہونا فطری امر تھا، چنانچہ لوئس نہم کی تجویز یہ ہوئی کہ قرآن کریم اور اس کی تشریح اس انداز سے کی جائے جو صاحب قرآن کی تکذیب اور خود قرآن کی سلامتی و عظمت میں شکوک پیدا کر دے، ایک محقق کے قول کے مطابق صلیبی جنگوں کے بعد اربابِ کلیسا نے یہ تلخ حقیقت محسوس کی کہ ان جنگوں کے بعد نہ تو عیسائیوں کو ارض مقدس پر کامل فتح نصیب ہوئی، اور نہ مسلمانوں نے مسیحیت کو گلے لگایا، بلکہ اس کے برعکس یہ ہوا کہ اسلامی تہذیب اور طرز معاشرت نے صلیبیوں پر قابلِ لحاظ اثر چھوڑا اور اسی وقت سے یہ منصوبے بنا شروع ہو گئے، کہ اسلام کا

مقابلہ میدان جنگ کے بجائے فکر و نظر کے میدان میں کیا جائے جو زیادہ بامقصد اور کارآمد ثابت ہوگا، اس سلسلہ میں اولین نام ایک صاحب طبری (۱۱۶۵ھ) کا آتا ہے، ان کو اسپین بھیجا گیا، انھوں نے وہاں مسلمانوں اور عیسائیوں کی باہمی آویزش اور مناظروں کا بنور جائزہ لیا، اور اسپین کے ان عیسائیوں کے طریق کار سے بھی واقف ہوئے، جن کا خیال تھا کہ اسلام کا مقابلہ صرف عقلی اور منطقی دلائل سے ہی کیا جاسکتا ہے، عیسائیوں کی ان کوششوں کا ثمرہ اس وقت حاصل ہوا، جب لاطینی زبان میں قرآن کا ترجمہ مکمل ہوا، اس ترجمہ کا پہلا اڈیشن باجایتی نے ۱۵۳۳ء میں بندوقیہ سے شائع کیا، لیکن اس وقت کے پوپ پال سوم نے اُس کے تمام نسخے جلوا دیئے، اس کے بعد پوپ الیکٹر نڈر چہارم نے ایک حکم نامہ کے قرآن اور اس کے ترجمہ کی اشاعت ممنوع قرار دی، ۱۶۹۲ء میں ایک جرمن بشپ ابراہام ہیلمان نے قرآن کا ترجمہ شائع کیا، گو یہ ترجمہ ۱۶۶۶ء میں تیار ہو چکا تھا، لیکن اس وقت اس کو شائع کرنے کی ہمت نہیں ہوئی، اپنے اس ترجمہ قرآن کے مقدمہ میں وہ لکھتا ہے کہ اگر ہم اسلام کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں تو یہ ضروری ہے کہ قرآن کریم کا گہرا مطالعہ کیا جائے، اس کے بعد ہی مشرق میں دین مسیحی کے فروغ کی راہیں ہموار ہو سکتی ہیں، گویا قرآن کا مطالعہ اور اس کے علوم کی معرفت حاصل کرنے کی نیت روز اول سے یہ تھی کہ اسلام کا مقابلہ کیسے کیا جائے، اور اس کی تعلیمات کو کن کن طریقوں سے باطل ٹھہرایا جائے، خشت اول کی اس کچی کے بعد پوری عمارت کے ناقص ہونے پر اس کے بعد زیادہ تعجب نہیں ہوتا، تعجب تو اس وقت ہوتا ہے جب مستشرقین اپنے مطالعہ کو معروضی، تحقیقی اور خالص علمی ہونے کا نام دیتے ہیں، ان مستشرقین نے اپنے علمی کاموں یا کارناموں میں اپنے اسلاف کے طرز فکر کو راہنما بنایا، اور ان سب کی تحقیقات کا حاصل یہ رہا کہ قرآن کریم یا تو نصرانیت سے ماخوذ ہے، یا یہودی تعلیمات سے نبی کریم نے استفادہ کیا،

ان انیکلو پیڈیا آف اسلام نے لفظ محمد کی تشریح میں ان ہی خیالات کو جگہ دی ہے، تاریخ کی بحث میں مائسن بی نے ایسے ہی مفروضات کو داخل کیا، اور دارنر جانجر اور لوری وغیرہ سارے مستشرقین کی تحقیقات کا لب لباب یہ ہے کہ قرآن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تالیف ہے، اور اس کے مصادر و مراجع تورات و انجیل ہیں سارے مستشرقین کا ایک نتیجہ پر متفق ہونا محض اتفاقی بات نہیں ہے، اصل یہ ہے کہ وہ تعصب اور نفسانی خواہشات میں متفق ہیں، اس کے بعد کسی علمی مسئلہ پر کسی آزادانہ اظہار رائے کی توقع ہی کیوں کر کی جاسکتی ہے، محمد اسد کے قول کے مطابق مستشرقین کی تحقیقات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گویا اسلام ایک علمی مباحثہ کا موضوع بننے کا اہل ہی نہیں بلکہ وہ ایک مجرم ہے، اور اپنے منصفوں کے سامنے فیصلہ



کے لئے دست بستہ کھڑا ہے،

مستشرقین کے اعتراض کا جواب مسلمان اہل قلم نے بار بار دیا ہے کہ اگر قرآن نے توریت و انجیل سے استفادہ کیا ہوتا تو سب سے پہلے یہودی اس کا اعتراف کرتے اور قرآن کو تسلیم کرتے، لیکن یہود تو کسی نبی اور پیغمبر کے نہ ہوئے، سب کے ساتھ ان کا رویہ بغض و کینہ اور خبت باطن کا رہا، نبی کریمؐ کی مخالفت میں بھی انہوں نے مشرکین مکہ کے ساتھ ساز باز کی مقصد یہی تھا کہ قرآن کریم کے وحی الہی ہونے پر طعن و طنز کا موقع ملے، اگر توریت و انجیل کی تعلیمات قرآن نے پیش کی ہوتیں تو یہودیوں کو تو سب سے پہلے قرآن کو تسلیم کرنا چاہئے تھا، مستشرقین کے اعتراضات کے جواب میں چند مغربی اہل قلم مثلاً ارنسٹ نے بھی اظہار خیال کیا ہے، وہ اپنی کتاب الاسلام و المسیحیۃ الحقیقیہ میں لکھتے ہیں، کہ انجیل کے صحیفوں میں جس عقیدہ اور دینی نظام کو پیش کیا گیا ہے، اسے حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات قرار نہیں دیا جاسکتا، آج مسیحیت اور اسلام کے درمیان موجودہ نزاع کا تعلق حضرت عیسیٰؑ کی انجیل سے نہیں بلکہ پال کی انجیل سے ہے، جس نے انجیل کی غلط تشریح کی، اور متفناد قصوں اور افسانوں کو باہم خلط ملط کر دیا، اس کے علاوہ انجیل میں اسلوب کے لحاظ سے بھی بنیادی اختلاف موجود ہے، کیونکہ انجیل کے صحیفوں لوقا، متی، یوحنا، مرقس اور برنابا کے کاتب الگ الگ ہیں، اس لئے یہ قرآن معنی اور اسلوب دونوں طرح سے توریت و انجیل سے ممتاز ہے،

# ڈاکٹر ڈیوئیڈ کینیوئل اسمتھ

## تعارف اور تجزیہ

از

ڈاکٹر مشیر الحق پروفیسر مطالعات اسلامی، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی

ڈاکٹر ڈیوئیڈ کینیوئل اسمتھ کی پیدائش کناڈا کے مشہور شہر ٹورانٹو کے ایک مذہبی عیسائی گھرانے میں ۲۱ جولائی ۱۹۱۶ء کو ہوئی، ان کے والد مشہور پارکر قلم بنانے والی کمپنی کے ڈائریکٹر تھے، اس حقیقت واقعہ اور اسمتھ کے مسلسل تصنیفی شغف کو کھتر ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ منہ میں چاندی کا چمچ تو نہیں، لیکن ہاتھ میں قلم لیکر ضرور اس دنیا میں آئے، وہ تقریباً سو تحقیقی اور علمی مقالات اور لگ بھگ دس اہم کتابوں کے مصنف ہیں، ان کے بعض مضامین اور کتابوں کے ترجمے عربی، ترکی، اردو، فرانسیسی، جرمن، انڈونیشی، جاپانی، اسپینی اور سویڈش زبانوں میں بھی شائع ہو چکے ہیں،

اسمٹھ نے جس ٹورانٹو میں آنکھیں کھولی تھیں وہ اپنے تہذیبی اور مذہبی روایات میں آج کے ٹورانٹو سے بہت مختلف تھا، اس وقت وہاں کی عام شہری زندگی پر مذہب کی اتنی گہری چھاپ تھی کہ اتوار کے دن بازار میں چائے کی ایک پیالی بچاؤ تو لوگ خوش نصیبی سمجھتے تھے، ٹورانٹو بدل گیا، لیکن اسمتھ کی مذہبیت میں تبدیلی نہیں آئی، مذہبی اقدار کی عملی پابندی کو معاملہ میں وہ آج بھی امریکہ میں رہتے ہوئے انیسویں صدی کی دنیا میں نہ صرف زندہ ہیں بلکہ خوش ہیں، اسمتھ بے عمل شیخا کے ساتھ رہ تو سکتے ہیں، لیکن زندگی نہیں گزار سکتے، انھیں دوسروں کی لامذہبیت سے اذیت ضرور پہنچتی ہے، لیکن ان کی مذہبی زندگی کو ناپنے کا معیار اسمتھ اپنے مذہب کو نہیں بلکہ اس مذہب کو قرار دیتے ہیں جس کی پیروی کے وہ دعویٰ دار ہوتے ہیں۔

کے عنوان سے ایک کتاب شائع کی، جب انہوں نے محسوس کیا کہ انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کا میدان ان کے ذہنی سفر کے لئے تنگ ہو گیا ہے تو ۱۹۶۴ء میں وہ ہارڈ یونیورسٹی میں مذہب کے تقابلی مطالعہ کے مرکز کے ڈائریکٹر ہو کر چلے گئے، مکمل انسٹی ٹیوٹ چونکہ اسلام کے مطالعہ کے لئے قائم کیا گیا تھا، اس لئے انہوں نے اپنے دورانِ قیام اس بات کا ہمیشہ خیال رکھا کہ اساتذہ اور طلبہ دونوں ہی کی تعداد میں مسلم اور غیر مسلم کی نسبت نصف ضرور ہے، کیونکہ ان کے خیال میں کسی بھی مذہب کا مطالعہ اس مذہب کے ماننے والوں کی غیر موجودگی میں نہیں کیا جاسکتا، ہارڈ یونیورسٹی چونکہ ایک سے زیادہ مذاہب کا مطالعہ مقصود تھا، اس لئے وہاں پر انہوں نے سٹرکواقتی بنیادوں پر قائم کیا، تاکہ مختلف مذاہب کے لوگ ایک ہی چھت کے نیچے رہ کر ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ۱۹۶۳ء میں وہ ہارڈ سے کنارڈ کی ڈیویزیون یونیورسٹی میں ریٹائرمنٹ کے پروفیسر ہو کر چلے گئے، وہاں سے پانچ چھ برس کے بعد دوبارہ ہارڈ واپس آئے، اور تادم تحریر وہیں ہیں۔

اسمٹھ اپنے فکر اور عمل دونوں کے اعتبار سے خود بھی مذہبی ہیں اور دوسروں کو بھی اپنے مذہب پر عمل پیرا دیکھنا چاہتے ہیں، تقویٰ ان کے خیال میں کسی مخصوص مذہب کی ملکیت نہیں ہے یہ دراصل انسان اور خدا کے باہمی تعلق کے نتیجے میں وجود میں آتا ہے، یہ تعلق جتنا مضبوط ہوگا، فرد کی مذہبی زندگی اتنی ہی قابل رشک ہوگی، اسمٹھ کے نقطہ نظر سے مذہب کی دو جہتیں ہوتی ہیں، ایک کو وہ انفرادی کیفیت کہتے ہیں اور دوسرے اجتماعی روایات، انفرادی کیفیت کو اسمٹھ اپنی زبان میں Faith اور ہماری زبان میں "ایمان" کہتے ہیں، اگرچہ ایمان کی دولت کے بغیر کوئی شخص مذہبی نہیں ہو سکتا، لیکن ایمان کو ناپنے کا کوئی پیمانہ نہیں ہے، یہ چونکہ ایک اندرونی کیفیت ہے اس لئے ضروری نہیں ہے کہ ایمان میں حالات کے تحت تغیر و تبدل نہ ہو سکے، اور ہر شخص کے ایمان کا پلہ بھی برابر نہیں ہو سکتا ہے، دوسرے لفظوں میں اسمٹھ ایمان ہر کس بقدر رحمتِ اوست "کے قائل ہیں، افراد کی سطح پر ملکیت کے فرق کو باوجود مذہب کی دوسری جہت یعنی کسی مذہب کے پیروں کی اجتماعی روایات کا نام اسمٹھ Cumulative Tradition دیتے ہیں، ظاہر میں ان کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے، اگرچہ ان میں زمان و مکان کے فرق کی وجہ سے تغیر اور تبدل ہوتا رہتا ہے، تاہم ان روایات میں چونکہ ایک تسلسل ہوتا ہے، اس لئے وہ کسی مذہب کا مطالعہ کرنے کے لئے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں، اور چونکہ روایات زمان و مکان کے فرق سے تبدیل ہوتی رہتی ہیں، اس لئے اگر اس جہت



اسمٹھ نے اپنی طالب علمانہ زندگی ٹورانٹو، پرنسٹن اور کیمبرج کی تعلیم گاہوں میں گزاری، لیکن وہ جہاں بھی رہے، ایک ممتاز طالب علم ہونے کے ساتھ ساتھ وہاں کے طالب علموں کی مذہب پسند تحریکوں میں بھی جوش و خروش سے حصہ لیتے رہے، ان تحریکوں میں ان کا ساتھ جن دوسرے طلبہ و طالبات سے رہا، وہ بالعموم عیسائی مشنریوں کی اولادیں تھیں، اپنے انہی ساتھیوں میں سے ایک خاتون موریل میکنزی اسٹروٹھرز کو انھوں نے ۱۹۳۹ء میں اپنی شریک حیات بنا لیا، ۱۹۳۱ء میں ان کا تقرراً ذارین کرپین کالج لاہور میں استاد کی حیثیت سے ہوا، جہاں وہ ۱۹۳۶ء تک مقیم رہے، انکی علمی زندگی میں ہندوستان کا یہ چھ سالہ قیام بڑی اہمیت رکھتا ہے، "ہندوستانی اسلام" کا قریب سے مطالعہ کرنے کے بعد انھیں اپنے اس خیال کی صداقت کا پورا یقین ہو گیا کہ اسلام صرف مشرق وسطیٰ کی سرحدوں میں محدود نہیں ہے اور برصغیر کو نظر انداز کر کے اسلام کا مکمل مطالعہ ممکن نہیں ہے، انھوں نے اپنی سب سے پہلی کتاب "مادرین اسلام ان انڈیا" ۱۹۳۳ء میں شائع کی، جس کا شمار آج بھی نیم کلاسیکی ادب میں کیا جاتا ہے، وہ اس وقت تک تاریخ کے تجزیاتی مطالعہ میں مارکسی معیارات کو بنیادی جگہ دیتے تھے، جس کی جھلک اس کتاب میں صاف نظر آتی ہے، اس کی اشاعت کے بعد مارکسی نقطہ نظر کی وجہ سے انھیں مذہبی عیسائی دنیا کی تنقیدوں کا ہدف بنا پڑا، ہندوستان آنے سے پہلے وہ کیمبرج میں میملٹن گب کی نگرانی میں دو سال تک عربی اور اسلامیات کا مطالعہ کر چکے تھے، یہاں سے واپسی پر انھوں نے پرنسٹن میں فلپ کے سٹی کی نگرانی میں "مجلۃ الازہر، تجزیہ و تنقید" کے موضوع پر مقالہ پیش کر کے پی. ایچ. ڈی کی ڈگری حاصل کی، ۱۹۳۹ء میں وہ کیمبریج میں کے پروفیسر ہرکلیس کی پوزیشن پر چلے آئے، جہاں دو ہی سالوں کے عرصہ میں انھوں نے انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کی بنیاد ڈالی، مکمل آنے کے پانچ چھ برس کے اندر ہی ان کی دوسری سرکردہ کتاب "اسلام ان مادرین ہٹری" شائع ہوئی، جس نے ان کو پورے عالم اسلام میں متعارف کرا دیا، لیکن اس کتاب کے شائع ہونے کے بعد وہ صرف اسلام کو اپنا موضوع مطالعہ بنانے کے بجائے دنیا کے مختلف مذاہب، بلکہ نفس مذہب کا مطالعہ کرنے میں مشغول ہو گئے، انھوں نے مانٹریال ریڈیو پر "دوسروں کا مذہب" کے عنوان سے تعارفی تقریروں کا ایک سلسلہ شروع کیا جو ۱۹۶۲ء میں The Faith of Other Men کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوا، ۱۹۶۳ء میں انھوں نے مختلف مذاہب پر اپنی تحقیقات کا پور "مذہب کا مطلب و منتہی" The Meaning and End of Religion

سے دیکھا جائے تو ایک سے زیادہ مذاہب کا وجود ثابت ہو جاتا ہے، لیکن اگر اندرونی کیفیت یا ایمان کو مذہب کا معیار

مانا جائے تو پھر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایک سے زیادہ ایمان کا وجود ممکن ہے، ایمان کی اجتماعی شکلیں مختلف ہو سکتی ہیں، لیکن

ایمان ہمیشہ واحد ہی رہے گا، اسے جمع کے صیغے میں استعمال نہیں کیا جا سکتا، یہی وجہ ہے کہ اسمتھ اپنی تحریروں میں

Faith کو ہمیشہ واحد کے صیغے میں لکھتے ہیں، پتہ پرائی تحریروں میں انہوں نے جہاں کہیں اسے ضرورتاً جمع کے صیغے میں لکھا

اسے دوبارہ اشاعت کے وقت FORMS OF FAITH (ایمان کی مختلف شکلوں) میں بدل دیا ہے۔

ایمان اسمتھ کے نزدیک ایک لغوی کیفیت کا نام نہیں ہے بلکہ یہ ایک معاہدہ ہے جو بندہ اپنے خدا سے کرتا ہے

جس کی رو سے وہ اپنی مرضی کو خدا کی مرضی کے تابع کر دیتا ہے، یہی وہ مقام ہے جہاں ایمان کا اظہار ہوتا ہے اور وہ

شکل اختیار کر لیتا ہے، خدا پر ہمارا ایمان جتنا زیادہ مکمل ہوگا اتنا ہی ہم اس کے تابع اور فرماں بردار بندے ہوں گی

اسی اتباع اور فرماں برداری کو اسمتھ "اسلام" کہتے ہیں، اسلام ان کے نزدیک دراصل ایمان کے اظہار کا نام ہے، اس نتیجے

پر پہنچ جانے کے بعد وہ بھی یہی کہتے ہیں کہ اِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ۔ لیکن اس کی تشریح میں وہ ہم سے

اختلاف کرتے ہیں، ہم یہاں اسلام کو اسم معرفہ سمجھ کر اس سے اپنا مذہب اسلام مراد دیتے ہیں، اور اسمتھ اسے "اطاعت

خداوندی" کے معنوں میں سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، اسلام کے اسم فاعل "مسلم" کی تشریح بھی وہ لغوی اور اصطلاحی

دونوں طرح سے کرتے ہیں، لغوی حیثیت سے تو مسلم کا مطلب ہے "فرمانبردار بندہ" لیکن اب اصطلاحاً مسلم ان لوگوں

کو کہا جاتا ہے جو تاریخی مذہب اسلام کی پیروی کو ذریعہ نجات سمجھتے ہیں، اگر ہم بات کو واضح کرنے کے لئے تھوڑی

دیر کے لئے دو الگ الگ ہم معنی لفظ "مسلم" اور "مسلمان" استعمال کریں جن میں اول ان کے لغوی معنوں میں اور

آخر ان کے اصطلاحی معنوں میں، تو پھر اسمتھ بلا کسی جھجک کے انگریزی میں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ "میں مسلمان نہیں ہوں"

لیکن اسی بات کو وہ عربی زبان میں "مسلم" کے لغوی معنی کو ذہن میں رکھتے ہوئے اپنے بارے میں "ست بمسلم" کہنے

پر کبھی تیار نہ ہوں گے، کیونکہ اس اعلان کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ خدا کے فرمانبردار بندے نہیں ہیں، اور یہ بات ان کے

عقیدے اور عمل کے مطابق درست نہیں ہے، خدا کی مرضی کو وہ جس حد تک اپنی صلاحیتوں کے مطابق سمجھ سکیں،

اس کے تحت ان کی پوری زندگی ایک بندہ مسلم کی زندگی ہے، اپنے کو بندہ مسلم سمجھنے، لیکن اصطلاحی معنوں میں

مسلم نہ کہنے کی ایک وجہ تو ان کے خیال میں یہ ہے کہ وہ اتفاق سے کسی مسلم گھرانے میں نہیں پیدا ہوئے، اور دوسری

وجہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کے اس دعوے سے متفق نہیں ہیں کہ اصطلاحی طور سے مسلمان ہونے بغیر خدا کی مرضی کے آگے سر نہیں جھکایا جاسکتا، انھوں نے بس طریقہ سے اپنے کو خدا کے سپرد کیا ہے، وہی سپردگی ان کے نزدیک "الاسلام" ہے، کیتھولک انسائیکلو پیڈیا کی تشریح کے مطابق دین "یا ریلجین" خدا کے حضور بندوں کی اختیاری سپردگی کو کہتے ہیں "پروفیسر اسمتھ کا اصرار ہے کہ اگر ہم کیتھولک پادریوں یا دوسرے عیسائی علماء کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھ لیں گے کہ وہ ریلجین کی مذکورہ بالا تعریف کے پیش نظر صبح و شام اپنی زبان میں "اِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ" کا ورد کر رہے ہیں، ان کو باوجود انھیں اس پر بھی اصرار ہے کہ وہ مسلمان نہیں ہیں، گویا اسلام ان کا دین تو ہے، لیکن وہ مسلمان نہیں ہیں، یہ ظاہری تضاد بیانی اُس وقت ختم ہو جاتی ہے، جب یہ واضح کر دیا جائے کہ عیسائی علماء اور پادری اور خود اسمتھ جس اسلام کو اپنا دین کہتے ہیں، وہ اس اسلام سے قطعاً مختلف ہے جو صد ہا برس کے تاریخی اور سماجی حوالے کے نتیجے میں ایک خاص مذہبی طرز فکر کا مراد بن گیا ہے۔

اسمتھ کو یقین ہے کہ اسلام کا جو مفہوم وہ سمجھ رہے ہیں، وہ قرن اول کے مسلمانوں کی تشریحات سے مختلف نہیں ہے، مثلاً طبری اور ان کے ہم عصر مسلمانوں کے بارے میں ان کا خیال ہے کہ وہ لوگ اسلام کا مفہوم اطاعت اور بندگی ہی لیتے ہیں، یہ تصور کہ اسلام ایک مذہب کی حیثیت سے ایک مکمل جامع اور متعین نظام ہے، ان کے خیال میں کم از کم قرن اول کے مسلمانوں کے لئے اجنبی تھا، مثلاً قرآنی آیات "وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ" اور "رَضِيْتُ لَكُمْ الْاِسْلَامَ دِيْنًا" کی تشریح کرتے وقت طبری اسلام کا مطلب بتاتے ہیں: الاستسلام لامرئى والافتقار لطاعتى على ما شرعت، لکم من حد و دة و فر الضدہ۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مسلمان بھی طبری کی اس تشریح سے اختلاف نہیں کرتے، کیونکہ وہ بھی یہی بات کہتے ہیں کہ اسلام اللہ کی مقررہ حدود و فرائض کی پابندی کا نام ہے، اور اسمتھ بھی یہی کہتے ہیں، لیکن جب ہم اس سے آگے بڑھ کر تفہیمات میں داخل ہوتے ہیں تو ہم اور اسمتھ الگ الگ راہوں پر چل پڑتے ہیں، ہمارے نزدیک اللہ کی مقرر کردہ حدود و فرائض "من وعن" وہی ہیں جنہیں ہم شریعت اسلامیہ کہتے ہیں، اس لئے مسلمان ہونے کے لئے ضروری قرار دیتے ہیں کہ انسان شریعت اسلامیہ کی بالادستی کو بھی قبول کرے، اسمتھ کو ہماری تشریح سے اتفاق نہیں ہے وہ اطاعت الہی کو شریعت اسلامیہ میں محدود نہیں سمجھتے، شریعت اسلامیہ اسمتھ کے نزدیک دراصل مذہب کے اس رخ سے تعلق رکھتی ہے جسے وہ اجتماعی روایات کہتے ہیں



جس کا وجود ایک سے زیادہ شکلوں میں ممکن ہے، یہاں پر اسمتھ تقریباً وہی بات کہتے ہیں جو مولانا ابوالکلام آزاد نے سورہ فاتحہ کی تفسیر کے ذیل میں پاکستان کے عالم مولانا جعفر شاہ پھلواری ندوی نے اپنی کتاب "الدین ایسہ" میں دین اور شریعت کی بحث میں کہی ہے، کہ "دین ایک ہے، ایک رہا ہے اور ہمیشہ ایک رہے گا، ہاں شریعتیں بدلتی رہتی ہیں" اسی کے ساتھ ساتھ مولانا آزاد یہ بھی کہتے ہیں کہ دوسرے مذاہب کے لوگ اگر اپنی اپنی اصل شریعتوں پر صدق دلی اور ایمان داری کے ساتھ عمل کریں تو انھیں محسوس ہوگا کہ ان کی شریعتوں کی دعوت بھی بعینہ وہی ہے جس کی طرف اسلام لوگوں کو بلا رہا ہے اگر بات اسی اجمال میں چھوڑ دی جائے تو شاید اسمتھ کو بھی مولانا آزاد کے اس نکلانے ہوئے نتیجے سے اختلاف نہ ہوگا ہاں ان میں اختلاف اس وقت ہوگا جب شریعت اسلامیہ کو ایمان کا مرادف قرار دیا جائے اور اس کے بغیر تکمیل ایمان کو ناممکن کہا جائے،

(اسمٹھ کو "شاریات" سے بھی کافی دلچسپی ہے اور نتائج نکالنے میں اس سے مدد لیتے رہتے ہیں، ایمان اور اسلام کی بحث میں یہ دکھانے کے لئے کہ اصل چیز ایمان ہے اور قرآن نے اسی پر زور دیا تھا، لیکن جیسے جیسے مسلم سماج منظم ہوتا گیا اور دوسرے مذاہب کی طرح ایک مخصوص مذہب کی شکل اختیار کرتا گیا، ایمان کے بجائے اسلام پر زور دیا جانے لگا، قرآن میں ایمان اور اسلام، نیز ان کے مختلف مشتقات کی تعداد کی بنیاد پر اسمتھ نے ۸۵ (۸۵٪) اور ۱۵ (۱۵٪) کی نسبت دکھائی ہے، اس کے بعد انھوں نے قرن اول اور زمانہ وسطیٰ کی عربی کتابوں کے ناموں کی بنیاد پر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ۱۳۰۰ء تک یہ نسبت ۸۵ اور ۱۵ کے بجائے ۴۰ اور ۶۰ کی ہو جاتی ہے، عہد جدید یا چودھویں صدی میں ایمان اور اسلام کا تناسب بالکل بدل جاتا ہے، اور دونوں میں سات (۷۰٪) اور ۳۰ (۳۰٪) کی نسبت رہ جاتی ہے، ان اعداد و شمار کی روشنی میں اسمتھ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ آج اسلام کو جو ایک جامع نظام کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اور یہ تصور پیش کیا جا رہا ہے کہ نزل قرآن کا بنیادی مقصد ایک مسلم کمیونٹی کا قیام تھا، وہ عہد جدید کی پیداوار ہے، اسمتھ کے خیال میں اگر قرآن کا یہی مقصد رہا ہوتا تو پھر وہ ان یہودیوں اور عیسائیوں پر تنقید نہ کرتا جو جنت کو اپنے مذہبی دائرہ میں محدود سمجھتے تھے۔

اسمٹھ ایک طرف خدا پر ایمان رکھنے کے باعث اپنے کو "مسلم" بھی کہتے ہیں، اور دوسری طرف وہ اس تاریخی حقیقت کو بھی نظر انداز نہیں کرتے کہ "مسلم" ایک اسم معرفہ ہے، اس کا اطلاق ان لوگوں پر ہوتا ہے جنہوں نے محمد صلعم

کے ذریعہ ایران کی دولت پائی ہے، اسی لئے وہ مسلمانوں اور ان کے مذہب کو صرف "مسلم" اور "اسلام" کے الفاظ سے متعارف کراتے ہیں، یورپ میں اسلام اور مسلمانوں کے لئے مختلف زمانوں میں جو نام رائج رہے ہیں ان کے بارے میں اسمتھ کا یہ خیال ہے کہ وہ کسی بدیتی یا توہین کے باعث نہیں تھے، یورپ جن جن طریقوں سے اسلام سے واقف ہوا اسی قسم کے نام وہ اسے دیتا گیا، کسی زمانہ میں اسے "گر وہ سارا سین" کہا گیا، پھر جب ریناساں اور ریفارمیشن کے دور میں ریلیجن (مذہب) کی اصطلاح یورپ میں رائج ہوئی تو اسلام کو "مذہب سارا سین" بتایا گیا، پھر اسے "تاریخ اور ترکوں اور مذہب" نام دیا گیا، حیرت یہ ہے کہ سترہویں صدی میں پہلی بار جب یورپ نے لفظ اسلام کا استعمال کیا تو اس وقت بھی اسے مذہب کے لئے نہیں بلکہ اہل مذہب کے واسطے بولا گیا، اور اسلام کی تعریف "کیتھولک یا صحیح العقیدہ Right Believing مسلمان" کے الفاظ سے کی گئی، انیسویں صدی تک یورپ کی تحریروں میں اس قسم کے جملے مل جاتے ہیں، جن میں کہا گیا ہے کہ "اپنے عقیدہ کے اعتبار سے تم ایک اسلام ہو" جب تک اسلام بمعنی مسلم مستقل رہا اس وقت تک مذہب اسلام کے لئے "اسلام ازم" کا لفظ رائج رہا، انیسویں صدی سو محمدؐ اور محمدؐ ازم کے الفاظ مختلف ہیجے کے ساتھ رائج ہوئے، اس صدی کے نصف اول بالعموم اسلام اور مسلم بولا جانے لگا۔ خود اسمتھ نے اپنی تحریروں میں ہمیشہ یہی دو الفاظ استعمال کئے ہیں، بلکہ ان الفاظ کو رواج عام دینے کے لئے وہ پچھلے چالیس پینتالیس برسوں سے قلمی اور زبانی جہاد بھی کر رہے ہیں، اس معاملہ میں وہ اس حد تک زود جس ہیں کہ ۱۹۴۹ء میں جب ان کے استاد سر ہیلٹن گب کی مشہور زمانہ کتاب "محمدؐ ازم" شائع ہوئی تو اسمتھ نے کتاب کے نام کو پسند نہیں کیا اور نہ ہی وہ گب کی اس معذرت سے متاثر ہوئے کہ یہ نام ان کی اپنی پسند سے نہیں، بلکہ ناشر کی تاجر پالیسی کی وجہ سے رکھنا پڑا، لیکن اب اسمتھ آہستہ آہستہ یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ اس معاملہ میں خود ان کا بے پچک اصرار شاید ضرورت سے کچھ زیادہ ہے، اور گب کی کتاب کے عنوان کو بالکل ہی بے بنیاد نہیں کہا جاسکتا، اسمتھ نے کھل کر تو یہ بات نہیں کہی ہے کہ وہ اب اسلام کے بجائے محمدؐ ازم کو ترجیح دیتے ہیں، لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب اگر کوئی شخصوں سلام کے بجائے محمدؐ ازم پر اصرار کرے تو اسمتھ کا رد عمل اتنا سخت نہ ہوگا جتنا گب کی محمدؐ ازم شائع ہونے کے وقت تھا، اس کا سبب معلوم کرنے کے لئے ہمیں اسمتھ کے ایک اور خیال کا جائزہ لینا پڑے گا۔

اسمٹھ کے خیال میں کسی بھی مذہب کا صحیح اور مکمل مطالعہ اس مذہب کے ماننے والوں کے احساسات اور جذبات

ان کے افکار و اعمال، نیز مذہب کے تاریخی تسلسل اور "شعار" Symbol کو نظر انداز کر کے صرف ان کی کتابی اہمیت کی روشنی میں نہیں کیا جاسکتا، اسلام میں رسول اللہ صلعم کو مرکزی حیثیت حاصل ہے، اسے ہمیں فراموش نہیں کرنا چاہئے، اپنی کتاب "The Faith of Her Men" میں انھوں نے دنیا کے چند بڑے مذہبی طریقوں کا تعارف کرتے ہوئے مذہبی شعاریا Religious Symbol کی بحث اٹھائی ہے اور بتاتا ہے کہ ہر مذہب کا ایک نہ ایک شعار ہوتا ہے، کسی مذہب میں یہ شعار ضروری ہوتا ہے، جیسے عیسائیوں کی صلیب اور کہیں معنوی ہوتا ہے عیسوی اسلام کا کلمہ شہادت، کلمہ شہادت سے ایک مسلمان اگر ایک طرف اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے تو ساتھ ہی ساتھ اس کی بھی شہادت دیتا ہے کہ محمد اللہ کے رسول ہیں، کلمہ شہادت کی تشریح کرتے ہوئے اسمتھ یہ بتاتے ہیں کہ کلمہ کے دوسرے جزو محمد رسول اللہ کے ذریعہ آنحضرت صلعم کے رتبہ کا تعین مقصود نہیں ہے، بلکہ اس سے مراد آپ کے منصب کا اظہار ہے، اس منصب کی رو سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان انسانوں تک "رضی اللہ عنہم" کی ترسیل کا ایک ذریعہ تھے، اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے مسلمانوں کے ان باہمی مناظروں کو یاد کریں جو "ذات نبوی" کے تعین کے سلسلہ میں ہوتی رہی ہیں، اور آج بھی ان کا سلسلہ جاری ہے تو ہم یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ اسمتھ ایک طرح سے ان مسلمان علماء کے ہمنوا ہیں جنہیں خدا کی خدائی اور رسول کی رسالت کے درمیان واضح خط کھینچنے کے الزام میں مختلف خطابات سے نوازا جاتا رہا، لیکن مسلمانوں کو اپنے رسول سے جو جذباتی محبت ہے اسے کس طرح نظر انداز کر دیا جائے "باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار" کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان اللہ کے ساتھ تو بے تکلفی برتنے کی جرأت کر لیتا ہے لیکن رسول کے معاملہ میں اسے محتاط رہنا پڑتا ہے، ایک مسلمان تو حیدخالص پر عقیدہ رکھنے کی وجہ سے کسی رسول یا نبی کو اللہ کی الوہیت میں شریک تو نہیں مانتا لیکن اس کے باوجود وہ عشق رسول کا مظاہرہ ان الفاظ میں بھی کرتا ہے ۵

وہی جو مستوی عرش ہے خدا ہو کر اتر پڑا ہے مدینہ میں مصطفیٰ ہو کر

اس موقع پر ہمیں "نور محمدی" اور "امتناع نظیر" کی بحثوں کو بھی ذہن میں رکھنا چاہئے جس نے اس عقیدہ کو جنم دیا کہ "الوہیت نے جب تعین اختیار کیا تو وہی حقیقت محمدیہ ہو گئی اور یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ مسلمان آنحضرت کو صرف خدا کا قاصد نہیں بلکہ شارع بھی مانتے ہیں، آپ کے فرمودات کا درجہ اگرچہ قرآن کے بعد آتا ہے، لیکن اسے "ناسخ قرآن" کہنے والے لوگ بھی اسی دنیا میں موجود ہیں، مسلمانوں کی یہ کلامی بحثیں بھلے ہی عمومی نہ ہوں لیکن اس سے تو انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مسلمانوں



کے عقیدے کے مطابق اسلام کی تشکیل (خواہ اسے لغوی معنوں میں بولیں یا اصطلاحی معنوں میں) ذات اقدس کے بغیر ممکن نہیں ہے اور دوسرے لفظوں میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ صحیح اسلام دیا اسمتھ کے لفظوں میں صحیح طریق سپردگی، مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق وہ ہے جس کا نمونہ رسول اکرم نے اپنے قول و عمل سے پیش کیا، اس پس منظر میں جب ہم اسلام کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو اسمتھ اپنے اس خیال میں بہت حد تک حق بجانب نظر آتے ہیں کہ اسلام کو اگر کوئی شخص محدثن ازم (یا محدثیت) کے عنوان سے پیش ہی کرتا ہے تو اس کے پاس اس کے لئے کچھ نہ کچھ بنیادیں ہوتی ہیں، آپ نے ایسے مضامین پڑھے ہوں گے جن میں ایک شاعر یا افسانہ نگار یہ بتانے کی کوشش کرتا ہے کہ وہ افسانہ کیوں لکھتا ہے، یا شاعر کیوں کہتا ہے، اسمتھ نے اس قسم کا کوئی مضمون نہیں لکھا ہے، یا کم از کم میری نظروں سے نہیں گزرا ہے کہ وہ اسلامی موضوعات پر کیوں لکھتے ہیں، لیکن اگر اس سوال کا جواب ہم ان کی مختلف تحریروں میں تلاش کرنا چاہیں تو کہہ سکتے ہیں کہ وہ نہ تو اتنے بددیانت ہیں کہ دنیا کے سامنے اسلام کی ناطق تصویر پیش کرنے کی خاطر اس میدان میں آئے ہیں اور نہ ہی اتنے خوش فہم ہیں کہ سمجھتے ہوں کہ وہ اس طرح چند مسلمانوں کے دلوں میں گھس کر انہیں اسلام سے برگشتہ کر سکیں گے، اور یوں عیسائیوں کی تعداد میں اضافہ کا سبب بنیں گے، اسمتھ کو اس بات پر انشراح صدر ہے کہ یہ دور بڑے پیمانہ پر اجتماعی تبدیل مذہب کا نہیں ہے، اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت ہے کہ عالمی سطح پر انسانی معاشرہ اتنا کامپوزیشن ہوتا جا رہا ہے کہ اب ایک عیسائی یا ایک یہودی، یا ایک "لاادریا" Agnostic خود اپنے گھر میں اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر مجبور ہے کہ اس کا پڑوسی ایک ذہین، باعمل، متقی، پرہیزگار بدھسٹ ہو یا ہندو ہو یا مسلمان ہو، اب ان سب کو اگر ایک ساتھ رہنا ہے تو انہیں ایک دوسرے کے مذہب سے بھی پوری واقفیت رکھنی چاہئے۔

یہاں ایک مسئلہ اور چھیڑنے کو جی چاہتا ہے، اکثر لوگ یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ اگر مستشرقین اپنے اس دعوے میں صادق ہیں کہ وہ اسلام کا مطالعہ خاموش نیت کے ساتھ کرتے ہیں تو پھر وہ مسلمان کیوں نہیں ہو جاتے، یہ سوال خاصا اہم ہے، اور چند لفظوں میں اس کا جواب نہیں دیا جاسکتا، ممکن ہے کہ کسی دوسرے پرچہ میں اس پر روشنی ڈالی گئی ہو لیکن جہاں تک اسمتھ کا سوال ہے، ان سے اگر خود انہی کے بارے میں یہ بات پوچھی جائے تو ممکن ہے وہ پلٹ کر جواب دیں کہ کیوں، آخر میں مسلمان کیوں ہو جاؤں؟ جب میں خود ایمان کی دولت سے سرفراز ہوں اور عیسائی ہوتے ہوئے مجھے قلب کا اطمینان حاصل ہے، تو پھر میں اپنا مذہب کیوں چھوڑوں، جی نہیں شکر یہ! لَكُمْ دِينَكُمْ وَ رِبِي دِينِي،

# قرآن اور مستشرقین

از

جناب سید اطہر حسین ریٹائرڈ آئی۔ اے۔ ایس، لکھنؤ

قرآن اپنے آپ کو الفرقان یعنی حق و باطل میں امتیاز کرنے والا کتاب ہے، اس کا پورا مضمون گویا ان الفاظ میں جمع ہو گیا ہے۔

جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَرَ الْبَاطِلُ  
 إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُورًا

حق آ گیا اور باطل نابود ہو گیا، تحقیق کہ باطل  
 اسی لئے تھا کہ نابود ہو کر رہے

(۸۱-۱۶)

قرآن کی غرض و غایت حقیقت الہیہ کو پیش کرنا ہے، قرآن دراصل مجسم سچائی اور قانون ہے، وہ تذبذب اور شک و شبہ یا بالفاظ دیگر باطل اور گناہ کو نیست و نابود کرتا ہے، باطل سے مراد یہ عقیدہ رکھنا کہ ذات مطلق کا وجود ہی نہیں ہے، یا یہ کہ اس کی ایک اضافی حیثیت ہے، یا یہ کہ ذات مطلق ایک سے زیادہ ہو سکتے ہیں، یا یہ کہ خود اضافی ہستی ہی ذات مطلق ہے۔

اسلام کی بنیاد ذات مطلق سے تعلق رکھتی ہے، قرآن کی رو سے اس کی ذات کا یقین فطرت انسانی میں ودیعت کر دیا گیا ہے، انسان کی تخلیق پر اسے ذات مطلق کی جھلک ملی تھی، اور اسے مقصد کائنات اور اشارے کے اسرار و مفہوم سے واقفیت کرادی گئی تھی، یہ امر اس کی فطرت کے خلاف ہو گا کہ وہ کائنات کے قوانین اور اشارے پر غور کرے، اور خالق کائنات سے انکار کر دے، کائنات میں جو منصوبہ، توازن اور ہم آہنگی کی کار فرمائی ہے، وہ خود بزبان حال پکار پکار کر کہتی ہے کہ ان کا خالق عظیم ترین وجود ہے، جو کائنات کا مالک ہے، اور جسے اقتدار اعلیٰ حاصل ہے۔

دوسرے الہامی مذاہب کے برخلاف اسلام کا سب سے بڑا اور بنیادی عقیدہ ہے، کہ کوئی الوہیت یا حقیقت الہی یا ذات مطلق توحید باری تعالیٰ یعنی حقیقت الحقائق یا ذات مطلق کے سوا نہیں ہے، اور تمام انبیاء و علیم السلام

انسانیت کو یہی پیغام پہنچانے کے لئے مبعوث ہوئے تھے، قرآن صرف توحید باری تعالیٰ پر زور دیتا ہے، بلکہ اس پر بھی یقین لازمی ہے، کہ اپنی اصلی شکل میں تمام انبیاء علیہم السلام کا یہی عقیدہ اور پیغام تھا، قرآن کسی ایک فرقہ، یا قوم یا گروہ کے لئے نہیں ہے، بلکہ پوری انسانیت کے لئے پیغام خداوندی ہے، تمام الہامی مذاہب کی ایک ہی بنیاد تھی، اور صرف شریعت اور قوانین و دستور میں جزوی فرق اس وقت کے معاشرہ اور ذہن انسانی کے عروج کے اعتبار سے تھا، لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا، دوسرے مذاہب کے پیروں نے تحریف و تخریب سے کام لیکر ان کی شکل بگاڑ دی، پیغام کو اصلی رنگ و روپ میں پیش کرنے کے لئے اور لوگوں کو ان کے انحراف اور تخریب پر آگاہ کرنے کے لئے اور حقیقی اور ازلی صراط مستقیم پر لانے کے لئے یہ آخری پیغام خداوندی خاتم الانبیاء سیدنا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ نازل ہوا، یہی اُس وقت نازل ہوئی، جب عقل و دانش کے دور کا آغاز ہو چکا تھا، اور انسان غور و فکر اور تدبیر سے کام لینے لگا تھا، اور حقائق کی قدر و قیمت پہچان سکتا تھا، اور انسان کی مادی ترقیوں نے وہ ذرائع فراہم کرائے کہ پیغام خداوندی عالم کے کونے کونے تک پہنچ سکتا تھا، قرآن کہتا ہے کہ اسلام انسان کا فطری مذہب ہے، اور اس فطرت کے مطابق ہے، جس پر انسان کی تخلیق ہوئی، اور خداوند کریم کے دستور اور طور و طریقہ میں کبھی کوئی فرق نہیں ہوتا ہے، اور اسلام ہی صحیح مذہب ہے۔

صرف اس وجہ سے کہ اسلام عقیدہ تثلیث کا حامی نہیں ہے، عیسائی مشنری اور یہودی پیشواؤں نے اور ان کے زیر اثر مستشرقین نے اسلام پر بے بنیاد الزامات تراشے اور اس کی مذمت کی، اپنے عقیدوں اور اصولوں کی بقا اور برتری ثابت کرنے کے لئے ان مستشرقین نے اس بات پر سب سے زیادہ زور دیا کہ قرآن کتاب الہی نہیں ہے، بلکہ خود پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی تخلیق ہے، اور جو اس میں انبیاء علیہم السلام کے واقعات و قصص ہیں، وہ عیسائیوں اور یہودیوں کی کتابوں سے لئے گئے ہیں، اور یہ کہ قرآن کی آیتوں میں تکرار ہے، اور کہیں ناقابل فہم ہیں اور قرآن کی موجودہ سورتوں اور آیتوں کی ترتیب میں کوئی منطق نہیں ہے،

ان تمام اعتراضات اور مفروضات کا ماخذ عیسائیوں کی مشنری کاوش ہے، جس کا نصب العین اسلام کے چہرے کو داغدار دکھانا تھا، اس کی تبلیغ و اشاعت میں رکاوٹ پیدا کرنا تھا، اور اپنے مذہب کی فوقیت ظاہر کرنا تھا، یہ اعتراضات اور مفروضات قرآن کے بنیادی اصول اور عقائد سے لاعلمی پر یا قرآن کے طرز بیان سے ناواقفیت یا ان غلط تراجم پر مبنی ہیں، جو مستشرقین کے ہاتھوں انجام پائے تھے، جنہوں نے نادانستہ یا دانستہ طور پر قرآن کی بہت سی آیتوں کے معنی و



مفہوم کو بدل کر یا سچ کر کے پیش کئے اور علی تحقیق اور صحیح جازسے کے منافی ہیں، شروع میں یہ اعتراضات اور ریشہ دوزی بھونڈے طریقہ یا بد زبانی کے ساتھ اٹھائے گئے، لیکن جیسے جیسے وقت گزرتا گیا اور تحقیقی کاموں میں کچھ صداقت آنے لگی اور اسلام کے تمذیب و تمدن اور اس کے اثاثہ کی گہرائی وسعت اور حقیقت کا زیادہ انکشاف ہوتا گیا، تو انھوں نے تنقید کا طریقہ بدل دیا، اور اپنی تائش آمیز حکمت علی کے ساتھ تیر دن شرکانے لگے۔

جارج ییل نے جنھوں نے انگریزی زبان میں سب سے پہلی بار قرآن کا ترجمہ ۱۷۳۳ء میں کیا، اپنے ترجمہ کے

دیباچہ میں لکھا ہے، کہ اس سے قبل جو لاطینی زبان میں ترجمے تھے، ان میں اصل سے انحراف تھا، بیلینڈ

Bibliander نے جو ۱۵۲۳ء میں لاطینی زبان میں ترجمہ کیا، اس کو ترجمہ ہی نہیں کہا جاسکتا ہے، کیونکہ

اس میں اتنی کثیر غلطیاں ہیں، اور اتنی جسارت سے کام لیا گیا ہے، اور اتنی چیزوں کا اخفا کیا گیا ہے، یا تبدیلی کی گئی

ہے کہ اس کی اصل سے کوئی مطابقت یا مماثلت نہیں ہے، ایک اور مستشرق کے لاطینی ترجمہ کے متعلق جارج ییل نے

لکھا ہے کہ وہ اور بھی ناقص ہے، اور جو ترجمہ Andre Arrivaabere نے فرانسیسی

زبان میں کیا ہے، وہ کسی طرح ترجمہ کہلانے کے لائق نہیں ہے، کیونکہ اس کے ہر صفحہ پر بے شمار غلطیاں ہیں، جا بجا تعریف

یا اضلفے ہیں، اور آیتوں کو مسخ کیا گیا ہے، جو ناقابل معافی ہے، اسی فرانسیسی ترجمہ کو الکنز نڈررز Alexander

Ross نے انگریزی زبان میں کیا، جس کے متعلق جارج ییل کی رائے ہے، کہ Alexander

Ross عربی زبان کے متعلق نہیں جانتے تھے، اور نہ انھیں فرانسیسی زبان پر عبور تھا، اور انھوں نے Duryer

کی غلطیوں میں اپنی طرف سے اضافہ کیا، اور انھوں نے بہت ہی مذموم زبان استعمال کر کے ترجمہ کو مضحکہ خیز کر دیا

Father Lewis Marrassi نے ایک لاطینی زبان میں ۱۶۹۵ء میں ترجمہ کیا تھا، جس

کے متعلق ییل نے یہ اظہار خیال کیا ہے، ان کی تفسیر اور ترجمہ میں تمام تکرار ہے، جس کی وجہ سے فصاحت تو بڑھ گئی مگر اتنا ہی

غیر اطمینان بخش ہے، اور کہیں کہیں زبان میں جسارت اور گستاخی سے کام لیا گیا ہے،

خود اپنے ترجمہ کے متعلق ییل کا کہنا ہے کہ ان کا مقصد اس غلط فہمی کو دور کرنا ہے، جو لوگوں میں بہتر ترجموں سے

پیدا ہو گئی ہے، اور Protestants ہی کامیابی کے ساتھ قرآن پر حملہ کر سکتے ہیں اور بھروسہ ہے کہ قدرت

Protestant کا ہی انتخاب کیا ہے کہ وہ قرآن کو شکست فاش دیں، انھوں نے ان کے پیش رو مترجمین اور مستشرقین

کی مذمت کی، جنہوں نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی یا قرآن عظیم پر بے بنیاد الزامات تراشے اور نہایت ہی ذلیل اعتراض زبان استعمال کی، مگر اپنی بے لوث کوشش اور فرخ دلی کے متعلق فرماتے ہیں، محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نعوذ باللہ کہتے ہی بڑے مجرم کیوں نہ رہے ہوں، کہ انہوں نے انسانیت پر ایک غلط مذہب تھوپا، مگر ان کی ذاتی صفات سے انکار نہیں ہو سکتا ہے، اور میں لائق اور متقی Spanhemius کو داد و تحسین دیتا ہوں کہ ہر چند وہ سمجھتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (نعوذ باللہ) ایک جعل ساز تھے، مگر انہیں بھی تسلیم ہے کہ قدرت نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام کمالات کے متصف کیا تھا، جس میں جسمانی خوبصورتی، لطیف زیرکی، اخلاق حمیدہ، غربا پروری، تواضع، حرفیوں اور غنیوں کے مقابلہ میں استقلال و ثابت قدمی، خدا کی حمد و ستائش کرنے والے مکاروں، زنا کاروں، قاتلوں، حرفیوں، افترا پردازوں کے خلاف سختی شامل تھی، اور بہت و استقلال، سخاوت، ترحم، شکر، والدین اور بزرگوں کی عزت کے بڑے داعی و مبلغ تھے، اور ہمہ وقت حمد باری تعالیٰ میں لگے رہتے تھے،

جارج سیل نے خود حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کی توصیف ان الفاظ میں کی ہے، آپ کی ہوش مندی، عاقلانہ و کریمانہ برتاؤ اور رویہ جس کے تحت اپنے مشن میں مصروف رہے، اسی جاہلانہ اعتراض کی تردید کرتے ہیں، کہ آپ ایک سخت خد نبی پیشوا تھے، سورہ فاتحہ کے متعلق وہ کہتا ہے، کہ اگر یہ مان لیا جائے، کہ آپ کے جذبات و خیالات کی صحیح ترجمانی کرتی ہے، تو وہ دیدہ و دانستہ جعل سازی سے کام نہیں کرتے تھے رسول اکرم (صلی اللہ علیہ وسلم) سورہ فاتحہ نماز کی ہر رکعت میں بڑے خضوع و خشوع سے پڑھتے تھے، لیکن جارج سیل نے اس میں شک ظاہر کرنے سے گریز نہیں کیا،

Rd. E. M. Wherry نے سیل کے ترجمہ کو اپنی تفسیر کے ساتھ چار جلدوں میں شائع کرایا اور خود دیاچہ میں انکشاف کرتے ہیں کہ یہ تفسیر اپنے جیسے لوگوں کے لئے ہے، جو مسلمانوں میں عیسائیت کی تبلیغ میں لگے ہوئے ہیں، انہوں نے اپنے فاسد خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ نعوذ باللہ قرآن خود ثبوت فراہم کرتا ہے، کہ وہ جعل سازی کی پیداوار ہے، اور پیغمبر اسلام کا یہ جھوٹا دعویٰ ہے کہ قرآن سابقہ کتب الہی کی تصدیق کرتا ہے، اس نے اپنا مقصد ان الفاظ میں واضح کیا کہ منازعہ اور نزاع کی تمام تنقیحات کو اس وجہ سے واضح کیا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کو اس عظیم ہستی حضرت عیسیٰ کا صحیح علم ہو جائے جن کے متعلق تمام انبیاء علیہم السلام نے پیشین گوئی کی کہ وہ خدا قدوس کے فرزند تھے، اور گنہ گاروں کے نجات دہندہ،

ان تمام تراشیدہ الزامات اعتراضات، بتان، اور مفروضات پر بحث کرنے اور ان کو تاثر فلفط ثابت کرنے سے قبل یہ ضروری معلوم ہوتا ہے، کہ وہ تمام باتیں سامنے لائی جائیں جو بین اور ناقابل تردید شہادت پیش کرتی ہیں کہ قرآن عظیم کسی انسان کی تخلیق ہوئی نہیں سکتی، اور خالق کائنات کے سوا اس کا کوئی خالق نہیں ہو سکتا ہے، اللہ تعالیٰ قرآن میں خود فرماتا ہے :-

”اس کتاب کو ہم نے آپ (محمدؐ) پر اس لئے نازل کیا ہے، کہ آپ بنی نوع انسان کو ان کے رب کے حکم سے تارکیوں

سے نکال کر خدا کے غالب دستودہ صفات کے نورانی رستے کی طرف لے جائیں“ (ابراہیم)

”اور جن لوگوں کو علم دیا گیا ہے وہ جانتے ہیں کہ جو (قرآن) آپ پر نازل کیا گیا ہے، وہ حق ہے، اور اس خدا کا

رات بتاتا ہے جو غالب اور محمود ہے“ (سبا)

یہ ایسی کتاب ہے جس میں کوئی شبہ نہیں ہے، پرہیزگاروں کے لئے (چشم) ہدایت ہے،

قرآن خود اس بات کی شہادت دیتا ہے، کہ وہ اللہ کا کلام ہے، قرآن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی تو بالراست

مخاطب کرتا ہے، اور کبھی بصیغہ غائب، اس کا اندازہ بیان حدیث سے مختلف ہے، اگر اچاناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی لغزش ہو جاتی، یا کسی معاملہ میں آپ کو پس و پیش ہو، تو وحی الہی سے آپ کی رہنمائی ہو جاتی تھی، اور کبھی کبھی آپ کو اس کا انتظار کرنا پڑتا تھا،

جو لوگ قرآن کے کلام الہی ہونے میں شک و شبہ کرتے ہیں، انھیں قرآن پہلے تو یہ چیلنج دیتا ہے، کہ اس کے

مماثل کوئی کتاب پیش کریں، اگر ایسا نہیں کر سکتے، تو یہ مطالبہ کرتا ہے کہ اس کے ان سورتوں کے مماثل سورتیں بنا لائیں

اس کے بعد چیلنج دیتا ہے، کہ کم از کم ایک سورہ کے مانند یا اس سے ملتی جلتی ہی کوئی سورہ بنا کر پیش کریں، واضح رہے کہ یہ

چیلنج صرف زمانہ نزول قرآن کی حد تک محدود نہیں تھا، بلکہ ہر زمانہ اور ہر وقت کے لئے کھلا ہے، قرآن نہ صرف اپنے

مضامین کی بلند پایگی اور اپنے پیام کے اعتبار سے بے نظیر اور ناقابل نقل ہے، بلکہ اپنے باوقار اسلوب بیان، تشبیہ و

استعارات کے تنوع اور الفاظ میں عکاسی کے لحاظ سے بھی بے مثل ہے، اس کی اہمیت اور اس کا طرز بیان انسانی

طاقت سے باہر اور ناقابل تمثیل ہے، قرآن کی ادبیت کا کچھ اندازہ جامع الازہر کی حسب ذیل تحریر سے ہوتا ہے،

(۱) قرآن کا انداز بیان نہ کسی مہذب شہری کی بزم نگاری و نزاکت کے مانند ہے، اور نہ ایک خانہ بدوش



بدوی کی درشت کامی کے مثل ہے، بلکہ وہ اول الذکر کی شیریں کلامی اور ثانی الذکر کے زور کلام کا حسین مجموعہ ہے،

(۲) نثر میں الفاظ کا وزن اور نغمہ اس طرح برقرار رکھا گیا ہے، جیسا کہ منظوم کلام میں ہوتا ہے، وقفے نہ بالکل

نثر کی شکل میں آتے ہیں، نہ نظم کی صورت میں بلکہ عبارت میں موزونیت اور نغمہ کا ایک نرالا تناسب پایا جاتا ہے،

(۳) الفاظ کا انتخاب ایسا ہے کہ نہ وہ ٹکسال باہر ہیں، اور نہ ایسے جن سے کان آشنا ہوں، بالفاظ دیگر شوکت انفاط

کا وہ عالم ہے کہ کہیں بھی فصاحت سے تجاوز نہیں،

(۴) جملوں کی ترکیب شاندار ہونے کے باوجود کم سے کم الفاظ میں بلند سے بلند خیالات کا اظہار ہوا ہے،

(۵) اظہار خیال ایسے مختصر جامع مگر سلیس الفاظ میں کیا گیا ہے کہ معمولی سمجھ کا آدمی بغیر کسی دقت کے قرآن کا مفہوم

سمجھ سکتا، . . . . .

(۶) قرآن میں وہ باریک بینی، لچک اور تنویہ ہے کہ وہ اسلامی علوم و فنون کے علاوہ شریعت و فقہ کی بنیاد

کا کام بھی دیتا ہے۔

(۷) نفیاتی کا یہ قانون ہے کہ عقل اور جذبات باہم متضاد ہوتے ہیں، مگر قرآن کی عبارت اس قانون سے بالاتر

ہے، کیونکہ وہ مافوق البشرستی کی بنائی ہوئی ہے، قرآن میں عقل اور جذبات کی باہم متضاد قوتوں میں حیرت انگیز ارتباط

پایا جاتا ہے، اور قرآن میں عبارت کی ممانت اور عظمت حیرتناک طریقہ پر برقرار رکھی گئی ہے، اور یہ کہیں بھی ٹوٹ نہیں پاتی ہے،

(۸) جب ہم کسی ایسے جملہ یا چند جملوں کی ساخت سے گذر کر جو ایک ہی مضمون پر مشتمل ہوں غور کرتے ہیں، بلکہ ہمیشہ مجموعی

پورے قرآن کی ہیئت ترکیبی پر غور کرتے ہیں، تو ہم ایک ایسا ہر جہتی نقشہ یا منصوبہ دیکھتے ہیں، جو انسانی دماغ کی پیداوار نہیں ہو سکتا،

اسلام کی بے پناہ اشاعت بھی قرآن کے کتاب الہی ہونے کا ایک ثبوت ہے جیسا کہ ایک مشہور مصنف اور فلسفی کہتا ہے،

قرآن کے آسمانی کتاب ہونے کا ثبوت نہ صرف اس کے پیش کردہ عقائد، اس کی نفیاتی اور مابعد الطبیعیاتی صداقت

اور جادو بیانی سے ہوتا ہے، بلکہ اس کے بیرونی اثرات اور اسلام کی معجزانہ اشاعت سے بھی یکساں طور پر ظاہر ہوتا ہے،

قرآن نے پہلے سے ہی پیشین گوئی کر دی تھی، کہ اسلامی تحریک کن کن مراحل سے گذرے گی، (سورہ ۴۴، ۴۵) نفی

کے رد عمل کی پیشین گوئی ہو چکی تھی، کہ کس طرح وہ ابتداء میں بے فکر رہیں گے، پھر کچھ موافقت اور دلچسپی کا اظہار کریں گے،

پھر مخالفت اور دشمنی پر اتر آئیں گے، پہلے اور سخت مقابلہ میں اہل مکہ کی مسلمانوں کے ہاتھ شکست ہوگی، قرآن نے اسکی

بھی پیشین گوئی کر دی تھی کہ اسلام کی فتح ہوگی، اس کے عقائد اٹل اور ابدی ہیں، اس کی نوزائیدہ حکومت ترقی پذیر رہے گی، اور دنیا کی کوئی طاقت اسلام کو صفحہ ہستی سے مٹانے میں سکتی ہے، (۱۳-۱۸ و ۱۳۲-۲۲ و ۵۵ و ۸۵-۳۶) اسلامی مشن کے انصرام حتیٰ کہ پیغمبر اسلام کی وفات کا پیشگی سے اعلان ہے، کوئی چیز گڑھی ہوئی نہیں ہے، بلکہ ہر تفصیل ایک بے داغ و نفوذ کا جزر لاینفک کا کام دیتی ہے،

قرآن جسے جسے طور پر حسب ضرورت تیس سال کی مدت میں نازل ہوا، قرآن کا یہ اعجاز ہے کہ ہر سورہ یا آیت نہ صرف پیدا شدہ حالات کے متقاضی تھی، بلکہ قرآن کے پورے پلان کے مطابق بھی تھی، جیسے جیسے قرآن نازل ہوتا گیا، آیتوں کو ترتیب دینے کا کام ہوتا گیا، اور آیتوں کی نمبر اندازی کر دی گئی، ہر آیت کے دو سلسلے ہیں، ایک بحسب تنزیل اور دوسرا بحسب ترتیب، سلسلہ نزول کے اعتبار سے ہر آیت اس وقت کی ضروریات کے لائق تھی، اور پورے پلان کے لحاظ سے ہر آیت ماقبل آیت اور بعد کی آیتوں سے مربوط ہوتی گئی، سلسلہ تنزیل کے اعتبار سے آیتوں میں رابطہ تسلسل، ہم آہنگی، اور منطقی ارتقا تھا، اور جب اس ترتیب سے کئی مختلف ترتیب میں آیتوں کو پرو دیا گیا، تب بھی اتنا ہی اعلیٰ رابطہ تسلسل ہم آہنگی، اور منطقی ارتقا پایا جاتا ہے، اگر یہ پرو دیا جائے کہ قرآن میں ۱۱۴ سورتیں ہیں، اور ان میں سے زیادہ تر سورتیں ایسی ہیں، جو مختلف سینن میں جسے جسے اور کئی کئی سال کے وقفہ سے نازل ہوئیں، تو استعجاب حیرت میں بدل جاتا ہے، یہ انسانی کام نہیں بلکہ معجزہ ہے، یہ بالکل ظاہر ہے کہ اگر کوئی بھی مصنف پہلے سے ایسا کوئی خاکہ یا منصوبہ بنائے، تو اس کے لئے یہ جاننا ضروری ہوگا کہ آئندہ ۲۳ سال میں کیا کیا واقعات رونما ہوں گے، کون کون سے مسائل درپیش ہوں گے، الفاظ کی کیسی موسیقیت ہوگی اور آنے والی آیتوں کا اس خاکہ میں کون کون سا مقام ہوگا، ظاہر ہے کہ قرآن کا مصنف خدائے عالم الغیب کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔

قرآن کوئی سائنس کی کتاب نہیں ہے، مگر وہ بہت سے مظاہر قدرت کی نسبت اشارے یا معلومات بہم پہنچاتا ہے جن کے متعلق انسان کو صدیوں بعد تک مطلق کوئی علم نہیں تھا، چند مثالیں ملاحظہ ہوں :-

زمین کی گولائی اور گردش (۳۹-۲۵۱)

مینہ کی تشکیل، (۴۰-۲۸)

ہوا کے ذریعہ نرو مادہ پھولوں کے تولیدی مادہ کا اتحاد، (۱۵-۲۲)

تمام اشیاء میں زودادہ کا وجود، (۳۲-۳۵)  
چاند سورج اور سیاروں کا مقررہ برجوں میں گردش، (۳۶-۲۹ تا ۳۸)  
سورج کی از خود روشنی اور چاند کا اس کی روشنی سے منور ہونا،

تمام جانداروں کا آبی ماخذ، (۳۰-۲۱)

شہد کی مکھیوں کا طرز زندگی، (۱۴-۹۶)

بچہ کی رحم مادر میں تدریجی تشکیل اور اس کے تین پردوں میں رہنا، (۲۳-۲۴-۱۴)

اس کے علاوہ واقعہ پڑھے اور قرآن خود گواہی دیتا ہے، اور تمام مشرقین کو تسلیم ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ

علیہ وسلم امی تھے، یعنی پڑھے لکھے نہ تھے، لیکن اپنی ہٹ دھرمی اور قرآن کے آسمانی کتاب کے ہونے کے انکار میں  
مشرقین پھر بھی کہتے ہیں، کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تخلیق ہے، قرآن نے کتنے متنوع مضامین، کتنی اعلیٰ اور

بنیادی باتوں پر روشنی ڈالی ہے، اُس نے پہلی بار اللہ تعالیٰ کی یکمائی اور اس کا ماورائی تصور اس طرح پیش کیا ہے، کہ  
دلوں میں خدا کے وجود کا متحرک احساس پیدا ہو جائے، اس کی حکومت اور اقتدار اعلیٰ پوری کائنات کا ایک مفصل

اور مربوط منصوبہ جس میں تمام مظاہر فطرت کا خاص قوانین کے تحت کار فرمائی، انسان اس کے خالق کے درمیان ایک

مابعد الطبیعیاتی رشتہ، انسان کے روحانی اور مادی پہلوؤں میں امتزاج، ایک مکمل دستور حیات کے تمام بنیادی اصول

روح انسانی کا تخلیق کے وقت سے لیکر ابد تک کی زندگی، اور اس کے مراحل، اس کے عقائد اور اعمال اور خیالات اور

کردار میں صدق پر زور دینا، انسان کا بحیثیت انشراح مخلوقات درجہ و مرتبہ عقل و فہم کے استعمال پر زور انسان

کے بنائے ہوئے امتیازات کی نفی جو فرقہ، نسل و رنگ وغیرہ پر مبنی ہوں پوری انسانیت کا ایک برادری ہونا، ایک

نئی تہذیب اور تمدن کی داغ بیل ڈالنا، اس کے اصول اور ہدایت کی ابدیت اور حقوق اللہ اور حقوق الناس پر زور

اور ان کی نسبت انسان کی ذمہ داریاں وغیرہ وغیرہ مضامین پر بحث کی گئی ہے، دنیا کا بڑے سے بڑا دانشور اور

ادیب ایسی کتاب نہیں لاسکتا ہے، ایک ان پڑھ آدمی کا ذکر کیا ہے، جارج سیل کو بھی تسلیم ہے، کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم

تعلیم یافتہ نہیں تھے، مگر وہ پھر بھی کہتا ہے، کہ قرآن کے معنی وہی تھے، اور ہو سکتا ہے، کہ انھوں نے یہودیوں اور

عیسائیوں کی صحبت میں یہ تمام علم حاصل کر لئے ہوں، حالانکہ مکہ معظمہ میں اگر کچھ عیسائی یا یہودی تھے تو وہ معدومے

چندر ہے ہوں گے، ان کی جو تعداد بتائی جاتی ہے وہ بالکل ناقابل اعتبار ہے، یہ بھی کہا جاتا ہے، کہ قرآن میں



جو رشددہدایت پر جا بجا زور ہے، وہ حضورؐ کی سیاحت اور سفر کا نتیجہ ہے، مستشرقین نے قیاس آرائی کی ہے کہ تمام اہلہای باتیں حضورؐ نے ایک عیسائی پادری بحیرہ کی ایک روزہ ملاقات سے حاصل کیں، یا انجیل و تورات کے قصص سے حاصل کیں، حالانکہ اس کو تسلیم ہے، کہ یہ کتابیں حضورؐ کو دستیاب نہیں تھیں، اور نہ اس وقت تک ان کا عربی زبان میں ترجمہ ہوا تھا، ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی کہتا ہے، کہ جو کچھ حضورؐ نے ان آسمانی کتابوں سے حاصل کیا اس کو ایک نئے انداز میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ اپنے طور پر پیش کر دیا، جو ایک بہت اعلیٰ مصنف اور ادیب کا ہی کام ہو سکتا ہے، اس نے اپنے بغض میں پہانٹک کر دیا کہ اہل قریش کی مخالفت اس بات کی دلیل ہے، کہ حضورؐ نبی نہیں تھے، حالانکہ ایک قلیل مدت میں قریش کے بچہ بچہ نے اسلام قبول کر لیا تھا،

قرآن اور دوسری کتب الہی میں ابتداءء آفرینش، حضرت آدمؑ کی تخلیق، ان کا جنت سے نکالا جانا، انبیاءؑ عظیم السلام کے قصص، جنت اور دوزخ، دنیوی اور ابدی زندگی کے تذکروں میں جو مماثلت ہے، اس کے مستشرقین نے یہ نتیجہ نکالا کہ حضورؐ نے تمام باتیں دوسرے مذاہب سے اخذ کیں، انھوں نے یہ بات بالکل نظر انداز کر دی ہے کہ خالق کائنات ایک ہے، انسانیت اور اس کی بنیادی ضرورتیں ایک ہیں، ابدی حقائق اور تمام انبیاء عظیم السلام کے ذریعہ نازل پیغام خداوندی اپنی اصلی شکل میں ایک ہے، اور اگر ہر نبی کے زمانے میں ان کی تالیف ہو جاتی، اور دوسری کتابوں میں تحریف، اضافہ، تغیر و تبدل نہ کیا گیا ہوتا تو مماثلت ہی نہیں، ان سب کی شکل ایک ہی ہوتی، اور صرف شریعت میں معاشرہ میں تدریجی ارتقار کے اعتبار سے تھوڑا بہت فرق ہوتا۔

ان تمام باتوں اور دلائل کے پیش نظر کوئی معمولی سمجھ کا آدمی بھی قرآن عظیم کے کتاب الہی ہونے سے انکار نہیں کر سکتا ہے، ہٹ دھرمی، بغض اور محرومی کی بات دوسری ہے،

مستشرقین نے اسلام پر یہ بھی الزام لگایا، کہ وہ صرف قضا و قدر پر زور دیتا ہے، اور انسان کی ذاتی فکر و کوشش کو سلب کر لیتا ہے، چنانچہ سرولیم میور کہتے ہیں، اسلام میں اللہ کا رشتہ دنیا کے ساتھ اس طرح ہے، کائنات کا اختیار اور ارادہ ختم ہو جاتا ہے، اور امید اور توقع اللہ کے آہنی شکنجہ میں ہلاک ہو جاتی ہے، اس طرح کہتا ہے کہ اسلام نے خدا کو دیکھا، انسان کو نہیں، اللہ کے حقوق جانے نگر انسان کے حقوق کو نہ جانا، اس نے جبر اور اقتدار دیکھا آزادی نہیں، اور اس وجہ سے ایک استبدادی ضابطہ بن گیا، جو سخت ہو کر آہنی ڈھانچہ بن گیا

اور بالآخر ہلاک ہو گیا،

یہ الزام سراسر بے بنیاد اور لغو ہے، اور صرف بغض اور عناد پر مبنی ہے، اسلام کے نظریات اور تاریخ کے خلاف ہے، اور جناب کلارک کی بدخواہی کے باوجود اسلام حیرت انگیز طریقہ سے پھیلتا گیا اور زمانہ اس کی طرف آرہا ہے اللہ تعالیٰ قادر مطلق ضرور ہے، اور کائنات کی ہر شئی تابع تقدیر ہے، اسی نے ہر شے کو اس کی صفت دی، اور اسی قانون سے وابستہ ہے، جو اس کے لئے اس نے مقرر کیا، انسان بہت حد تک تابع تقدیر ہے، مگر اس کو بہت حد تک آزادی بھی ملی ہے، ہر شخص کے ضمیر اور فطرت میں یہ تمیز دی گئی ہے کہ وہ اچھائی اور برائی میں تمیز کر سکے، اور اس کو نیکی کے راستے پر چلنے کی ہدایت دی گئی، مگر یہ اس پر ہے کہ وہ کون سا طریقہ اختیار کرتا ہے، اچھا اور بُرا، اس کے اچھے کی جزا اور برے کی سزا سے بھی آگاہ کر دیا گیا ہے، مگر اسے مجبور نہیں کیا گیا، کہ وہ کون سا راستہ اختیار کرتا ہے، تقدیر الہی کہیں کہیں ظم الہی سے متعلق ہے، جو ہر شے سے متعلق اللہ تعالیٰ کو پہلے سے ہے، کہ وہ کیا کرے گا، اور کہیں کہیں اس قانون سے جس کے تحت اس کی پیدائش، اس کی نمو، اس کی بقا اور اس کا وجود ہوا ہے۔

قرآن عظیم میں بے شمار ایسی باتیں ہیں کہ انسان کو خود کو شناس کرنی ہے اسے وہی ملے گا جو وہ کوشش کرے گا انسان کو اپنی عقل و فہم سے کام لے کر اور مظاہر قدرت کا بغور مشاہدہ کر کے گذشتہ قوموں کے واقعات اور انجام و عبرت لے کر خدا کی قدرت کو سمجھنا ہے، اور اس کی تابعداری اخلاص و انہماک سے کرنی ہے، اور اس سے اپنی امیدوں کو وابستہ کرنا ہے، جو اس کا سب سے بڑا دوست، نگہبان، پرورش کرنے والا، ہدایت دینے والا اور مہربان ہے، بطور نمونہ کے چند آیتیں لے لیجئے۔

سورہ ۵۳ کی ۲۶ آیت ہے کہ انسان کو وہی ملے گا، جس کے لئے وہ کوشش کرتا ہے، یا سورہ ۱۳ کی ۱۱ آیت کہ خدا کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا ہے، جب تک وہ خود اپنی حالت کو بدلتی نہیں ہے، یا سورہ ۶۲ کی ۲ آیت کہ جب نماز ختم ہو جائے تو خدا کی نعمت حاصل کرنے کے لئے زمین میں منتشر ہو جاؤ اور خدا کا ہمہ وقت خیال رکھو، تاکہ صلاح پاؤ،

ان مستشرقین کا یہی حال ہے جس کے متعلق قرآن نے پیشگی اعلان کر دیا ہے، ان کے دماغ ہے، مگر سوچے نہیں، انکے آنکھیں ہیں، مگر دیکھتے نہیں، ان کے کان ہیں مگر سنتے نہیں، (سورہ ۱۷، آیت ۱۷، اور جن لوگوں نے دنیا میں حقیقت سے

چشم پوشی کی وہ آخرت میں بھی اندھے اٹھیں، اور صحیح راستہ سے بہت دور ہوں گے (سورہ ۱۷۵-۱۷۴) قرآن انہی کو ہدایت دیتا ہے جو اس کے طلب گار ہیں،

جارج سیل  
Arberry Rodvell Richard Bell Dherry

Pipethall نے قرآن کے ترجمہ میں جو غلطیاں کی ہیں، ان کے چند نمونے میں نے اپنے انگریزی

کتابچہ میں پیش کیے ہیں۔ اس مختصر مقالہ میں انہیں دہرانا ممکن نہیں ہے، انہوں نے جو غلطیاں کی ہیں، وہ عبارت کی ہیں، اور عربی زبان، قرآن کے اسلوب بیان اور عربی محاوروں سے پوری واقفیت نہ ہونے کی وجہ سے کی ہیں

پکھتال کی غلطیاں ترجمہ میں اصل کی طرح موسیقیت و نغمہ لانے کی کوشش کی وجہ سے ہوئیں، اور کچھ عربی

محاوروں سے ناواقفیت کی بنا پر ہوئیں، اور وہ نے دیدہ و دانستہ اور بدنتی سے فاش غلطیاں کیں۔



## براؤن اور اسلام

از

ڈاکٹر امیر حسن عابدی شعبہ فارسی، دہلی یونیورسٹی

فارسی سے پہلے یورپ میں عربی کی ابتدا ہونے، جس کے ذریعے سے یونانی فلسفہ خاص کر ارسطو کے خیالات سب سے پہلے مغربی یورپ کو معلوم ہوئے، تیرہویں صدی عیسوی میں البرٹس میگنس نے فارابی اور ابن سینا کی کتابوں سے اخذ کر کے ارسطو کی تعلیمات کو پیرس میں پیش کیا، اسی صدی میں راجر بیکن اور ریمانڈل نے مشرقی زبانوں سے واقفیت حاصل کرنے پر زور دیا، تاکہ ان کے فلسفہ اور سائنس کا مطالعہ ہو سکے،

چودھویں صدی کے شروع میں پانچویں یورپ نے مختلف شہروں میں عربی وغیرہ کی پروفیسر شپ قائم کر دئی، مگر اس کا خیال رکھا گیا، کہ اس کے عیسائی مذہب کو کوئی نقصان نہ پہنچے، سو اسی صدی کے شروع میں باقاعدہ یورپ میں مشرقی علوم کا باقاعدہ چرچا اور رواج ہوا، آج دنیا پر مسلمانوں کا یہ احسان ہے کہ انھوں نے یونانی ہم دفنون کو زندہ رکھا، اور آج یورپ والے ان ہی کے عربی ترجموں سے استفادہ کر کے آگے بڑھے ہیں،

یورپ میں عربی، فارسی، وغیرہ جیسے مشرقی علوم کی طرف توجہ کرنے کے دو اسباب تھے، ایک تو یہ کہ ان زبانوں خاص کر عربی کے ذریعہ سے وہ یونان اور خاص کر سقراط افلاطون اور ارسطو وغیرہ کے فلسفہ کو سمجھ سکیں، دوسرا مقصد یہ بھی تھا کہ وہ اسلام، قرآن اور مسلمانوں میں طرح طرح کی خامیاں اور کمزوریاں دکھا کر ان پر کچھ اچھالیں، پھر بھی بہت ایسے مستشرقین جنھوں نے اسلام اور اسلامی علوم و فنون کا مطالعہ بڑی دیانتداری سے کر کے ان سے پورا پورا استفادہ کیا، اور مسلمانوں کی علمی دین کے معترف ہوئے پروفیسر ایڈورڈ جی براؤن کا شمار انھیں مستشرقین میں کیا جاتا ہے انھوں نے فارسی ادب کی تاریخ لکھنے میں مسلمانوں کی خدمات کا صحیح جائزہ لیا، اور اپنے کو ایک سچے ایماندار محقق کی حیثیت سے پیش کیا، انھوں نے ابن ہشام، الفخری، دینوی، بلاذری، مسعودی، یعقوبی وغیرہ کے حوالہ سے اپنی تحقیقات کی تکمیل کی وہ لکھتے ہیں کہ نوشیرواں کی شاندار حکومت (۵۳۱-۵۶۶ء) کے زمانہ میں سب سے زیادہ اہم اس کا

بالیسواں سال (۶۵۲-۳) حجے عرب عام الفیل کہتے ہیں، اسی سال ایک طرف تو ایران نے یمن کی سلطنت پر فتح پائی، مگر دوسری طرف مکہ معظمہ میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت ہوئی، جن کی تعلیمات کے نتیجے میں ساسانی سلطنت کا خاتمہ ہوا۔

یہاں یہ بھی لکھ دیا جائے کہ خسرو انوشیرواں (۶۵۳-۶۵۷ء) سخت قسم کا جاہل ظالم اور سفاک بادشاہ تھا، جس نے زرتشتی مذہب کے علاوہ کسی مذہب و ملت کو پسند نہیں دیا۔ بلکہ سب کا قلع قمع کر دیا۔ مزدک اپنے زمانہ کا کمیونسٹ تھا، ۶۲۸ء میں اس کا خاتمہ کر کے اس کی تحریک کو کچل کر رکھ دیا۔ عیسائیوں کو وہ بڑی حقارت سے دیکھتا تھا، مانی، آحسری، اشکانی بادشاہ اردوان کے چوتھے سال (۶۱۵-۱۶ء) میں پیدا ہوا، اس کے دین یعنی مذہب مانی کو زرتشتیوں نے کچلا، پھر بھی تیرہویں صدی تک اس کے ماننے والے موجود تھے، مگر زرتشتیوں کا اُس نے پورا احترام کیا، اور انھیں ہر طرح کی سہولتیں دیں، نیز ان کے لئے وہ بڑا مہربان اور عمدہ بادشاہ تھا، اسی لئے انھوں نے اسے نوشیرواں عادل کا خطاب دیا، جو آج ہماری روایتوں کا جز بن گیا ہے،

بہر حال ایک طرف تو براؤن نے نوشیرواں کو کٹر متشدد اور متعصب بتلایا ہے، مگر دوسری طرف اسے مامون الرشید اور اکبر جیسے بادشاہوں کا ہم پلہ قرار دیا ہے، اس لئے کہ اس نے سات، نو افلاطونی فلسفیوں کو جنھیں شہنشاہ جینین نے اپنے وطن سے نکال دیا تھا، پناہ دی، بہر حال پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کرتے ہوئے براؤن لکھتے ہیں کہ آپ کا کام بہت مشکل تھا، اس لئے کہ ریگستان عرب دل سے مادہ پرست اور تشکک تھے۔ انھیں ماوراء الطبیعیات اور الہیات سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، نیز انھیں ایسے خدا کی ضرورت نہیں تھی، جو طاقتور تو ضرور ہو مگر اُن سے خدمت اور نفی ذات کا خواہاں ہو،

براؤن کے نزدیک ہجرت (۶۲۲ء) سے لے کر حضرت عمرؓ کی وفات (۶۴۴ء) تک کا زمانہ مقدس اسلام کا سنہرا عہد ہے، جو فلسفی اسلام سے جدا اور الگ ہے،

ایران پر عرب حملہ کے باب میں براؤن نے ڈوزی کی کتاب کی بڑی تعریف کی ہے، اس سے ایک طویل عبارت نقل کی ہے، جس کے کچھ حصے یہاں دیئے جا رہے ہیں وہ لکھتا ہے :-

”ساتویں صدی کے پہلے نصف حصہ میں بیزنطینی اور ایرانی... حکومتیں مغربی ایشیا پر قبضہ کرنا چاہتی تھیں، بظاہر دونوں سلطنتیں ٹیکسوں کی وجہ سے بید خوش نظر آ رہی تھیں، اور اُن کی شان و

شوکت اور تعیش کی زندگی ایک مثل بن گئی تھی، لیکن اندر سے ایک مرض نے دونوں میں لگن لگا دیا تھا، لوگ مطلق العنانیت کے بوجھ کے نیچے دبے جا رہے تھے، دونوں شاہی خاندانوں نے مسلسل ہشت پھیلا رکھی تھی، اور مذہبی تعصب کی وجہ سے لوگوں کو اذیتیں دی جا رہی تھیں، کہ اچانک عرب کے ریگستان سے کچھ نئے لوگ نمودار ہوئے، جو اس سے قبل بے شمار قبیلوں میں بٹے ہوئے اور باہمی جنگ و خونریزی میں مبتلا تھے، مگر اب سب ایک ہو گئے تھے، یہی لوگ تھے جو آزاد، لباس و غذا میں سادہ شریف اور مہمان نواز اور سمجھدار تھے، لیکن اسی کے ساتھ وہ ایسے غیور اور خوددار، تند مزاج، انتقام خیز سخت دشمن سفاک اور ظالم بھی تھے، کہ دیکھتے دیکھتے قابل قدر، مگر بڑی گلی، ایرانی سلطنت کا خاتمہ کر دیا، قسطنطنیہ کے جانشینوں سے ان کے اچھے صوبے چھین لئے، ٹیونٹانسل کی حکومت کو اپنی قدموں سے کچل دیا، اور بقیہ یورپ میں ایک دہشت پھیلا دی، دوسری طرف ان کی فاتح فوجیں ہمالیہ میں داخل ہو گئی، پھر بھی یہ دوسرے فاتحوں کی طرح نہ تھے، اس لئے کہ یہ ایک نئے مذہب کی تبلیغ کر رہے تھے، ایرانیوں کی ثنویت اور بگڑی ہوئی عیسویت کے خلاف انھوں نے وحدت کا اعلان

کیا، جسے لاکھوں آدمیوں نے قبول کیا، اور جو آج بھی انسانوں کے دسویں حصہ کا مذہب ہے۔“

براؤن نے پیغمبر ﷺ کی زندگی، خلفائے راشدین کا عہد حضرت عثمان کے قتل، حضرت علی کی خلافت اور معاویہ کا اس سے انکار، جنگ صفین و جبل و نروان، خوارج، معاویہ کے ساتھ صلح اور امام حسن کی خلافت سے دست برداری، مزید، معرکہ کربلا، ابن زبیر اور مختار کی بغاوت، عبدالملک کی حکومت، حجاج کے مظالم، لوگوں کے بنی امیہ کے خلاف ہونے، بنی امیہ کے زوال کے اسباب، عمر بن عبدالعزیز اور بنی عباس کے پروپیگنڈے، ایرانیوں کا ان کے ساتھ ہونے ابو مسلم خراسانی، انقلابیوں کی آنکھ کھلنے، عباسی حکومت، برکیوں، نوروز کے تموار کے احیاء وغیرہ کا تفصیل سے جائزہ لیا ہے،

معتزلہ کے ذکر میں براؤن نے دو مشرق ڈوزی اور اسٹیر کا حوالہ دیا ہے، جنھوں نے ان کے متعلق بحث اور تحقیق کی ہے، براؤن کے خیال میں شروع ہی سے معتزلہ یونانی فلسفہ سے متاثر تھے، ان کا خیال ہے کہ عباسی خلیفہ متوکل (۸۴۷ء - ۸۶۱ء) کی تخت نشینی پر وہ سیاسی حیثیت سے ختم ہو گئے، لیکن ان کے دستان خیال کی تین سو سال



بعد بھی زرخیزی جیسے مفسر قرآن نے نمایندگی کی ہے، اس مستشرق نے متوکل کے عہد کو تقدیر پسندی کا زمانہ کہلاتے پھر بھی اشعریوں کے مقابلہ میں اس عہد کو ذہنی قابلیت کے لحاظ سے بلند قرار دیا ہے، اس مستشرق نے ابوالحسن اشعری کا ذکر کر کے ان کے بزرگ، ابو موسیٰ اشعریؒ کو بے عقل کہنا یاد کیا ہے،

اخوان الصفاء کو برادون نے غیر معمولی جماعت قرار دیا ہے، اس سلسلہ میں فلوگل اور ڈیڑسی جیسے مستشرقوں کے حوالے دے کر ان کا اچھا تعارف کر دیا ہے، ان کا خیال ہے کہ اخوان الصفاء نے معتزلہ کے کاموں کو آگے بڑھایا، اور انھوں نے سائنس اور مذہب، اسلام اور یونانی فلسفہ میں تطبیق کی اور تمام علوم کو ملا جلا کر ایک انسائیکلو پیڈیا پیدا کر دیا، برادون نے زرتشتیوں کے صاحب کتاب ہونے کے مسئلہ کو بھی اٹھایا ہے، اور اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جمشید کو حضرت سلیمانؑ بتلایا گیا ہے، اسی طرح کوردش کی قبر کو مسجد مادر سلیمان اور مرغاب کی ایک تاریخی یادگار کو تخت سلیمان کہا گیا ہے، ان کے خیال میں یہ سب اس لئے کیا گیا تھا کہ ابتدائے اسلام میں زرتشتی یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں سے اپنی قدر و قیمت میں اضافہ کروائیں، اور اپنے کو اہل کتاب کہلاوائیں، لیکن ابن مقفع جیسے دانشور نے بہت پہلے اس قسم کی باتوں سے انکار کیا ہے، حضرت عمرؓ کو مجوسیوں کے ساتھ اہل کتاب جیسا سلوک کرنے میں جھجک ہو رہی تھی، لیکن عبدالرحمن بن عوف نے ان سے کہا کہ میں نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے، کہ ان کے ساتھ وہی سلوک ہونا چاہیے جو اہل کتاب کے ساتھ ہوتا ہے،

ساسانی بادشاہ اپنے کو خدا کی طرف نامزد سمجھتے تھے، اور زرتشتیوں کے عقیدہ کے مطابق ان کو خداداد حقوق حاصل تھے، یہی عقیدہ اور اس قسم کے دوسرے زرتشتی اور ایرانی عقیدے مسلمانوں کے بعض فرقوں پر اثر انداز ہوئے ہیں، اگر علاوہ چونکہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ساسانی سلطنت کا خاتمہ ہوا، اس لئے ان کے خلاف ایرانی جذبات کا فرما تھے، اس کے خلاف ایرانیوں کے عقیدہ کے مطابق حضرت امام حسینؑ کی شادی یزدگرد سوم کی صاحبزادی شہربانو سے ہوئی، جن سے نو امام عالم وجود میں آئے، اس طرح بقیہ امام حضرت پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور ساسانی بادشاہوں کی اولاد سے ہوئے، اور وہ بھی خدا کی طرف سے امامت کے لئے نامزد ہوئے تھے، ایران میں حضرت شہربانو بڑے احترام سے دیکھی جاتی ہیں، ان کے نام سے ایک پہاڑ بھی ہے، جس کو کوہ بی بی شہربانو کہا جاتا ہے، اور جو تہران سے ۳۰ میل جنوب میں ہے، آگے چل کر برادون نے زندیق کی بحث اٹھائی ہے، جو دراصل مانی مذہب کے ماننے والے تھے، آٹھویں صدی

عیسوی کے اواخر میں وہ اتنے فعال ہو گئے تھے، کہ عباسی خلیفہ المردی (۶۵۷ء تا ۶۸۵ء) نے ایک مخصوص مفتش مقرر کیا جو زندیقیوں کا پتہ لگائے جو بظاہر اسلام کے مبلغ ہونے کا دعویٰ کرتے مگر درحقیقت مانی مذہب کا پروپیگنڈا کرتے تھے ان میں سے بعض کو اموی اور عباسی خلفائے نے قتل بھی کروا دیا تھا،

براؤن کے نزدیک ایران کی فتح کے بعد عربوں کے لئے زیادہ مشکل کام اسلام کے زرتشتی مذہب پر بتدریج غلبہ اور فتح حاصل کرنا تھا، عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے، کہ اسلامی فاتحین نے لوگوں کے لئے قرآن اور تلواریں کے علاوہ کوئی اور راستہ نہیں چھوڑا تھا، لیکن براؤن کے نزدیک یہ صحیح نہیں ہے، اس لئے کہ مجوسیوں، عیسائیوں اور یہودیوں کو اجازت دی گئی تھی، کہ وہ اپنے مذہب پر قائم رہ سکتے ہیں، البتہ انہیں جزیہ دینا ہو گا، ان کے نزدیک یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ زرتشتیوں پر کوئی خاص سختی کی گئی ہو یا ایران کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا گیا ہو، بلکہ بیشتر مذہب کی تبدیلی اختیار کی، عام طور سے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسلامی فتح کے بعد تین سو سال تک ایران ذہنی طور سے کورا تھا، لیکن براؤن کے

خیال میں یہ زمانہ نئے اور پرانے امتزاج اور خیالات کے حلول اور تنازع کا زمانہ ہے، سیاسی اعتبار سے ایران مستقل اور آزاد نہ رہا ہو، لیکن ذہنی اور عقلی میدان میں اس کی بلندی قائم رہی، اس لئے کہ علم کے ہر شعبہ میں ایرانیوں نے نمایاں حصہ لیا۔ براؤن نے اپنی کتاب میں سر ولیم میورڈاکسٹو ویل گولڈزبرگ وان والٹن اور دوسرے بہت سے مستشرقوں کا ذکر کیا ہے، جن سے انھوں نے استفادہ کیا ہے، اسی کے ساتھ ساتھ بہت سے اسلامی علماء کا بھی ذکر کیا ہے جن کے تبحر علمی اور دقت نظر کا انھوں نے اعتراف کیا ہے، ان میں سے ایک علامہ شبلی نعمانی بھی ہیں جن کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ جہاں تک میں فیصلہ کر سکتا ہوں، شروع سے لے کر سترہویں صدی کے آخر تک ممتاز فارسی شعراء کا سیر حاصل اور بہترین تبصرہ (انتہائی بد قسمتی سے) اردو یا ہندوستانی زبان میں لکھی ہوئی علامہ شبلی نعمانی جیسے ممتاز عالم کی شعرا لہجہ ہے۔“

اُن کی اس سخت رائے سے ہم میں یہ احساس ہونا چاہئے کہ ہمارے بزرگوں کے کارنامے بہتر سے بہتر شکل میں دنیا کے مستشرقین کے سامنے پیش کئے جائیں،

ضرورت ہے کہ علامہ شبلی نعمانی کی منتخب تصنیفات کو دنیا کی زبانوں خصوصاً انگریزی میں ترجمہ کیا جائے تاکہ دوسری زبانوں کے لڑکے بھی ان سے پورا پورا استفادہ کر سکیں،

## قرآن مجید میں قصہ ابراہیمؑ

اور

### مستشرقین کے اعتراضات

از

ضیاء الدین احسان

حضرت ابراہیم علیہ السلامؑ اٹھائیں اور بنی اسرائیل دونوں کے موزث اعلیٰ اور روحانی پیشوا تھے، اس لئے یہود، نصاریٰ اور مسلمان سب ہی انھیں پناہ دے رہے ہیں، تورات میں ان کی عظمت و تقدس اور ان کی نسل کی کثرت و برکت کی داستان کئی جگہ دہرائی گئی ہے، ذیل میں کتاب تکوین سے اس کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:-

”خداوند نے ابرام کو کہا تھا کہ تو اپنے ملک اور قرابتوں کے درمیان سے اور اپنے باپ کے گھر سے اس ملک میں جو میں تجھے دکھاؤں گا، نکل چل، اور میں تجھے ایک بڑی قوم بناؤں گا اور تجھ کو مبارک اور تیرا نام بڑا کروں گا اور تو ایک برکت ہوگا اور ان کو جو تجھے برکت دیتے ہیں برکت دوں گا، اور اس کو جو تجھ پر لعنت کرتا ہے لعنتی کروں گا، اور دنیا کے سارے گھرانے تجھ سے برکت پاویں گے“

(پیدائش ۱۲: ۱-۳)

دوسری جگہ ہے:

”خداوند نے ابرام سے کہا کہ اپنی آنکھ اٹھا اور اس جگہ سے جہاں تو ہے، اتر اور دکھن اور پورب اور چہم دیکھ کہ یہ تمام ملک جو تو اب دیکھتا ہے تجھ کو اور تیری نسل کو ہمیشہ کے لئے دوں گا، اور تیری نسل کو میں زمین کی خاک کے مانند بناؤں گا کہ اگر کوئی آدمی زمین کی خاک کو گن سکے تو تیری نسل بھی گنی جائے گی“

(پیدائش ۱۳: ۱۴-۱۶)



اسی کتاب میں آگے ایک اور باب میں ہے :

” اور خداوند کے فرشتے نے آسمان سے دوبارہ ابراہیم کو پکارا اور کہا کہ خداوند فرماتا ہے کہ چونکہ تو نے یہ کام کیا کہ اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے دریغ نہ رکھا، اس لئے میں نے بھی اپنی ذات کی قسم کھائی کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا، اور تیری نسل کو بڑھاتے بڑھاتے آسمان کے تاروں اور سمندر کی ریت کے مانند کر دوں گا اور تیری اولاد اپنے دشمنوں کے پھاٹک کی مالک ہوگی اور تیری نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی، کیونکہ تو نے میری بات مانی “ (پیدائش ۲۲ : ۱۵-۱۸)

ایک اور جگہ ہے :

” ابراہیم تو یقیناً ایک بڑی اور بزرگ قوم ہوگا، اور زمین کی سب قومیں اس سے برکت پائیں گی، کیونکہ میں اس کو جانتا ہوں، وہ اپنے بیٹوں اور اپنے بعد اپنے گھرانے کو حکم کرے گا اور وہ خداوند کی راہ کی نگہبانی کر کے عدل و انصاف کریں گے، تاکہ خداوند ابراہیم کے واسطے سے جو کچھ اس نے اس کے حق میں کہا ہے، پورا کرتے “ (تکوین باب ۱۸)

قرآن مجید میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی مسلمہ امامت و پیشوائی کا ذکر ان بلیغ لفظوں میں ہوا ہے، فرمایا:

قَالَ اِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا (خدا نے کہا بیشک میں تمہیں (ابراہیم کو) لوگوں کا پیشوا بناؤں گا۔)

(بقرہ : ۱۲۳)

نیز فرمایا :

وَلَقَدْ اصْطَفَيْنَاهُ فِي الدُّنْيَا وَاِنَّهٗ  
فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ (اور ہم نے اس (ابراہیم کو) برگزیدہ ٹھہرایا  
دنیا میں، اور وہ آخرت میں نیکو کاروں  
میں ہوگا۔)

(بقرہ : ۱۳۰)

ابراہیم کے لفظی معنی قوموں کے باپ کے ہیں، توراہ میں ان کو ابوالانبیاء (پیغمبروں کے باپ) کہا گیا ہے اور قرآن مجید سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ خدا نے ان کے خاندان کو بڑی برکت و وسعت عطا کی اور نسل ابراہیمی کی ساری شاخیں خوب پھلی پھولیں۔

قرآن مجید نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اسی عظمت و فضیلت کی بنا پر ملت ابراہیمی کے اتباع و اقتداء کی پُر زور تاکید اور اس سے سر مو انحراف و تجاوز کی سخت مذمت کی ہے، چنانچہ اسی حیثیت سے اس نے کفارِ قریش، یہود اور نصاریٰ سب کو دعوت دی کہ تم جن غلط راہوں پر پڑ گئے ہو، ان کو چھوڑ کر حضرت ابراہیمؑ کی بتائی ہوئی شاہراہ پر گامزن ہو جاؤ، ارشادِ باریؑ

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصَارًا تَهْتَدُوا  
اور انہوں نے کہا کہ یہودی یا نصرانی ہو جاؤ تو ہدایت  
قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا وَمَا كَانَ  
پاؤ گے کمدو (نہیں!) بلکہ ابراہیم کی ملت کی پیروی  
مِنَ الْمُشْرِكِينَ (بقرہ: ۱۳۵)

قرآن مجید سزاوت کے ساتھ بتاتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اور حضرت یعقوبؑ دونوں نے اپنے آخری وقت میں اپنی اولاد کو اسی ملت ابراہیمی کو اختیار کرنے کی وصیت و تلقین کی تھی:

وَوَصَّي بِهَا إِبْرَاهِيمَ بَنِيهِ وَيَعْقُوبَ  
یا بنی! ان اللہ اصطفیٰ لکم الدین فلا  
تَمُوتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُسْلِمُونَ اَمْ كُنْتُمْ  
شُهَدَاءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوبَ الْمَوْتَ  
اِذْ قَالَ لِبَنِيهِ مَا تَعْبُدُونَ مِن بَعْدِي  
قَالُوا نَعْبُدُ الْهَلِكِ وَاللّٰهَ اَبَانِكَ اِبْرَاهِيمَ  
وَاِسْمَاعِيلَ وَاِسْحٰقَ الْهَارِ اِحٰدًا  
وَمَنْ لَّهٗ مُسْلِمُونَ

اور ابراہیمؑ نے اسی ملت ابراہیمی (اسلام) کی وصیت اپنے بیٹوں کو کی اور اسی کی وصیت یعقوبؑ نے اپنے بیٹوں کو کی کہ اے میرے بیٹو! اللہ نے تمہارے لئے دین اسلام کو منتخب فرمایا تو تم نہ مرنا مگر اسلام کی حالت پر، کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ کی موت کا وقت آیا؟ جب کہ اس نے اپنے بیٹوں سے پوچھا تم میرے بعد کس کی پرستش کرو گے؟ وہ بولے کہ ہم تیرے معبود اور تیرے آباء و اجداد ابراہیمؑ و اسماعیلؑ و اسحاقؑ کے معبود کی پرستش کریں گے جو ایک ہی معبود ہے

(بقرہ: ۱۳۲ و ۱۳۳) اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں۔

قرآن مجید نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ حضرت یعقوب علیہ السلام کی وصیت کا ذکر خصوصیت سے اسی بنا پر کیا ہے کہ بنی اسرائیل براہ راست ان ہی کی اولاد تھے، اور جب انہوں نے اپنی اولاد کو یہودیت و نصرانیت کے

بجائے ملت ابراہیمی اور توحید و اسلام کی تلقین و وصیت اپنی زندگی کے بالکل آخری لمحے میں کی تھی تو سمجھ لو کہ تم لوگوں کا حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ (یعقوبؑ) کو یہودی و نصرانی کننا صریح زیادتی اور اللہ تعالیٰ پر گھلا ہوا بہتان ہے۔

أَمْ تَقُولُونَ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ

وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ كَانُوا

هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ قُلْ ءَأَنْتُمْ أَعْلَمُ أَمِ

اللَّهُ، وَمَنْ أَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةَ

عِنْدَ اللَّهِ مِنَ اللَّهِ.

کیا تم کہتے ہو کہ ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ

اور ان کی ذریت کے لوگ یہودی یا نصرانی تھے

پوچھو! تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ ان سے بڑھکر

ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ کی کسی شہادت کو جو

ان کے پاس ہے، چھپائیں۔

(بقرہ: ۱۳۰)

قرآن مجید ملت ابراہیمی سے بیزاری اور برکشتگی کو سفاہت اور بے وقوفی قرار دیتا ہے، ارشاد ہے:

اور بھلا کون ملت ابراہیمی سے بے رغبتی اختیار

کرے گا، مگر وہی جو اپنے کو حماقت میں مبتلا کریگا

وَمَنْ يَرْغَبُ عَنْ مِلَّةِ إِبْرَاهِيمَ إِلَّا

مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ (بقرہ: ۱۳۰)

اس نے مشرکین عرب، یہود و نصرانی سب کو ملامت و تنبیہ کی کہ آخر تم اپنے غلط آراء و اقوال کی سند کے لئے

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا کیوں حوالہ دیتے ہو، وہ یہودی و نصرانی اور مشرک نہ تھے، بلکہ مسلم حنیف تھے، یہودیت و

نصرانیت کے شاخسانے تو ان کے بعد کھڑے کئے گئے ہیں، پھر ان کی تائید و حمایت کے لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام

کا نام کیوں لیتے ہو؟ ان کے ساتھ نسبت و قربت کے حقدار تو وہ لوگ ہو سکتے ہیں جو ان کی ملت کی پیروی کرتے ہیں تو راہ

و انجیل تو حضرت ابراہیمؑ کے صدیوں بعد نازل ہوئی ہیں، پھر انہیں یہودیت یا نصرانیت کا کس طرح علم بردار قرار دیتے ہو؟

حضرت اسماعیل علیہ السلام ان ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے فرزند اکبر اور حضرت ہاجرہ کے لطن سے تولد ہوئے

تھے، جنہیں اور ان کی والدہ ماجدہ کو انھوں نے مکہ کی وادی غیر ذی زرع میں لاکر بسایا، اور ان کی نسل کے لئے برکت

کی دعا کی، حضرت ابراہیمؑ کی دعا کی، قبولیت کا یہ اثر ہوا کہ حضرت اسماعیلؑ کی نسل کو خوب فروغ ہوا، مگر نبی اسرائیل

کو اپنے عم زاد بھائیوں سے ہمیشہ رشک و حسد رہا، اس لئے ان کی عزت، عظمت، فضیلت، برتری، سیادت اور

وسعت و کثرت برابر ان کی نگاہ میں کھٹکتی رہی، پیغمبر آخر الزماں کی بعثت کو صحف یہود کی عین پیشین گوئیوں کے



مطابق ہوئی تھی اور یہود کو آپ کی بعثت کا انتظار بھی تھا، مگر جب آپ تشریف لائے تو انہوں نے آپ کی تکذیب کر دی اور اصل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ بنی اسرائیل کی دنیاوی سیادت و وجاہت اور سیاسی قوت و اقتدار کے ختم کی تمہید و اعلان تھی، چنانچہ آپ کے بعد ان سے ہر قسم کا اغزاز چھین لیا گیا اور بنی اسرائیل کو امامت کا منصب عطا نہیں کیا گیا، اسی لئے اسرائیل کو ان سے اور مسلمانوں سے شدید نفرت و بیزاری ہو گئی اور انہوں نے ان کی عزت و عظمت کو خاک میں ملانے کا منصوبہ بنایا، حضرت اسماعیلؑ کے حسب نسب پر ایک اعتراضات ان کے بجائے حضرت اسحاقؑ کو ذبح ثابت کرنے کی کوشش، خانہ کعبہ کے بجائے بیت المقدس کو ملت ابراہیمی کا قبلہ قرار دینا، حج و قربانی کی مختلف یادگاروں کو مٹانا، یہاں تک کہ خود حضرت ابراہیمؑ کو یہودیت و نصرانیت کا علمبردار سمجھا اسی سلسلہ کی کڑھی ہیں، قرآن مجید میں ان کی طرح کی تحریف و تلبیس کا متعدد جگہ ذکر ہوا ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔

اس تمہید سے یہ بتانا مقصود تھا کہ حضرت ابراہیمؑ اور ان کی اسماعیلی نسل عربوں اور مسلمانوں کے معاملہ میں اہل کتاب کا رویہ شروع ہی سے معاندانہ رہا ہے، اب بعض مستشرقین بھی ان ہی کے نقش قدم پر گامزن ہو کر حضرت ابراہیمؑ اور ان کی اسماعیلی نسل اور مسلمانوں کے معاملہ میں اسی طرح کی بے سرو پابا تیں کر رہے ہیں جو ان کے پیش روؤں نے کیں، ان کی اس کاوش کا مقصد حضرت اسماعیلؑ، ان کی نسل عربوں اور مسلمانوں نیز خانہ کعبہ کا حضرت ابراہیمؑ سے رشتہ و تعلق منقطع کر دینا ہے، چنانچہ اسپرنگر لکھتے ہیں:

”حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کا تذکرہ قرآن مجید میں جس طور پر کیا گیا ہے، اس کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا

ہے کہ مختلف مراحل سے گذرتی ہوئی آخر میں اس نے موسیٰ کعبہ کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔“

سنوک نے اسپرنگر کے اس دعویٰ کو مزید شرح و بسط کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے:

”قدیم اور ابتدائی وحی یعنی کی سورتوں مثلاً ذاریات، حجر، صافات، النعام، ہود، مریم، انبیاء اور عنکبوت

وغیرہ میں حضرت ابراہیمؑ کے تذکرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نام پیغمبروں کی طرح ایک رسول تھے، جو اپنی قوم کو ڈرانے کے

لئے بھیجے گئے تھے، ان سورتوں میں حضرت اسماعیلؑ و حضرت ابراہیمؑ کے درمیان کسی رشتہ کی کوئی صراحت نہیں کی گئی ہے، بلکہ

ان سے تو پتہ چلتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اللہ نے کسی پیغمبر کو عربوں کے اندر مبعوث ہی نہیں کیا تھا، چنانچہ

ایک جگہ فرمایا:

وَمَا آتَيْنَاهُمْ مِنْ كُتُبٍ يَدْرُسُونَهَا  
وَمَا أَرْسَلْنَا إِلَيْهِمْ قَبْلَكَ مِنْ نَذِيرٍ  
اور ہم نے نہیں دیں ان کو کچھ کتابیں جن کو وہ  
پڑھتے ہوں، اور نہیں بھیجا ان کے پاس تجھ سے  
پہلے کوئی ڈرانے والا۔  
(بار: ۲۲)

دوسری جگہ ارشاد ہے:

لَتُنذِرَ قَوْمًا مَّا أُنذِرَ آبَاءَهُمْ  
فَهُمْ غَافِلُونَ (یس: ۶)  
تاکہ تو ڈرائے ایک ایسی قوم کو جن کے آباء  
کو نہیں ڈرایا گیا تھا، سو وہ غافل ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ ان سورتوں کے اندر اس کا کوئی ذکر نہیں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ خانہ کعبہ کے بانی اور اولیٰ المسلمین تھے، لیکن مدنی سورتوں میں معاملہ اس کے برعکس ہو گیا ہے، چنانچہ ان میں حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کے بعض ایسے گوشے اور پہلو نظر آتے ہیں جن کا کوئی وجود نہ تھا، مثلاً ان میں ان کو مسلم حنیف کہا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ وہ ملت ابراہیمی کے داعی و بانی تھے، اور انہوں نے حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ مل کر خانہ کعبہ کی تعمیر کی تھی، اس مفہوم کی آیتیں مدنی سورتوں میں بکثرت ہیں، مثلاً سورہ بقرہ میں فرمایا:

وَإِذْ يَرْفَعُ إِبْرَاهِيمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ  
الْبَيْتِ وَإِسْمَاعِيلُ (بقرہ: ۱۲۵)  
اور جب ابراہیم و اسماعیل بیت اللہ کی بنیادیں  
اٹھائی کر رہے تھے۔

اس اختلاف و تضاد کا سبب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کی دور میں یہودیوں پر مکمل اعتماد تھا، لیکن جب آپ نے مدینہ منورہ میں انہیں اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے ضد و عناد کی راہ اختیار کی اور وہ آپ کی عداوت و مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے، اس صورت حال کے نتیجے میں رسول اللہ کو اب ان کی جگہ دوسرے مددگاروں کی تلاش ہوئی، اس موقع پر آپ نے اپنی ذہانت اور اصابت فکر و رائے سے کام لیکر عربوں کے سامنے ان کے ابوالآباب حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کا ایک نیا رخ پیش کیا، تاکہ اس طرح آپ اپنے زمانہ کی یہودیت سے دامن کش ہو کر ایک ایسے دین کو پیش کر سکیں جس کا تعلق یہودیت ابراہیمؑ سے جوڑ دینا ممکن ہو، چنانچہ جب تمام مکہ آپ کی دعوت کے سامنے سرنگوں ہو گیا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کے معمار کی حیثیت اختیار کر لی۔

اس اعتراض میں قرآن مجید اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مدفن بنایا گیا ہے، اور اس کے اندر متعدد بے سرو پا باتیں بھی آگئی ہیں، لیکن ہماری گفتگو ان ہی امور تک محدود رہے گی، جن کا تعلق حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ اور بنی اسماعیل سے ہے، ہم فردوس کی کتابوں کے علاوہ عبد الوہاب بخاری کی قصص الانبیاء سے زیادہ مدد لی ہے،

اس اعتراض کا خاص منشا یہ ثابت کرنا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ سے نہ عربوں اور مسلمانوں کا کوئی نسلی و نسبی تعلق تھا اور نہ ان سے ان کا کوئی دینی و مذہبی رشتہ تھا، اس لئے مسلمانوں کا انہیں اپنا روحانی و مذہبی پیشوا ماننا اور عربوں کا انہیں اپنا خاندانی مورث اعلیٰ تسلیم کرنا غلط ہے، کیونکہ آنحضرتؐ کی زندگی میں حضرت ابراہیمؑ اور ان کی ملت سے آپؐ اور آپؐ کے دین کے تعلق کی کوئی صراحت قرآن مجید میں موجود نہیں ہے، اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کے خانہ کعبہ کے بانی اور معمار ہونے اور خود کعبہ کی مرکزیت و اہمیت کا بھی کوئی آیتوں میں کوئی ثبوت موجود نہیں ہے، البتہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت ابراہیمؑ سے نسبی و مذہبی تعلق قائم کرنے کے لئے کئی احوال مدنی زندگی میں اس لئے ہوا کہ یہود نے آپؐ کی شدید مخالفت شروع کر دی تھی دونوں فاضل مشرقین نے اسلئے اور بنیادی غلط فہمی یہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دور میں یہود پر کئی اعتقاد کرتے تھے، حالانکہ یہ سب سے غلط ہے، اگر اس میں کچھ حقیقت ہے تو وہ صرف اس قدر ہے کہ آپؐ مکہ اور مدنی دور میں بھی ان امور کے بارہ میں جن کے متعلق آپؐ کو کوئی وحی نہیں کی گئی تھی، یہود کی شریعت کے مطابق اس بنا پر عمل کرتے تھے کہ وہ اہل کتاب تھے اور اللہ تعالیٰ نے ایسے امور کے بارہ میں ان ہی کی شریعت پر عمل کرنے کی آپؐ کو ہدایت کی تھی، چنانچہ جب تک آپؐ کو خانہ کعبہ کو قبلہ بنانے کا حکم نہیں دیا گیا تھا، اس وقت تک آپؐ بیت المقدس کی جانب ہی رخ کر کے نماز پڑھتے تھے، کیونکہ اولاً تو یہی یہود کا قبلہ تھا، ثانیاً خود مسلمانوں کے نزدیک بھی اس کی اہمیت اور تقدس پوری طرح مسلم تھا، لیکن اس قسم کی چند مثالوں سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دور میں یہود پر مکمل اعتقاد کرتے تھے، مسلمانوں کے بدترین مخالف بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت و تبلیغ میں یہود کا سہارا لیا ہو، یا ان پر کسی قسم کا اعتقاد کیا ہو، بلکہ واقعات تو اس کے برعکس یہ ثابت کرتے ہیں کہ کئی دور میں مسلمانوں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہود سے کوئی خاص واسطہ ہی نہ تھا، ان سے جو کچھ سابقہ پیش آیا وہ مدنی دور میں آیا، اسی زمانہ میں آپؐ نے ان سے اخوت اور دوستی کا معاہدہ بھی کیا، تاکہ ان کی جانب سے مطمئن ہو کر مشرکین مکہ کے حملے کا مقابلہ کر سکیں، لیکن جب یہود نے معاہدہ کا پاس دیکھا نہیں رکھا اور وہ درپردہ اور کھلم کھلا آپؐ کی مخالفت کرنے لگے بلکہ مشرکین سے ساز باز کر کے ان کی مدد بھی کر ڈنگے



تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان کی جانب سے چوکنا ہو گئے۔

رہی کئی زندگی تو اس میں یہود سے موالات اور ان پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی طرح کے اعتماد کرنے کی کوئی مثال نہیں ملتی، اور ہندی دور کے موالات کا جو انجام ہوا وہ ظاہر ہے، اور اسی کے نتیجے میں قرآن نے یہود کی اس مستقل جلی صفت اور طبی خصوصیت کی اس طرح نشاندہی کی ہے:

اتَّجِدَنَّ أَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِلَّذِينَ  
آمَنُوا الْيَهُودَ وَالَّذِينَ أَشْرَكُوا.

تم اہل ایمان کا دشمنی میں سب سے زیادہ سخت  
یہود اور مشرکین کو پاؤ گے

(ائدہ : ۸۲)

یہی نہیں، بلکہ عربوں کو بھی یہود پر کبھی کوئی اعتماد و اعتبار نہیں رہا، بلکہ ان کی تاریخ کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ آپ کی بعثت سے قبل بھی یہود کی قربت، تعلق، ہم نشینی، مجاہدت اور مجاورت کو ناپسند کرتے تھے اور انہیں عرب کی سرزمین سے نکالنے اور جلا وطن کرنے کے لیے ان سے برابر لڑتے بھڑتے رہتے تھے، قرآن مجید سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں عربوں اور یہودیوں کے درمیان معرکہ جنگ و جدال برپا رہتا تھا، اس کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل یہود آپ کی آمد کا بے چینی سے انتظار کر رہے تھے، تاکہ آپ کے ذریعہ مشرکین پر فتح و غلبہ حاصل کر سکیں

وَلَمَّا جَاءَهُمْ كِتَابٌ مِّنْ عِندِ اللَّهِ  
مُبَآرَكٌ لَّسَّمَعَهُمْ وَكَانُوا مِنْ قَبْلُ  
يَسْتَفْتِحُونَ عَلَى الَّذِينَ كَفَرُوا فَلَمَّا  
جَاءَهُمْ مَّا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ فَلَعْنَةُ  
اللَّهِ عَلَى الْكٰفِرِينَ

اور جب آئی ان کے پاس ایک کتاب اللہ کے  
یہاں سے ٹھیک ان مشین گونیوں کے مطابق  
جو ان کے یہاں موجود ہیں، اور وہ پہلے سے کافروں  
کے مقابلہ میں فتح کی دعائیں مانگ رہے تھے، تو  
جب آئی ان کے پاس وہ چیز جس کو وہ جلنے پھانسی  
ہوئے تھے تو انہوں نے اس کا انکار کر دیا، پس

ان منکروں پر اللہ کی ٹھیکاری ہے۔

(بقرہ : ۸۹)

اس آیت کی تفسیر میں علامہ ابن جریر نے ابوالعالیہ سے یہ روایت کی ہے:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے یہود  
 آپ کے ذریعہ کفار عرب فتح پانے کے آرزو مند  
 تھے، اور کہتے تھے اے اللہ اس نبی کو مبعوث کر  
 جس کا ذکر ہم کو توراہ میں ملتا ہے، تاکہ وہ انہیں  
 عذاب دے اور قتل کرے مگر جب اللہ نے محمدؐ کو  
 مبعوث کیا تو انہوں نے یہ سمجھ کر کہ اس نبی کی  
 بعثت ان کے اندر سے نہیں ہوئی، نیز عربوں پر  
 رشک و حسد کی وجہ سے اس کا انکار کر دیا، حالانکہ  
 انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ یہ خدا کے رسول میں  
 اور توراہ میں ان کا ذکر بھی موجود ہے، چنانچہ جب  
 آپ تشریف لائے تو انہوں نے آپ کا انکار کر دیا

كَانَتِ الْيَهُودُ تَسْتَفْتِمُ بِمُحَمَّدٍ صَلَّى  
 عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى كِفَارِ الْعَرَبِ مِنْ  
 قَبْلِ وَقَالُوا اللَّهُمَّ اَبْعَثْ هَذَا النَّبِيَّ  
 الَّذِي نَجِدُ فِي التَّوْرَةِ يَعَذِّبُهُمْ  
 وَيَقْتُلُهُمْ فَلَمَّا بَعَثَ اللَّهُ مُحَمَّدًا صَلَّى  
 عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَرَأَوْا أَنَّهُ يَبْعَثُ مِنْ  
 غَيْرِهِمْ كَفَرُوا بِهِ حَسَدًا لِلْعَرَبِ وَ  
 هُمْ يَعْلَمُونَ أَنَّهُ رَسُولُ اللَّهِ صَلَّى  
 عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَجِدُونَهُ مَكْتُوبًا  
 عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَةِ فَلَمَّا جَاءَهُمْ  
 بِمَا عَرَفُوا كَفَرُوا بِهِ .

(تفسیر ابن جریر طبری ج ۱، ص ۱۳)

مصر کے مشہور عالم محمد فرید وجدی لکھتے ہیں :

حضرت ابراہیمؑ سے تعلق قائم کرنے کا خیال تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مدینہ کے بجائے مکہ معظمہ ہی میں ہونا چاہیے  
 تھا، کیونکہ وہاں کا ہر قبیلہ حضرت ابراہیمؑ سے اپنا انتساب کرتا تھا، اس کے برخلاف مدینہ کے اکثر قبائل یمنی تھے، جو حضرت  
 ابراہیمؑ سے اپنا رشتہ ناطہ نہیں جوڑتے تھے،  
 (حاشیہ دائرۃ المعارف الاسلامیہ ص ۲۹)

سنوگ نے اسی ضمن میں ایک نہایت لغو اور بے بنیاد بات یہ بھی کہی ہے کہ آپ نے اپنے زمانہ کی یہودیت کو رد کر  
 ایک نئی یہودیت کی داغ بیل ڈالی اور اسے حضرت ابراہیمؑ کی جانب منسوب کر دیا، حالانکہ جب یہودیت کا تعلق  
 حضرت یعقوبؑ سے ہے اور یہود اپنے دین کو حضرت ابراہیمؑ کے بجائے ان ہی کی جانب منسوب کرتے تھے، اسی لئے وہ  
 اپنے کو بنی اسرائیل کہلانا پسند کرتے تھے تو راجح یہودیت کا تعلق حضرت ابراہیمؑ سے کس طرح ہو سکتا ہے، اور حضرت  
 ابراہیمؑ کو یہودی کہنا کس قدر مضحکہ خیز بات ہے، حضرت یعقوبؑ تو ان کے پوتے تھے، ایسی صورت میں حضرت ابراہیمؑ

کا دین اپنے پوتے کے دین کے تابع کس طرح ہو سکتا ہے، اسی لئے قرآن مجید نے نہایت صراحت کے ساتھ کہا ہے:

مَا كَانَ اِبْرَاهِيْمُ يَهُودِيًّا وَلَا نَصْرَانِيًّا  
وَلَا لَكِن كَانَ حَنِيفًا مُّسْلِمًا وَمَا كَانَ  
مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (آل عمران: ۶۷)

یہودیت و نصرانیت دونوں حضرت ابراہیمؑ کے بعد کی پیداوار ہیں:

لَمَّا تَخَاجَوْْنَ فِيْ اِبْرَاهِيْمَ وَمَا اَنْزَلَتْ  
التَّوْرَةَ وَالْاِنْجِيْلَ اِلَّا مِنْ بَعْدِهَا  
اَنْتَلَّ تَعْقِلُوْنَ

(اسے اہل کتاب! تم ابراہیمؑ کے بارہ میں کیوں

جھٹ کرتے ہو، دراصل حالیکہ توراہ اور انجیل اگر

بعد نازل کی گئی ہیں، کیا تم لوگ (اس بات کو)

نہیں سمجھتے۔

(آل عمران: ۶۵)

درحقیقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی اور کسی دوسری نبیؑ کی یہودیت سے تعلق قائم کرنے کا خیال سرے سے نہیں

ہوا، کیونکہ قرآن مجید کا نقطہ نظر تو یہ ہے کہ اسلام قدیم دین ہے، اس کی دعوت حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ حضرت  
موسیٰ اور حضرت عیسیٰؑ وغیرہ تمام نبیوں نے دی تھی، اور اسی کی دعوت دینے کے لئے آنحضرتؐ بھی تشریف لائے تھے، فرمایا:

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّينِ مَا وَصَّى بِهِ  
لُوحًا وَالَّذِيْ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ وَمَا وُصِّينَا  
بِهِ اِبْرَاهِيْمَ وَمُوسٰى وَعِيسٰى اَنْ  
اَقِيْمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ

(اللہ نے تمہارے لئے اسی دین (اسلام) کو مقرر

کیا جس کی وصیت نوحؑ کو کی تھی اور جس کی ہم نے

تیری طرف وحی کی ہے، اور جس کی ہم نے ابراہیمؑ کو

اور عیسیٰؑ کو وصیت کی تھی، وہ یہ کہ دین کو قائم رکھنا

اور اس میں پھوٹ نہ ڈالنا۔

(الشوریٰ: ۱۳)

بھلا ایسی صورت میں آپ اسلام کو چھوڑ کر یہودیت سے کیوں وابستہ ہوتے۔

حضرت ابراہیمؑ چونکہ بنی اسرائیل دینی اصحاب کے مسلمہ خاندانی دروہانی پیشوا تھے، اس لئے یہود، نصاریٰ اور

مشرکین تینوں ہی اپنی اپنی تائید کے لئے ان کے نام کو استعمال کرتے تھے، اور ان میں سے ہر ایک ان کو اپنے طریقہ پر بتاتا تھا کہ

اور کتنا تھا کہ اصل دین ابراہیمی کا حال وہی ہے، اور محمدؐ اسے اس کے اصلی دین سے ہٹا کر گمراہ کرنا چاہتے ہیں، قرآن مجید کا مقصد



ان کے اسی غلط اور گمراہ پروپیگنڈے کی تردید ہے کہ ثوراة و انجیل تو حضرت ابراہیمؑ کے صدیوں بعد نازل ہوئی ہیں پھر وہ یہودی یا نصرانی کس طرح ہوئے، یہ تو سراسر حماقت اور بے وقوفی کی بات ہے کہ یہودیت و نصرانیت کو ان کی جانب منسوب کیا جائے، حالانکہ وہ ان کے بہت بعد کی وضع و ایجاد ہیں، دراصل ابراہیمؑ علیہ السلام نہ یہودی و نصرانی تھے اور نہ مشرک تھے، بلکہ مسلم حنیف تھے،

رہا یہ اعتراض کہ قرآن مجید کی مکی و مدنی سورتوں میں حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت اور تصویر یکساں نہیں ہے، کیونکہ مکی دور میں ان کی حیثیت عام رسولوں جیسی بیان کی گئی ہے اور مدنی دور میں ان کو دین حنیفی کا داعی اور خانہ کعبہ کا بانی و مؤسس بتایا گیا ہے، تو مندرجہ ذیل تجزیہ کے بعد اس کا لغو و بے بنیاد ہونا اچھی طرح ظاہر ہو جائے گا۔

قرآن مجید کی مکی و مدنی سورتوں کے اسلوب و طرز بیان میں اس اعتبار سے ضرور فرق ہے کہ مکی سورتوں میں عموماً اجال و اختصار ہوتا ہے اور مدنی سورتوں میں بسط و تفصیل سے کام لیا گیا ہے، مکی سورتوں میں بنیادی عقائد اور مسلمات بیان کئے گئے ہیں اور اسی حیثیت سے استدلال کا پیرایہ بھی اختیار کیا گیا ہے، اس کے برعکس مدنی سورتوں میں احکام، فروع اور جزئیات کا بھی ذکر ہے، جن کے دلائل کا طریقہ و انداز بھی جداگانہ ہے، مکی دور میں اصل مخاطب کفار قریش تھے، اور مدنی دور میں یہود و نصاریٰ سے بھی خطاب ہے، قرآن مجید کے اسلوب کی ایک نمایاں خصوصیت موقع و محل، اقتضائے حال اور مخاطب کے ذوق و مزاج کی رعایت بھی ہے، اس لئے اس کی ہر سورہ میں اس کے موضوع اور موقع کے لحاظ سے بھی فرق ہوتا ہے، حضرت ابراہیمؑ علیہ السلام کی سرگذشت کے مختلف حصے مختلف سورتوں میں بیان کئے گئے ہیں اور ہر جگہ موقع و محل، اقتضائے حال اور موضوع سورہ کے لحاظ سے اس میں کچھ حزن و اضاہ اور فرق ہے، یہ قرآن کا عام اور معدون اسلوب ہے کہ وہ ایک ہی واقعہ کو مختلف جگہ بیان کرتا ہے، مگر ہر جگہ اس کی نوعیت بدلی ہوئی ہوتی ہے اور اسی اعتبار سے جس جگہ اس کا جس قدر حصہ بیان کرنا ضروری اور موزوں ہوتا ہے اسی کو وہاں بیان کرتا ہے اور باقی اجزا کو چھوڑ کر آگے بڑھ جاتا ہے، تاکہ خواہ مخواہ کا اطناب و طول بیان نہ ہو اور مخاطب فضول اور بے موقع باتوں میں الجھ جانے کی وجہ سے اصل مقصد ہی سے غافل ہو جائے، حضرت ابراہیمؑ اور دوسرے انبیاءؑ کے واقعات و قصص میں اسی اصول کو مدنظر رکھا گیا ہے، جس کو نظر انداز کر دینے کی وجہ سے ظاہر ہیں لوگوں کو ان میں فرق و اختلاف دکھائی دیتا ہے۔

قرآن مجید کے اس اسلوب کو مدنظر نہ رکھنے کی وجہ سے ان مستشرقین کو یہ خیال ہو گیا، یا انھوں نے خواہ مخواہ کے لئے

یہ غلط فہمی پیدا کی کہ مدنی سورتوں میں سیدنا ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کے جو جلوے نظر آتے ہیں ان کا کی سورتوں میں وجود نہیں۔

یہ بات بھی صحیح نہیں ہے کہ کی سورتوں میں نہ حضرت ابراہیمؑ کے خانہ کعبہ اور حضرت اسماعیلؑ سے تعلق کی کوئی صراحت کی گئی ہے اور نہ انھیں ملت ابراہیمی کا داعی اور سلم حنیف وغیرہ کہا گیا ہے، قرآن مجید کی ایک سورہ تو خاص ان ہی کے نام سے موسوم ہے اور یہ کی ہے، مگر ان فاضل مستشرقین نے سورہ ابراہیم کا نام ہی اپنی فرست میں درج نہیں کیا ہے، اس میں حضرت ابراہیمؑ کی ایک دعا کا ذکر ہے، اس سے ان کی شخصیت کے مندرجہ ذیل پہلو سامنے آتے ہیں:

(۱) حضرت ابراہیمؑ خدا سے دعا کرتے ہیں کہ مکہ کی سرزمین کو گوارا امن بنا:

رَبِّ اجْعَلْ هَذَا الْبَلَدَ آمِنًا  
خداوند! تو اس شہر کو پر امن بنا۔

(ابراہیم: ۳۵)

(۲) وہ اللہ تعالیٰ سے اس کی درخواست کرتے ہیں کہ انھیں اور ان کی اولاد کو شرک و بت پرستی سے محفوظ رکھو:

وَاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَعْبُدَ الْأَصْنَامَ  
(خداوند!) تو مجھے اور میری اولاد کو بتوں

کی پرستش سے بچا۔

(ابراہیم: ۳۵)

(۳) حضرت ابراہیمؑ خدا کے مقدس گھر کے پاس بے آب دگیاہ سرزمین میں اللہ واحد کی عبادت نماز، نذر و قربانی اور طواف و حج کی ادائیگی کے لئے اپنی اولاد حضرت اسماعیلؑ کو بانے کا اعتراف کرتے ہیں، اور ان کی رزق رسانی کے لئے اللہ سے دعا کرتے ہیں:

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بُوَادٍ  
خداوند! میں نے اپنی اولاد میں سے بعض راہیں

اور ان کی ذریت) کو اس بن کھیتی کی سرزمین میں تیرے

غیر ذمی زرعیہ عند بیتک المحرم

حرمت والے گھر کے پاس بسایا ہے، اے ہمارے

رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً

خداوند! اس لئے کہ یہ نماز قائم کریں، پس لوگوں کے

مِنَ النَّاسِ تَهْوِي إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ

دل ان کی جانب مائل کر دے (یعنی لوگ ان کی پاس

مِنَ الثَّمَرَاتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ

تیرے گھر کی زیارت کے لئے آئیں) اور انھیں پھل

(ابراہیم: ۳۴)

میں سے رزق دے تاکہ وہ شکر گزار ہوں۔

(ابراہیم : ۳۷)

(۴) حضرت ابراہیمؑ اس امر پر خداوند قدوس کی شکر گزاری کرتے ہیں کہ اس نے انہما کے دینی مشن اور ذات ابراہیمی کی تکمیل کے لئے ان کو بڑھاپے میں دو بیٹے اسماعیل و اسماعیل عطا کیے۔

سارا شکر اس اللہ کے لئے ہے جس نے مجھ کو بڑھاپے

الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي وَهَبَ لِي عَلَى الْكِبَرِ

میں اسماعیل و اسماعیل کو بخشا، بیشک میرا خداوند

إِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ إِنَّ رَبِّي لَسَمِيعٌ

پکار سننے والا ہے۔

(ابراہیم : ۳۹)

(۵) وہ خدا سے اپنے اور اپنی اولاد کے لئے ملت حنیفی کے خاص شعار نماز کو قائم کرنے کی توفیق طلب کرتے ہیں

جس کو یہود نے سر سے سے ضائع کر دیا تھا، اور نصاریٰ نے اس کی حقیقت و روح مسخ کر ڈالی تھی:

خداوند! مجھے اور میری اولاد کو نماز قائم کر لیا

رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلَاةِ وَرَبِّ

بنا خداوند! اور تو میری دعا قبول کر لے۔

ذُرِّيَّتِي رَبَّنَا وَتَقَبَّلْ دُعَاءِ

(ابراہیم : ۴۰)

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ کئی سورتوں میں بھی حضرت ابراہیمؑ کے خانہ کعبہ اور حضرت اسماعیلؑ سے تعلق کی صراحت

موجود ہے اور کئی سورتوں کے ضمن میں سورہ ابراہیم کا ذکر نہ کرنا ایک بڑی اور بدترین علمی خیانت ہے۔

اسی طرح یہ خیال بھی درست نہیں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے حنیف ہونے کا ذکر صرف مدنی سورتوں میں ہی کیونکہ

سورہ نحل کی ہے، اس میں ان کے متعلق فرمایا:

بے شک ابراہیمؑ پیشوا، خدا کا فرماں بردار اور

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِلَّهِ

موجد تھا، اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔

حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ۔

(نحل : ۱۲۱)

اسی کی سورہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو حضرت ابراہیمؑ کی ملت کے اتباع کی اس طرح تلقین

کی گئی ہے:

پھر ہم نے تمہاری طرف وحی کی کہ ابراہیمؑ کی ملت

ثُمَّ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ أَنْ اتَّبِعْ مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ



حَنِيفًا وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ .  
 پر چلو، جو ایک طرف کا تھا اور مشرکوں میں سے  
 نہ تھا۔ (نحل: ۱۲۳)

ان مستشرقین کی فرست میں سورہ انعام کا ذکر بھی ہے، جو کہی ہے، حالانکہ اس میں بھی ان کے حنیف اور شرک سے بیزار ہونے کی تصریح موجود ہے، فرمایا:

إِنِّي وَجَّهْتُ وَجْهِيَ لِلَّذِي فَطَرَ السَّمَوَاتِ  
 وَالْأَرْضَ حَنِيفًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُشْرِكِينَ  
 بے شک میں نے اپنا رخ بالکل کیسویہ کر اس کی  
 طرف کیا جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا ہے  
 اور میں مشرکوں میں سے نہیں ہوں۔  
 (انعام: ۷۹)

اسی سورہ کی ایک اور آیت ملاحظہ ہو:

قُلْ إِنِّي هَدَانِي رَبِّي إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ  
 دِينًا قَدِيمًا مِلَّةَ إِبْرَاهِيمَ حَنِيفًا .  
 کہو! میرے رب نے میری رہنمائی کی ایک  
 سیدھے راستے کی طرف، دین قدیم، ابراہیمؑ کی ملت  
 کی طرف جو کیسویہ تھی۔  
 (انعام: ۱۶۱)

اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا کہ قرآن مجید کی مکی و مدنی سورتوں کے اسلوب اور انداز بیان کا فرق اقتضائے حال اور مخاطب کی رعایت کا نتیجہ ہے، اور مکی سورتوں میں بھی حضرت ابراہیمؑ کی زندگی اور شخصیت کے ایسے گوشے نظر آتے ہیں، جن کو مستشرقین نے مدنی سورتوں کا خاصہ بتایا ہے۔

ان مستشرقین نے مسلمانوں اور عربوں، نیز حضرت اسماعیلؑ کے حضرت ابراہیمؑ سے رشتہ و تعلق کی نفی بھی کی ہے، حالانکہ یہ سلسلہ اس قدر واضح ہے کہ اس کے لئے کوئی دلیل پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے، اور اس کا ثبوت خالی قرآن مجید اور عربوں کے بیان ہی سے نہیں ملتا، بلکہ تورات میں بھی اس کی صراحت موجود ہے کہ حضرت اسماعیلؑ جو عربوں کے باپ ہیں حضرت ابراہیمؑ کے بیٹے ہیں، انھوں نے اپنے نخت جگر حضرت اسماعیلؑ اور ان کی ماں حضرت ہاجرہؑ کو بکریہ (بکری) میں آباد کیا، اس طرح اسماعیلی عربوں کی نشوونما ہوئی اور وہ حجاز کی سرزمین میں آباد ہوئے، توراہ کے باب پیدائش میں باب اسرہ سلسلہ کی تفصیلات موجود ہیں مثلاً اٹھارہویں باب میں ہے کہ حضرت ہاجرہؑ کو جب حمل ہوا تو حضرت سارہؑ کو جو اس وقت تک بے اولاد تھیں رشک و حسد ہوا اور وہ ہاجرہؑ کو ستانے لگیں، ہاجرہؑ نے آزدہ ہو کر گھر چھوڑ دینے کا ارادہ

کیا، اور ایک چٹمہ پر جو شور کی راہ میں واقع ہے، آکر ٹھہر گئیں، اس وقت خدا کے فرشتہ نے ان سے کہا:

”ہاجرہ اپنی بی بی کے گھر واپس جا، میں تیری نسل کو اتنا بڑھاؤں گا کہ وہ کثرت سے گنی نہ جائے گی!“

(تکوین، باب ۱۸)

حضرت ابراہیمؑ کو حضرت اسماعیلؑ سے جو تعلق اور غیر معمولی محبت تھی اس کا بھی توراہ سے پتہ چلتا ہے، اس کا بیان ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو جب حضرت اسحاقؑ کی ولادت کی بشارت دی گئی تو اس سے ان کو کوئی خاص مسرت نہیں ہوئی بلکہ انھوں نے یہ فرمایا کہ:

”اے کاش اسماعیل تیرے حضور زندہ رہے“ (تکوین ۱۸-۱۸)

اس پر خداوند نے فرمایا:

”اسماعیل کے حق میں میں نے تیری معنی، دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے برومند کروں گا اور اسے

بہت بڑھاؤں گا اور اس سے جاؤں سرور پیدا ہوں گے، اور میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا۔“

آگے اس کا ذکر ہے کہ حضرت سارہؑ نے اس ڈر سے کہ حضرت اسماعیلؑ باپ کی وراثت میں شریک ہو جائیں گے،

حضرت ابراہیمؑ کو انھیں اور ان کی ماں حضرت ہاجرہؑ کو علیحدہ کر دینے کے لئے مجبور کیا، اس پر حضرت ابراہیمؑ رنجیدہ ہوئے تو خداوند نے کہا:

”ابراہیم غم نہ کر، سارہ کی بات مان لے، تیری نسل اسحاق سے کہی جائے گی، تیرے بیٹے (خادم زاد)

حضرت اسماعیلؑ کو بھی میں ایک قوم بناؤں گا، کہ یہ بھی تیری ہی نسل ہے“ (تکوین: ۲۱-۱۳)

اس کے بعد ان کی روانگی اور ماں بیٹے کو عرب میں بسانے کا ذکر اس طرح ہے:

”ابراہیم صبح کو اٹھا اور روٹی لی اور پانی کا مشکیزہ ہاجرہ کو دیا۔۔۔۔۔ وہ روانہ ہوئی، اور بربیع

کے میدان میں بھٹکتی رہی، مشکیزہ کا پانی چک گیا، بچے کو ایک جھاڑی میں ڈال دیا، اور بچے سے تھوڑی دور

ایک شہر کے برابر بیٹھ کر غم زدہ بیٹھ گئی اور اس نے کہا کہ بچے کو اپنی آنکھ سے مرنے نہیں دیکھوں گا اور الگ

سے یہ ترجمہ توراہ کے مترجم کا ہے، کیونکہ بنی اسرائیل حضرت ہاجرہ کو حضرت سارہ کی لونڈی کہتے ہیں، اسی لئے وہ اپنے کو بنی اسماعیل سے افضل سمجھتے ہیں، یہاں اس کی تردید کا موقع نہیں، مولانا عنایت رسول چریا کوٹی نے اس موضوع پر ایک سالہ [حرفیہ ہاجرہ لکھا تھا

ہٹ کر گریہ و زاری کرنے لگی، خدانے بچہ کی آواز سنی اور خدا کے فرشتے نے آسمان سے ہاجرہ کو پکار کر کہا:  
ہاجرہ! ڈر نہیں، خدانے بچہ کی آواز جہاں وہ پڑا ہے سنی، اٹھ اور بچے کو اٹھا، اور اپنے ہاتھ سے اس کو سنبھال  
کہ میں اس کو ایک بڑی قوم بناؤں گا، خدانے ہاجرہ کی آنکھ کھول دی، اس کو پانی کا ایک کنواں نظر آیا، وہ گئی  
اور مشکیزہ کو پانی سے بھر لیا اور بچہ کو پانی پلایا، خدانے اس بچہ کے ساتھ تھا، وہ بڑا ہوا، بیابان میں رہا اور ایک تیرنڈ  
ہوا، وہ فاران کے بیابان میں رہا، اس کی ماں نے ملک مصر کی ایک بیوی اس کے لئے لی، (تکوین: ۲۱)

توراة کی ان واضح تصریحات کے بعد کون حضرت اسماعیلؑ کے حضرت ابراہیمؑ سے نسبی تعلق اور نسلی رشتہ کی نفی  
کی جرات کر سکتا ہے، البتہ قرآن اور توراة کے مندرجہ بالا آخری بیان میں ایک نمایاں تضاد یہ ہے کہ حضرت اسماعیلؑ  
حضرت ابراہیمؑ کی غیر معمولی شفقت و محبت کا ثبوت خود توراة ہی کے حوالہ سے اوپر نقل کیا گیا ہے، مگر اس بیان میں وہ  
ایک ایسے قسی القلب باپ نظر آتے ہیں جو شفقت پداری سے بالکل ہی خالی ہے، چنانچہ وہ اپنے بیٹے اور بیوی کو چند  
ردٹیاں اور مشکیزہ دے کر گھر سے باہر نکال دیتے ہیں، اور فاران کے بے آب و گیاہ میدان میں چھوڑ دیتے ہیں اور  
پھر کبھی خود اس کا خیال ہی دل میں نہیں لاتے اور نہ اس کے پاس جاتے ہیں، جبکہ قرآن کی یہ واضح تصریح ہے کہ وہ  
خود بھی بکہ تشریف لے گئے تھے اور انھوں نے ہی وہاں ماں اور بیٹے کو خانہ کعبہ کی خدمت کے لئے بسایا تھا، لیکن یہاں  
اس اختلاف پر بحث و گفتگو کی گنجائش نہیں ہے، ہمارا مقصد تو صرف یہ دکھانا تھا کہ قرآن اور توراة دونوں سے قطعی  
طور پر حضرت اسماعیلؑ کا حضرت ابراہیمؑ کی اولاد ہونا اور مکہ کی دادی غیر زرع میں سکونت پذیر ہونا اور حضرت اسماعیلؑ  
کا خانہ کعبہ کی خدمت کے لئے وقف ہو جانا ثابت ہے۔

شروع ہی میں یہ تحریر کیا جا چکا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کی نسل کی کثرت و برکت کا ثبوت قرآن مجید اور توراة  
دونوں ہی سے پوری طرح عیاں ہے، یہاں یہ واضح کر دینا بھی مناسب ہو گا کہ اس کثرت و برکت کا ظہور بنی اسحاق کے  
مقابلہ میں بنی اسماعیل میں زیادہ ہوا، اس کی تفصیل یہ ہے:

”خدانے حضرت ابراہیمؑ کی ذات کو خیر و برکت کا سرچشمہ بنایا تھا، وہ حضرت نوحؑ کے بعد تمام  
آسمانی برکتوں کے وارث ہوئے، ارشاد ہے:

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ  
بِشْرَةَ اللَّهِ لِيَتَّبِعُنَّ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا وَآلَ  
إِبْرَاهِيمَ إِذْ أَخْرَجَهُمْ بِالْحَقِّ وَأَبْرَاهِيمَ  
كَانَ عَاقِبَتُهُ أَيْسَرَ



ابْرٰهِيْمَ ذٰلِ عِمْرٰنَ عَلٰى الْعٰلَمِيْنَ - عمران کو اہل عالم کی رہنمائی کے لئے منتخب فرمایا۔

(آل عمران: ۳۳)

ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ لکھتے ہیں:

”آل عمران بھی ذریت ابراہیمؑ میں شامل ہے، اس لئے خدایا کی رحمتوں اور برکتوں کے لئے گویا تمام عالم میں صرف آل ابراہیمؑ کا انتخاب ہوا، پھر حضرت ابراہیمؑ کے واسطے سے تمام اہل زمین کو برکت دینے کا وعدہ کیا گیا“ (تفسیر سورہ کوثر توراہ کی کتاب تکوین کے حوالے نقل کئے گئے ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ خدایا نے حضرت ابراہیمؑ سے برکت کا جو وعدہ کیا تھا، وہ ان کی ذریت کے واسطے سے پورا ہوگا، گویا برکت حضرت اسحاقؑ کی ذریت سے بھی پھیلی، لیکن اس کا اصلی سبب حضرت اسماعیل اور ان کی ذریت ہوئی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور اسی کا نتیجہ ہے، کیونکہ آپؐ اُس سرزمین میں مسوٹ کئے گئے تھے جو تمام برکتوں کا سرچشمہ تھی اور اللہ نے آپؐ کو اس سرزمین اور دین ابراہیمی کا دارث بنایا تھا، آپؐ کی بعثت سے تمام روئے زمین کے لئے عام برکت کا وعدہ پورا ہوا، کیونکہ آپؐ کی رسالت تمام عالم کے لئے ہے:

وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا كَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيرًا  
وَنَذِيرًا. (سباز: ۲۸)

نیز آپؐ ساری دنیا کے لئے رحمت تھے:  
وَمَا أَرْسَلْنَاكَ إِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ  
(انبیاء: ۱۰۷)

اوپر اسفار یہود کے حوالے سے یہ بھی گزر چکا ہے کہ بنی اسماعیلؑ و بنی اسحاقؑ کی علیحدگی اس وجہ سے ہوئی تھی کہ جب اللہ نے حضرت ابراہیمؑ کو حضرت ہاجرہؑ کے لطن سے اولاد بخشی تو حضرت سارہؑ کو رشک ہوا، اور انھوں نے حضرت ہاجرہؑ کی ساتھ بد سلوکی کی، جسے حضرت ہاجرہؑ نے نہایت صبر کے ساتھ انگریز کیا، اس کے صلہ میں اللہ نے ان کو بڑی برکت دی، حضرت سارہؑ تحقیر کی وجہ سے انھیں لونڈی کہتی تھیں اور بنی اسحاقؑ بنی اسماعیلؑ کو کینزادے کہتے تھے، حالانکہ یہ بالکل خلاف حقیقت ہے، اور عملاً یہ ہو کہ حضرت سارہؑ کی اولاد اسماعیلیوں کے ہاتھ مصر میں فروخت ہوئی، پھر ایرانیوں نے لٹے اور رومیوں نے ان کو گرفتار کیا اور غلام بنایا، اس کے برخلاف حضرت ہاجرہؑ کی اولاد اپنی پوری تاریخ میں کبھی غلامی کی

ذلت سے آشنا نہیں ہوئی۔

بنی اسماعیل کی ان خصوصیات و امتیازات سے پتہ چلتا ہے کہ انھیں بنی اسحاق پر ہر حیثیت سے فوقیت و برتری حاصل ہے، اور قرآن مجید اور توراہ دونوں سے حضرت ابراہیمؑ سے ان کا رشتہ و تعلق نہایت قطعیت کے ساتھ ثابت ہوا۔ اگر بفرض محال یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ اس کی کئی سورتوں کے اندر نہ حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسماعیلؑ کے رشتہ کی صراحت کی گئی ہے، اور نہ ان کے خانہ کعبہ کے معمار ہونے کا ذکر ہے تو توراہ کی ان صراحتوں اور شہادتوں کے بارے میں کیا کہا جاسکتا۔

فاضل مستشرقین کا ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ عرب میں رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی نبی نہیں گذرا، اس سلسلہ میں انھوں نے جو آیتیں نقل کی ہیں، ان کے مفہوم اور اسلوب کو سمجھنے میں یا تو انھیں دھوکہ ہوا ہے، یا انھوں نے دیدہ و دانستہ یہ شوشہ چھوڑا ہے، اور نہ حضرت اسماعیلؑ و حضرت محمدؐ کے علاوہ حضرت ہود، حضرت صالحؑ اور حضرت شعیبؑ کا تعلق بھی تو اسی سرزمین سے تھا جن کا خود قرآن نے بھی مفصل تذکرہ کیا ہے۔

# جو زفت شاخت اور اعمول فقہ

از

جناب مولانا صاحب، ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد پاکستان

اسلام اور اس کی تعلیمات پر غور کرنے، انہیں سمجھنے اور اس پر عمل کرنے یا اس کا انکار کرنے سے پہلے مسلمانوں اور غیر مسلموں پر لازم ہے کہ وہ بنیادی ماخذ سے اسلام کا گہرا مطالعہ کریں تاکہ وہ کسی نتیجے پر پہنچ سکیں، اس قاعدہ کو پیش نظر رکھ کر غور کیا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ساتھ ساتھ غیر مسلموں نے بھی اسلام اور اس کی تعلیمات کو اپنے مطالعہ فکر اور تحریر کا موضوع بنایا ہے۔

مسلمانوں اور اسلام کے بارہ میں، غیر مسلموں کی تحریروں کو نہ صرف پڑھا بلکہ ان پر کڑی تنقید بھی کی، جن غیر مسلموں نے اسلام کے بارہ میں لکھا، انہیں عام طور پر مستشرقین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، اگرچہ بعض اوقات یہ اصطلاح صرف ان غیر مسلموں کے لئے استعمال کی جاتی ہے جن کا تعلق یورپین ممالک سے ہے، اور انہوں نے اسلام کے بارہ میں کچھ لکھا ہے، لیکن عام طور پر یہ اصطلاح ان سب اصحاب علم کے بارہ میں استعمال ہوتی ہے جو غیر مسلم ہوں اور انہوں نے اسلام کے بارہ میں کچھ نہ کچھ کام کیا ہو، اگرچہ اسلام کے بارہ میں غیر مسلموں نے ابتدا ہی سے غور و فکر شروع کر دیا تھا، یہودیوں اور عیسائیوں نے اس دین کو آغاز سے ہی سے اپنے اعتراضات کا ہدف بنایا، لیکن وہ گروہ جسے "مستشرقین" کے نام سے یاد کرتے ہیں، ان کا آغاز صلیبی جنگوں میں غیر مسلموں کی ناکامی کے بعد ہوا تھا، صلیبی جنگوں کی ناکامی نے غیر مسلموں میں یہ شعور پیدا کر دیا تھا کہ اب وہ سیاسی طور پر مسلمانوں کے برد آؤنا نہیں ہو سکتے، اس لئے اب ایسے ذرائع اپنانے چاہئیں جن سے مسلمانوں کو مرعوب کر کے ان پر غلبہ حاصل کیا جاسکے، ظاہر ہے کہ ایسا کرنے کے لئے ان کے پاس اسلام کو مسخ کر کے پیش کرنے کے علاوہ اور کوئی ذریعہ نہیں تھا، چنانچہ انہوں نے اس میدان میں یلغار کی اور اس کے لئے مستشرقین نے نہ صرف اسلام کو مسخ کیا بلکہ اس آڑ میں اپنے ادیان کی تبلیغ کا بھی فریضہ ادا کیا، اس سلسلہ میں لارڈ الٹنی نے کہا تھا،

"اگرچہ عسکری نقطہ نظر سے جنگ ختم ہو چکی ہے، مگر جہاں تک دینی تعصب کا تعلق ہے، وہ مستشرقین کی تحریروں



میں نہ صرف باقی ہے بلکہ اس میں روز افزوں اضافہ ہوگا، غیر مسلم، اسلام اور اس کی ثقافت کے بارہ میں جب بھی لکھیں گے مسلمانوں کو پس ماندہ، کمزور اور ثقافت سے عاری ثابت کرنے میں کوئی کسر اٹھانہ رکھیں گے، یہی وجہ ہے کہ ہم جب بھی مستشرقین کی تحریروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو انہیں اسلام کے خلاف پھرے ہوئے پاتھیں، یہ حقیقت تاریخی طور پر ثابت ہے کہ استشرق کی تحریک کا مقصد علم کی خدمت یا اسلام کی وراثت کو ضائع کرنے سے بچانا ہرگز نہیں ہے، بلکہ یہ تحریک کلیسا کے زیر اثر پیدا ہوئی، بڑے بڑے پادری اس تحریک کی حوصلہ افزائی کرتے رہے، اسی طرح عیسائی اور یہودی حکومتوں نے بھی اس تحریک کی شائع کرنے کو مہمانہ سے اسلام کی صحیح فکر کو نشوونما پانے سے روکا، مسلمانوں کے طرز فکر کی اشاعت کرنے کے بجائے اپنے خیالات پیش کرو اور بعض مقامات پر حقائق کو چشم پوشی کر کے اس میں تحریف بھی کی بنیادی، آئندہ سوسائٹی کی وجہ وہ حقائق کو آسانی سے مسخ کر سکے اور نتائج اخذ کرنے کی عجلت میں اپنے کو حقائق سے ہمیشہ دور رکھا، اس طرح انہوں نے بے شمار غلطیاں کیں، جن کا اعتراف مستشرقین نے خود بھی کیا ہے، چنانچہ اربری کا کہنا ہے:

”ہم مستشرقین نے جب اسلام کے بارہ میں تحقیق کی تو بے شمار غلطیاں کیں، ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اس موضوع میں نہ الجھیں، کیونکہ مسلمان عرب مسلمان ہم سے زیادہ باصلاحیت ہیں کہ اسلام کے موضوعات پر تحقیق کریں۔ مسلمانوں کو مستشرقین کی ہر تحریر کو وقت نظر سے دیکھنا چاہئے، جرح و تعدیل کے اصولوں پر، ان کے نتائج تحقیق کو قبول کرنے سے پہلے ان کی چھان بھٹک اشد ضروری ہے۔“

اس مختصر تمہید کے بعد ہم اپنے اصل موضوع شاخت اور اصول فقہ کی طرف آتے ہیں، اس موضوع کو ہم نے دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، پہلے حصہ میں ہم شاخت کے مختصر حالات زندگی اور اس کی تالیفات کا ذکر کریں گے اور دوسرے حصہ میں اصول فقہ کے بارہ میں شاخت کے افکار کا جائزہ لیں گے

جوزف شاخت کے مختصر حالات اور	جوزف شاخت ۱۹۰۲ء میں جرمنی میں پیدا ہوئے، ان کا تعلق یہودی مذہب سے تھا، انہوں نے جامعہ برسلاؤ اور جامعہ ہینزبرگ میں تعلیم پائی، کچھ دنوں ایک یونیورسٹی
علی کارنامے	

میں درس دینے کے بعد ۱۹۳۲ء میں کونٹنس برگ یونیورسٹی میں چلے گئے، ۱۹۳۳ء میں جامعہ مصریہ میں منتقل ہوئے، آکسفورڈ یونیورسٹی میں ۱۹۳۱ء میں علوم اسلامیہ کے ریڈر مقرر ہوئے، ۱۹۵۲ء میں الجزائر یونیورسٹی میں علمی تحریکوں کے اتاذ ہو گئے، کولمبیا یونیورسٹی میں بھی پروفیسر رہے، وہ بہت سی علمی اور ادبی تنظیموں کے رکن ہوئے، ان کو مجمع علمی

العربی الدمشق کی بھی رکنیت ملی کچھ عرصہ تک وہ مجاہد علوم اسلامیہ کے مدیر تھے رہے، اسلامی قانون کی ابتدا، ترقی، اس کی اتر پذیری اور اثر اندازی، ان کا خاص موضوع ہے، اور یہی ان کی شہرت کا باعث ہوا۔

شناخت کی تھانہ میں | جوزف شناخت نے بے شمار کتب اور لاتعداد علمی مقالات یادگار چھوڑے ہیں جن کا احاطہ ممکن نہیں ہے، ہم ان میں سے بعض کا ذکر کرتے ہیں۔

(۱) تحقیق کتاب الحجیل والمخارج للخصاف (۲) تحقیق کتاب الحجیل فی الفقه للقرظینی، اس کتاب کا جرمن زبان میں ترجمہ کیا (۳) تحقیق کتاب المخارج فی الحجیل للشیبانی، اس کتاب پر حواشی بھی لکھے (۴) طحاوی کی کتاب الشروط سے اذکار الحقوق اور کتاب الشفع شائع کیں (۵) استانبول اور قاہرہ کے کتب خانوں کی فرستیں تین جلدوں میں تیار کیں (۶) دین اسلام کے نام سے منتخب مقالات شائع کئے اور ان کا جرمن میں ترجمہ کیا (۷) رسالہ جالیئوس فی الاسرار الطبیبہ جرمن ترجمہ کے ساتھ شائع کیا (۸) الرسالة الکاملیۃ لابن نقیس کو تحقیق کے بعد جرمن ترجمہ کے ساتھ طبع کرایا (۹) ابن بطالہ کے خمس رسائل تحقیق اور انگریزی ترجمہ کے ساتھ پیش کئے (۱۰) اسلامی احکام کی حنفی طریقہ پر تبویب کی (۱۱) فقہ کا ارتقاء کے نام سے انگریزی زبان میں کتاب لکھی (۱۲) ماتریدی کی کتاب التوحید تحقیق کے ساتھ طبع کی (۱۳) اسلامی قانون کا تعارف۔ یہ کتاب انگریزی زبان میں لکھی، مذکورہ بالا کتابوں کے ساتھ جوزف شناخت نے دائرہ معارف اسلام، دائرہ معارف علوم اجتماعیہ اور تاریخ فقہ اسلامی میں اسلام کے بارہ میں بہت سے مقالے تحریر فرمائے، مزید براں شناخت نے دنیا کے قریباً تمام معروف علمی رسائل میں مضامین لکھے، ان کے مضامین اسلامی اور مغربی ممالک کے رسائل میں طبع ہوئے اور بڑی دلچسپی سے پڑھے گئے۔

اگر جوزف شناخت کے تحقیقی مضامین اور کتابوں کا جائزہ لیا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ انھیں علوم اسلامیہ کے درجہ ذیل شعبوں سے دلچسپی تھی، (۱) اصول الفقہ (ب) فقہ حنفی (ج) علم الکلام (د) عربی مخطوطات۔

شناخت کی تحریریں بہت پختہ اور مقصدیت سے پڑھتی ہیں، اس لئے بہت دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں، لیکن ان کی اصلی شہرت، اس حیثیت سے حاصل ہوئی کہ انھوں نے اصول فقہ میں گرانقدر خدمات انجام دیں، اسلامی قانون اور خاص طور سے اسلامی قانون کے اصولوں کے بارے میں انھیں مستشرقین کا باوا آدم تصور کیا جاتا ہے، کیونکہ اسلامی قانون پر فلسفیانہ اور انجمن جس انداز میں شناخت نے کی ہیں، اس طرح کسی اور مستشرق نے نہیں کی ہیں، ہم اس مقالہ میں شناخت کے افکار

کا مختصر جائزہ صرف اس حیثیت سے پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ انھوں نے اپنے مفروضات قائم کر کے کس طرح غلطی پیدا کی اور اس بنا پر اسلامی قوانین کی ساری بنیادیں متزلزل کر دیں۔

جوزف شاخت نے اسلامی قانون پر بہت سے مقالات کے ساتھ دو مستقل کتابیں بھی تحریر کیں جن کے نام یہ ہیں:

1. The Origin of Muhammedan Jurisprudence

2. An Introduction to Islamic Law

بدیہا کہ نام سے ظاہر ہے پہلی کتاب کا تعلق مسلمانوں کے اصول قانون (فقہ) سے ہے، یہ کتاب پہلی مرتبہ ۱۸۵۵ء میں برطانیہ میں طبع ہوئی تھی، بعد میں اس کے کئی ادیشن چھپے، شاخت کی اس کتاب کو بہت قبولیت حاصل ہوئی، غیر مسلموں کے علاوہ مسلمانوں نے بھی اس کتاب کو بہت دلچسپی سے پڑھا اور اس کی غلطیوں کی نشان دہی کی، شاخت نے اپنی کتاب کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے، پہلا حصہ قانونی نظریہ کا ارتقار دس ابواب پر مشتمل ہے، دوسرا حصہ قانونی روایات کا ارتقار کو چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے، پہلا حصہ قانونی نظریہ کا ارتقار دس ابواب پر مشتمل ہے، دوسرا حصہ قانونی روایات کا ارتقار چھ ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے، تیسرے حصے میں قانونی مذاہب کی پیدائش پر نو ابواب ہیں، چوتھا حصہ قانون کے تکنیکی افکار کا ارتقار کے چھ ابواب ہیں، مزید برآں کتابیات اور اختصارات کی وضاحت کے ساتھ کتاب کے آخر میں ایک مفید انڈیکس بھی شامل ہے، جوزف شاخت نے یہ کتاب لکھ کر اسلامی قانون کو مغربی دنیا میں متعارف کرانے کا اہم کام انجام دیا، مگر اس کی وجہ سے اسلامی قانون سے متعلق مستشرقین کے نظریات شکوک و شبہات اور اعتراضات واضح طور پر سامنے آ گئے، شاخت نے اسلامی قانون کو کھرے ہوئے مواد کو ایک جگہ ضرور جمع کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی انھوں نے اسلام کے مسلمات کو پامال کرنے میں کوئی گنہگار نہیں اٹھا رکھی ہے۔ انھوں نے اسلامی قانون اور اس کے اصولوں کے بارے میں جو غلط نظریات اختیار کر لئے ہیں اگر ان سب کا محاسبہ کیا جائے تو مقالہ طویل ہو جائے گا، اس لئے ہم ذیل میں ان کے صرف تین نظریات کا نہایت مختصر کے ساتھ جائزہ لیتے ہیں، مستشرقین کی ایک عادت رہی ہے کہ وہ جب بھی کسی موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں تو وہ اس کے مسلمات کو جھٹلانے یا ان میں تشکیک پیدا کر کے خود اپنا نظریہ گھڑتے ہیں، چنانچہ یہی قاعدہ انھوں نے بھی اصول قانون کے بارہ میں اپنایا ہے، اس حقیقت سے ہر اہل علم واقف ہے کہ اسلامی قانون کے چار بنیادی ماخذ قرآن سنت، اجماع اور قیاس ہیں، جوزف شاخت نے ان سب کو جھٹلانے کی کوشش کی ہے۔



قرآن حکیم مسلمانوں کے لئے ضابطہ حیات ہے، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا ہے، یہ حقیقت ہے کہ پہلی دجی کے نزول ہی سے مسلمان اس سے ہر طرح استفادہ کرنے لگے تھے، انھوں نے زندگی کے ہر موڑ پر قرآن حکیم سے رہنمائی حاصل کی، جب کہ شاخت کا خیال ہے کہ (ا) اسلامی قانون بجاہ راست قرآن حکیم سے اخذ نہیں کیا گیا (ب) اسلامی قانون کا خمیر بنی امیہ کے انتظامی نخل سے اٹھا یا گیا (ج) بعض اوقات بنی امیہ کا عمل قرآن حکیم کے الفاظ پر بھاری ہوتا تھا، یہ خیال کہ ابتدائی دور میں قوانین بنانے میں قرآن حکیم سے استفادہ نہیں کیا گیا، ہماری سمجھ سے بالاتر ہے، کیونکہ تاریخی شواہد موجود ہیں کہ مسلمانوں نے قرآن حکیم کو قانون کا اولین ماخذ بنایا، نبی کریمؐ اور صحابہ کرامؓ کے عہد میں قرآن حکیم سے مکمل طور پر استفادہ کیا جاتا رہا، چوروں کے ہاتھ کاٹے گئے، زانیوں کو کوڑے لگائے گئے، شراب پینے والوں پر تعزیر نافذ ہوئی، بدکرداروں کو ملک بدر کیا گیا، نکاح و طلاق نیز وراثت کی تقسیم کے فیصلے قرآن حکیم کے احکام کے مطابق کئے گئے، اس سے ذرا آگے بڑھے اور معاذ بن جبلؓ والی مشہور روایت پر توجہ دیجئے کہ نبی کریمؐ نے جب انھیں قاضی بنا کر بھیجا تو ان سے دریافت کیا کہ تم فیصلے کس چیز سے کیا کر دو گے، اس کے جواب میں انھوں نے سب سے پہلے جس ماخذ کا ذکر کیا، وہ قرآن حکیم تھا، چنانچہ انھوں نے بے ساختہ کہا کہ قرآن حکیم سے نبی کریمؐ نے یا کسی بھی صحابی نے ان کے اس خیال کی تردید نہیں کی، جس سے صاف طور پر واضح ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے ہاں ابتداء ہی سے، قرآن حکیم قانون کا اصلی اور بنیادی ماخذ تھا، البتہ اتنی بات قابل تسلیم ہے کہ قرآن حکیم اصولوں کی کتاب ہے اور اس میں جملہ جزئیات کا احاطہ نہیں کیا گیا، اور قرآن حکیم کو قانونی ماخذ بنانے کے لئے سب سے زیادہ کیلیات کی ضرورت تھی، وہ بعد میں مرتب ہوئے، اور آج تک مرتب ہو رہے ہیں، آج بھی اگر کوئی جدید مسئلہ درپیش ہو اور قرآن حکیم کی کسی آیت سے کوئی کلیہ بنایا جاسکے تو وہ ہمارے لئے ویسے ہی قابل عمل ہوگا، جیسے امام شافعیؒ یا امام ابوحنیفہؒ کا قائم کردہ کوئی کلیہ قابل عمل ہوتا ہے، شارع علیہ السلام نے اپنی حیات طیبہ کے آخری دور میں ارشاد فرمایا کہ میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، ایک کتاب اللہ اور دوسری اپنی سنت، جب تک ان پر عمل پیرا ہو گے، کبھی گمراہ نہ ہو گے، اس سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ قرآن حکیم عہد رسالت سے ہی قانون کا ماخذ بن گیا تھا، اور مسلمان ہر قانون اسی سے اخذ کرتے تھے، چنانچہ مسلمانوں کے ہاں ایک عام اصول رہا کہ ایسی کوئی بات تسلیم نہیں کی جائے گی جو قرآن حکیم کے احکام یا اس کی روح کے خلاف پائی جائے،

شاخت نے یہ لکھا ہے کہ بنی امیہ کی انتظامی روایت سے مسلمانوں کے قانون کا خمیر اٹھا اور دوسرے مقام پر انہی کا ضل مستشرق نے یہ بھی تحریر فرمایا کہ بنی امیہ سے پہلے مسلمانوں کے قانون کو فلکشن (افسانہ) کا درجہ حاصل تھا، نیز انھوں نے یہ بھی

لکھا کہ بنی امیہ کے انتظامی عمل کو قرآن حکیم پر ترجیح دی جاتی رہی ہے، یہ ساری باتیں کوئی اہل علم نہیں کہہ سکتا، کیونکہ مسلمان قرآن حکیم کے خلاف کسی حدیث کو بھی قبول نہیں کرتے تھے، چہ جائیکہ وہ بنی امیہ کے عمل کو زیر غور لائیں۔

عمر رسالت اور بعد خلافت راشدہ مسلمانوں کے نزدیک اسلامی قانون کی تدوین کا ذریعہ دور ہے، آج بھی اگر مسلمان کو کسی قانون یا اس کی تعبیر کی ضرورت پیش آتی ہے، تو وہ اپنے اس عمدہ ذریعہ کا مطالعہ کرتے ہیں اور اسی کو مثال بناتے ہیں، جب کہ فاضل مشرق میں اس دور کو اسلامی قانون کا افسانوی عمدہ قرار دیا ہے، اس کو علیٰ خیانت بلکہ اسلام کے خلاف تعصب کے علاوہ اور کچھ نہیں کہا جاسکتا۔

قرآن کے بعد سنت، مسلمانوں کے ہاں قانون کا دوسرا اہم ماخذ ہے، مسلمان فقہاء کو جزا، انور کے بارے میں قرآن کریم سے رہنمائی نہیں ملی وہاں انھوں نے سنت کی طرف رجوع کیا، اور اسے نہ صرف ماخذ قانون کے طور پر اپنایا بلکہ سنت کو اسلامی قانون کی علی تعبیر بھی سمجھا، لیکن فاضل مشرق نے سنت کو بھی اپنی بحث کا موٹو بنایا اور اس میں شک و شبہ پیدا کر دیا ہے، ان کا خیال ہے کہ (۱) حدیث نبوی دوسری صدی کے وسط تک موجود نہیں تھی، (ب) جب حدیث کو جمع کیا گیا، اس وقت وہ اصلی حالت میں موجود نہیں تھی، بلکہ اس میں معاشرہ کی عادات شامل ہو چکی تھیں، یہ دونوں مفروضے حقائق پر مبنی نہیں ہیں، کیونکہ حفاظت اور کتابت حدیث کا اہتمام جس طرح مسلمانوں نے کیا ہے وہ کسی دوسرے مذہب والوں کو نصیب نہیں ہوا، اس امر کی تاریخی شہادت موجود ہے کہ صحابہ کرامؓ، احادیث رسول لکھا کرتے تھے، ان کے پاس عمدہ صحابہ میں بھی اپنے اپنے صحیفے موجود تھے، جن میں صحیفہ ابو ہریرہؓ، صحیفہ حضرت علیؓ اور صحیفہ دہب بن منبہ کے وجود کی تاریخی شہادت ملتی ہے، مزید نبی کریمؐ نے جو خطوط مختلف اوقات میں تحریر کرائے اور جو بعد میں اسلامی قانون کا جز بنے، وہ سارے کے سارے تحریری شکل میں موجود تھے، مزید برآں عربوں کا حافظہ مثالی تھا، وہ ساری باتیں اس عمدگی سے حفظ کر لیا کرتے تھے کہ عام انسان اس کا تصور نہیں کر سکتے۔

یہ اعتراض کہ جب حدیث نبویؐ کو حیثیت تحریر میں لایا گیا تو اس وقت اس میں معاشرتی آمیزش ہو چکی تھی، محض ظنی ہے، اس کا تعلق حقیقت سے کچھ بھی نہیں کیونکہ نبی اکرمؐ کا ارشاد ہے، "من کذب علی متعمداً فلیتبوأ مقعداً من النار" جس نے جان بوجھ کر میری طرف جھوٹ کی نسبت کی، اس کا ٹھکانا جہنم ہوگا، اس حدیث کی روشنی میں کس کو جرأت اور ہمت، ہو سکتی ہے کہ وہ جھوٹی حدیث گھڑے، پھر مسلمانوں نے حدیث کی جرح و تعدیل کے ایسے اصول مرتب کئے جن کی موجودگی

میں حدیث کے صحیح یا غلط ہونے کے بارہ میں فیصلہ کرنے میں کوئی دقت نہیں ہوئی، یہی وجہ ہے کہ ہم آج بھی حدیث کو ان اصولوں پر پرکھ کر کھرا کھوٹا الگ کر سکتے ہیں، چنانچہ ہمیں اس وقت بھی موضوع اور صحیح حدیثیں معلوم ہیں، موضوعات پر الگ الگ کتابیں موجود ہیں، ان حقائق کی روشنی میں فاضل مشرق کے مقالے اور شکوک و شبہات بالکل بے بنیاد ہوتے ہیں جن کا مقصد شکوک و شبہات کو ابھارنے کے علاوہ کچھ نہیں۔

مصادر اس مقالہ کی تیاری میں درج ذیل کتب سے مدد لی گئی:

- ۱۔ نجیب العقیقی، المستشرقون، دار المعارف مصر ۶۵
- ۲۔ دکتور مصطفیٰ سباعی، السنۃ و مکاتمتنا فی التشریح الاسلامی، دار القومیہ، مصر ۳۹
- ۳۔ زکریا باشم زکریا، المستشرقون والاسلام، المجلس الاعلیٰ لشؤون اسلامیہ قاہرہ۔

(۱) Schachi, J. The Origin of Muhammadan Jurisprudence

Oxford Press 1950

(۵)

Schacht, J. Introduction to Islamic Law Oxford Press 1964

Dr. Fazlur Rahman. Islam. London 1965

(۶)

Dr. Ahmad Hasan. The Early Development of Islamic

Jurisprudence, Islamshad 1970

S.R.H. Giloni. The Reconstruction of Legal Thought in

Islam. Lahore 1977

Dr. Zafar Ishaq Ansari. Development of Fiqh in Kufah

M.S.

(۲)

## جوزف شاخت اور اسلامی قانون کے

جوزف شاخت ہمارے دور کے نہایت ممتاز اہل قلم میں سے ہے، اسے اسلامی قانون کے ابتدائی ادوار

کے نشو و نما پر زندگیاں تسلیم کیا جاتا ہے، اور اس کی تحریروں کے اثرات بڑے نمایاں طور سے اس کے ہم عصر مصنفین کے

خیالات پر نظر آتے ہیں، اسلامی قانون کے سرچشمے Origin of Muhammadan Jurisprudence



## ORIGIN OF MUHAMMADAN JURISPRUDENCE

نامی کتاب میں اس نے اپنے خیالات بڑے مدلل اور مفصل طریقے سے پیش کئے ہیں، یہ علیحدہ بات ہے کہ دور مذکور کے بارے میں وہ اسلامی قانون کے ارتقا کی پوری تصویر پیش نہیں کر سکا اور کتنے ہی اہم سوالات کا جواب اس نے تشنہ چھوڑ دیا تاہم اس حقیقت سے انکار بھی ممکن نہیں کہ مستشرقین اور قانون اسلامی کے مغربی تعلیم یافتہ لوگوں کے دماغوں کو اس نے بہت متاثر کیا ہے، یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی قانون کی ابتدا اور ارتقا کے بارے میں شناخت کے بنیادی خیالات مستعار ہیں، لیکن یہ ایک واقعہ ہے کہ اسلامی قانون کے بارے میں جس نقطہ نظر سے سوچنے کی ابتدا گولڈزیمر نے کی اور اس کے نتیجے میں مغرب میں جو طرز فکر وجود میں آیا شناخت اس کا سب سے بڑا اور بہترین نمائندہ اور شارح ہے، شناخت نے گولڈزیمر کے خیالات کو بنیاد بنا کر اس پر ایک پوری عمارت تعمیر کر دی، اور گولڈزیمر کے پیش کردہ نتائج فکر کی تائید و توثیق کی۔

گولڈزیمر نے حدیث کی داخلی تنقید کی بنیاد ڈالی۔ یہ داخلی تنقید محدثین و ناقدین حدیث کی تنقید متن و سند سے قطعاً مختلف ایک بالکل نئی چیز ہے، گولڈزیمر کا دعویٰ ہے کہ محدودے چند احادیث ہی ایسی ہوں گی، اگرچہ ان کا وجود بھی مشکوک ہے جن کا تعلق اس ابتدائی دور سے ثابت کیا جاسکتا ہو، جس کی پیداوار انھیں سمجھا جاتا ہے۔ وہ اس سے آگے قدم بڑھا کر یہ کہتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے منسوب احادیث کی بھاری اکثریت سرے سے دور نبوی سے کوئی تعلق ہی نہیں رکھتی بلکہ وہ بعد کے اسلامی ادوار کی پیداوار ہیں۔ زیادہ واضح الفاظ میں گولڈزیمر کا دعویٰ یہ تھا کہ احادیث چاہے وہ سچ ترین کتب حدیث میں پائی جاتی ہوں، اور چاہے ان کی صحت علمائے اسلام کے نزدیک کتنی ہی ثابت شدہ اور متفق علیہ کیوں نہ ہو، علاوہ ایک قلیل ترین تعداد کے سب موضوع اور جعلی ہیں، حدیث کے بارے میں گولڈزیمر کے ان خیالات کو اسلامی قانون کے مغربی مولفین میں بڑا حسن قبول حاصل ہوا اور ان کی شرح، تائید، توثیق میں خوب لکھا گیا، اسناد تک بارگردینے نے اسلامی قانون پر لکھتے ہوئے بڑی حد تک گولڈزیمر کے خیالات پر اپنی بنیاد رکھی، شناخت نے بھی اسلامی قانون کی ابتدا اور اس کی نشو و ارتقا کے بارے میں گولڈزیمر ہی کی فراہم کردہ بنیادوں پر عمارت اٹھائی اور اس بات کا اقرار بھی کیا کہ اس کی تحقیقی کاوشیں بہت بڑی حد تک گولڈزیمر کے افکار و آراء کی توثیق کرتی ہیں، لیکن شناخت کا خود اپنا کام انہی حد تک محدود نہیں رہا۔ اس نے کتاب الام کا تفصیلی مطالعہ کیا اور گولڈزیمر سے بہت آگے بڑھ کر بعض دعاوی پیش کئے جن میں سے خصوصیت کے حامل حسب ذیل موزن ہیں:

۱۔ کتب احادیث میں درج شدہ اکثر و بیشتر احادیث وہ ہیں جو امام شافعیؒ کے بعد رواج پذیر ہوئیں۔

۲۔ قانونی مواد پر مشتمل احادیث جن کا انتساب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا جاتا ہے، ان کا پہلا بڑا حصہ دوسری صدی ہجری کے وسط میں ظہور پذیر ہوا، صحابہ اور تابعین کے آثار ان احادیث سے زماناً متقدم ہیں اور ان احادیث سے پہلے ہی مروج ہو چکے تھے، فقہی مذاہب کی زندہ روایات کو بھی ان احادیث سے تقدم زمانی حاصل ہے۔

۳۔ صحابہ و تابعین کے آثار بھی نشوونما کے اسی عمل اور دور سے گزرے ہیں جن سے احادیث گزری ہیں اور انہیں بھی اسی نظر سے دیکھنا چاہئے جن سے احادیث کو۔

۴۔ اسناد کے مطالعے سے بسا اوقات احادیث اور روایات کے زمانہ کو دریافت کیا جاسکتا ہے،

۵۔ اسناد کا مزاج یہ ہے کہ ان کی سمت سفر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہوتی ہے، اور وہ زیادہ سے زیادہ اور عالی سے عالی تر مرتبہ اسناد حاصل کرنا چاہتی ہے، یہاں تک کہ بالآخر وہ ذات نبویؐ پر منتہی ہو جائیں۔

۶۔ قانونی مواد پر مشتمل احادیث کی شہادت صرف سنہ ہجری پیچھے تک لے جاتی ہے۔

۷۔ سنہ ہجری کا زمانہ وہ ہے جب اسلامی قانونی فکر کی ابتدا اموی استظامی امور اور عوامی عرف و رواج کے مواد سے ہوتی ہے، جس کی چھاپ آج بھی بہت سی احادیث پر نمایاں طور سے پائی جاتی ہے۔

شاخت نے احادیث میں پائی جانے والی سنت کے بارے میں امام شافعیؒ کے رویے سے بعض نہایت اہم نتائج نکالے ہیں، اور ان نتائج کو نیز قانونی مواد پر مشتمل احادیث کو اسلامی قانون کے ارتقا اور اس کے اصولوں کو سمجھنے کے لئے استعمال کیا ہے اس کا کہنا ہے کہ امام شافعیؒ سے دو صدی پہلے یہ عام اصول تھا کہ صحابہ اور تابعین کے آثار کا حوالہ بطور سند کے دیا جاتا تھا، اور ان کی تعبیر زندہ روایت کی روشنی میں کی جاتی تھی، شاخت نے زندہ روایت کے لفظ کو کئی ان تصورات کے لئے استعمال کیا ہے جنہیں فقہ اسلامی کے قدیم مسالک میں وہی مرتبہ حاصل تھا۔ جو شاخت کے خیال میں بعد میں سنت نبویؐ کو دے دیا گیا۔ ان تصورات میں سب سے اہم شاخت کے نزدیک رواج یا عمل یا الامر بالمعروف علیہ ہے، زندہ روایت کی روشنی میں تعبیر کا سب سے اہم منظر کسی فقہی مسلک کے فقہار کا کسی امر پر اجماع ہو جانا تھا، شاخت کا کہنا ہے کہ تاذوق و نادر ہی ایسا ہوتا تھا کہ حدیث نبویؐ کا کسی مسئلے میں حوالہ دیا جاتا ہو اور اسی طرح کا کوئی حوالہ محض ایک استنار کی حیثیت رکھتا تھا، شاخت کے خیال میں یہ امام شافعیؒ کا کام ہے کہ اسی استنار کو اصول کی حیثیت حاصل ہو گئی، مذکورہ عمل کے پیش نظر شاخت

کا کہنا ہے کہ صحابہ و تابعین کے آثار کو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے منسوب احادیث پر تقدم زمانی حاصل ہے۔  
 فقہ کا اولین ماخذ قرآن کریم ہے۔ ساخت اس سے منکر ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ یہ ثابت کرنا بہت مشکل ہے کہ قرآن کریم  
 اسلام کے ابتدائی قانونی مواد و نظریات کا اولین اور بنیادی سرچشمہ ہے، اس کے خیال میں اسلامی قانون کا ماخذ براہ راست  
 قرآن کریم نہیں بلکہ اسلامی قانون درحقیقت دور اموی کے عام رواج اور انتظامی اعمال و افعال کی ایک ترقی یافتہ  
 شکل ہے جس کو اسلامی قانون کی تشکیل کے لئے خام مواد کے طور پر استعمال کیا گیا تھا۔ اگرچہ یہ رواج و اعمال کتنی ہی جگہ  
 قرآن کریم کے مضمرات اور بعض اوقات اس کے صریح احکام کی خلاف ورزی پر مشتمل تھے، اس طرح ساخت کے نزدیک  
 اسلامی قانون کی ابتدا دوسری صدی ہجری سے ہوتی ہے، جب کہ فقہ اسلامی کے قدیم مسالک باقاعدگی کے ساتھ نمودار  
 ہونا شروع ہوتے ہیں۔ ساخت کا کہنا ہے کہ قواعد فقہیہ بھی اس دور کی پیداوار ہیں اور ان ہی کو بعد میں حدیث کی شکل میں  
 پیش کر دیا گیا، اسکے خیال میں قواعد فقہیہ سب سے پہلے عراق میں نمودار ہوئے، اور یہ فقہ اسلامی کے اس دور سے تعلق رکھتے ہیں  
 جبکہ انھیں ابھی حدیث کا لباس نہیں پہنایا گیا تھا، فقہاء و محدثین دونوں اسپر متفق ہیں کہ قانونی مواد پر مشتمل احادیث یعنی احاد  
 احکام انتہائی مضبوط بنیادوں پر استوار ہیں، اور صحت و اعتماد انتہائی امکانی دولت سے مالا مال ہیں، اس صحت و اعتماد کے حصول  
 کے لئے ہر وہ کوشش عمل میں لائی گئی ہے جو انسان کے بس میں ہے، ساخت انہی حدیث کو پایہ اعتبار سے ساقط قرار دیتا ہے اور انہیں  
 موضوع اور جعلی قرار دیتا ہے، اس کا کہنا ہے کہ احادیث احکام وضع کرنے کا زمانہ دوسری صدی ہجری کا نصف اول ہے، مزید برآں ان  
 اور تنقید اسناد و محدثین کے نزدیک جعلی اور مشکوک احادیث کی پہچان کا بہترین ذریعہ ہیں، لیکن ساخت کا کہنا ہے کہ علمائے اسلام کے یہ  
 دعویٰ بے بنیاد ہیں اور احادیث احکام کے سلسلہ میں ان کو پیش کرنا درست نہیں، اس کا دعویٰ ہے کہ اسناد کی ابتدا نہایت  
 سادہ شکل میں ہوئی، ان کی تکمیل کہیں تیسری صدی ہجری میں جا کر ہوئی، علمائے اسلام جن اسناد کو اول درجے کی اور معتبر ترین  
 قرار دیتے ہیں، ان کے بارے میں علماء کے خیالات و اتفاق کرنا مشکل ہی ہے، اس کا کہنا ہے کہ سلسلۃ الذہب جسے اعلیٰ ترین معیار  
 سندوں میں شمار کیا جاتا ہے، واقعہ یہ ہے کہ وہ امام مالک سے پیشتر کے دور میں پھیلے ہوئے جعل و وضع کے عمل کا براہ راست نتیجہ ہے، ساخت  
 کے خیال میں اسناد انتہائی لاپرواہی سے مرتب کر دی جاتی تھیں، اور کسی بھی قدیم مستند شخصیت کے منہ میں اپنے سینہ پیدہ نظریات  
 و خیالات کو اسے کسی بھی سند میں شامل کر دیا جاتا تھا۔ ساخت امور انتظامی عمل کو فقہ اسلامی کا سرچشمہ قرار دیتا ہے، وہ رسول اللہ  
 صلی اللہ علیہ وسلم کو بحیثیت رسول شارع اور قانون ساز مطلقاً منکر ہے، اس کے نزدیک حضور کی حیثیت فقط ایک معلم اخلاق کی ہے، تشریح و حصول کا



ہے نہ آپ کے فرائض میں شامل، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اسلامی قانون کی ابتدا تشکیل اور ارتقا کے نقطہ نظر سے ساخت کی نظر میں اصل اہمیت دور نبوی کو نہیں دور اموی کو حاصل ہے، اس طرح قرآن و سنت اور ان کے فقہوں میں ساخت کے نزدیک اسلامی قانون کی ابتدا اسلامی دور، نہ مابعد، نہ سرخشمہ، اس طرح ساخت کی نظر میں سارا حدیثی سرمایہ جعلی و وضعی قرار دے کر رد کر دیا جاتا ہے، اور فقہ قرآنیہ کو اگرچہ محرف یا جعلی قرار نہیں دیا جاسکتا تاہم فقہ اسلامی کے ماخذ کی حیثیت سے علاء ان کی اہمیت کا انکار کر دیا جاتا ہے۔

ساخت کے ان نظریات کی بنیاد اسی مفروضے پر قائم ہے کہ پہلی صدی ہجری میں قانون دین اسلام کے دائرے کے باہر ایک قطعاً اجنبی چیز تھی، دوسری صدی ہجری میں اسے دین اسلام کے دائرے میں شامل کیا گیا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مطمح نظر ہرگز کسی تشریحی نظام کا قیام نہ تھا، آپ کا مقصد فقط اخلاقی اصلاح تھا، مگر قرآن کریم خود ساخت کے ان مفروضات کی بلند آہنگی کے ساتھ تردید کرتا ہے، قرآن قانون و اخلاق کے اس جوہری اور بنیادی فرق اور علیحدگی کا سرے سے قائل نہیں جو خالصتہً مغرب کی پیداوار ہے، اور جسے ساخت نے فقہ اسلامی کی تعبیر کے سلسلے میں رہنما اصول کے طور پر برتا ہے، قرآن کریم ہر قانونی حکم کو کسی نہ کسی اخلاقی قدر سے مربوط کرتا ہے اور دونوں کو کسی نہ کسی صفت خداوندی سے وابستہ کر دیتا ہے اور اس طرح ایمان و اخلاق اور قانون کو ایک مسلسل غیر منقطع رشتے میں پروردیتا ہے، اسی طرح قرآن نے خالص مذہبی، اخلاقی، قانونی، عدالتی، فوجداری، دیوانی، غرض کہ سارے معاملات کے بارے میں خدا اور رسول کے حکم کے آگے غیر مشروط اطاعت کا مطالبہ کیا ہے، خود قرآن رسول کریم کے ہر فیصلے کو چاہے اس کا دائرہ کار کچھ بھی ہو، آخری اور ناقابل مرافقہ حیثیت دیتا ہے۔ قرآن کریم کا سرسری مطالعہ بھی یہ واضح کر دیتا ہے، کہ قرآن انسان کے دل و دماغ میں یہ جذبہ اور فکر پیدا کرنا چاہتا ہے کہ ہر معاملے میں خدا اور رسول کی طرف رجوع کیا جائے، پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ قانون جو انسان کے خارجی اعمال و افعال کی ضابطہ بندی ہی کا دوسرا نام ہے، وہ قرآن کے دائرہ عمل سے باہر رہے، علاوہ بریں ساخت نے اس بات کو بالکل نظر انداز کر دیا کہ اسلامی قانون کی ابتدا اموی دور سے یعنی سلسلہ ہجری سے کرنے کے نتیجے میں اس نے ایک ایسا معاشرتی قانونی خلا پیدا کیا جسے وہ کسی طرح سے پُر نہیں کر سکتا، یہ تصور کہ پوری ایک صدی تک اسلامی معاشرہ بغیر کسی قانون کے رہا، ایک ایسا عجیب و غریب نظریہ ہے کہ اسے کسی درجے میں تسلیم کرنا ممکن نہیں، پورے تین سو سال تک قانون یعنی اسلام کے پیروں کے خارجی اعمال و افعال کی ضابطہ بندی کے لئے کوئی چیز موجود نہیں تھی، سوائے عربی مادۃ

اور رسم و رواج کے ایک ایسی بات ہے جسے کہنے اور ماننے کے لئے بڑی دیدہ دلیری اور واقعات و حالات سے لگائیں چرانے کی جرأت کی ضرورت ہے، شناخت کا دعویٰ دراصل یہ ہے کہ ان سو سال کے دوران اسلامی معاشرے نے قانونی ماخذ کے طور پر نہ تو قرآن کو درخور اعتنا سمجھا نہ حدیث کو بلکہ قانونی ماخذ کے طور پر وہ ان رسم و رواج عرف و عادت کو جو قبل اسلام کے جاہلی معاشرے کی باقیات تھیں، نیز خلافت اسلامیہ سے طلحہ ملکوں اور قوموں کے رسم و رواج کو قانونی ماخذ کے طور پر استعمال کرتے رہے، یہ وہی کس حد تک واقعات کے مطابق ہے اور کہاں تک اہل بصیرت کے نزدیک قابل قبول، خود ارباب فکر اس کا فیصلہ کر سکتے ہیں یہ سمجھنا اور سمجھانے کی کوشش کرنا کہ سو سال کا یہ زمانہ جو انسانی تاریخ کا سب سے زیادہ انقلابی، نتائج خیز، فکر انگیز اور تغیر و تبدل سے لبریز دور ہے، ہمارے پیش آنے والے چیلنجوں کا جواب قانونی سطح پر ذور جاہلیت اور طلحہ ملکوں کے رسم و رواج کے ذریعے دیتا رہا، دیوانے کا خواب نہ کہا جائے تو کیا کہا جائے، استعینا باللہ العلیٰ و العزیز

یہودیت اس بے جگری کے ساتھ شاید ہی کبھی اس سے پہلے اسلام کے قلب و جگر پر حملہ آور ہوئی ہو، ہماری بے بسی اور بے حسی یہ ہے کہ ہم اسلامی قانون کی تاریخ پڑھنے اور سمجھنے کے لئے آج بھی اعدائے اسلام کی کچھ فکر یوں کے محتاج ہیں۔ ہمارے پاس آج بھی فقہ اسلامی کے اولین دور کو سمجھنے کے لئے مسلمان اہل قلم کی معیاری علمی تحریریں موجود نہیں، کیا اس فکری تہی دستی کو دور کرنے کے لئے دارالمصنفین جیسا واقع ادارہ کچھ کرنے کے بارے میں سوچ رہا ہے،

# مستشرقین اور سیر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

از

ڈاکٹر عماد الدین خلیل، موصل یونیورسٹی، عراق

مترجمہ :- حافظ محمد عمیر الصمدی، دریا بادی نندری، رفیق دارالمصنفین

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق مستشرقین کے موقف کی تشکیل ایک ایسے دینی دائرہ کے اندر ہوتی ہے جس میں قومی تعصب، ذہنی تشنج، بغض و کینہ اور نفرت و کدورت کی کارفرمائی ہوتی ہے، اور ان کی ارادی و غیر ارادی دونوں طرح کی جمالت اس کا احاطہ کرتی ہے، اسی لیے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت اور عام لوگوں کے درمیان ناقابل عبور گھاٹیاں اور تہ بہ تہ تباہیکیاں مائل ہو گئیں، مگر محمد رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق مستشرقین کی بحث و تحقیق اور ان کا مطالعہ و تجزیہ نہ معروضی و موضوعی ہے اور نہ تاریخی و علمی، بلکہ وہ سب دشمنی کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جس میں کلیسا کی دینی اور تقدس آف شخصیتوں کے ساتھ غیر دینی اور لامذہبی افراد بھی برابر حصّے لیتے رہے ہیں، اور یہ سیلاب بلاخیز آج تک رواں ہے۔

مستشرقین نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو کچھ ہرزہ سرانی کی ہے، اسے بطور استشہاد پیش کرنے کے لئے بھی طبیعت آمادہ نہیں ہوتی ہے، اور قلم میں لرزش پیدا ہو جاتی ہے، مگر نقل کفر کفر نہ باشد کے بموجب ان کے بعض ہفتوات نقل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں معلوم ہوتا، یہ خیالات دور جدید کے مستشرقین کے ہیں، جن میں سے بعض ابھی بقید حیات بھی ہیں، ایک مستشرق مونیسیور کولی اپنی کتاب "البحث عن الدین الحق" میں لکھتے ہیں :

"مشرق میں ایک نئے دشمن اسلام کا ظہور ہوا جس کی بنیاد اور تعمیر طاقت اور شدید تعصب پر قائم ہے، محمد نے اپنے پیروؤں کے ہاتھوں میں تلواروں سے کراخلاق کے مقدس ترین ضابطے پامال کر ڈالے اور اپنے ساتھیوں کو فسق و فجور اور لوٹ کھسوٹ کی اجازت دیدی، لڑائیوں میں قتل ہو جانے والوں سے وعدہ کیا کہ وہ جنت کی دائمی لذتوں سے لطف اندوز ہوں گے، چنانچہ ہی عرصہ میں ان کے متبعین نے ایشیائے کوچک، افریقہ اور اسپین کو اپنا شکار بنالیا، ان کی وجہ سے اٹلی کو خطرہ درپیش ہوا، آدھا فرانس بھی ان



ان لوگوں ہاتھوں برباد ہو گیا، اور تہذیب و تمدن پر سخت افتاد آئی، یہ عیسائیت تھی، جس نے اسلام کی فاتحانہ پیش قدمی پر روک لگائی، اور تقریباً دو سو برس تک صلیبی جنگیں ہوتی رہیں، جن کے نتیجے میں یورپ میں اسلحے عام ہوئے، تب عیسائیت کو نجات ملی، اور صلیبی جھنڈے کے سامنے ہلالی پرچم سرنگوں ہوا اور انجیل نے قرآن اور اس کے معمولی اور گھٹیا قوانین اخلاق پر فتح حاصل کی، ایک اور مشرق سیوکیوں اپنی کتاب مینٹھا لوجی آف اسلام میں لکھتے ہیں :-

”دین محمدیؐ، جذام کی بیماری کی طرح لوگوں میں پھیلا، اور اس نے ان کی دھجیاں بکھیر دیں یہی نہیں، بلکہ وہ ایک خوفناک مرض اور ایسا پاگل پن ہے، جو ان کو انتہائی کمزوری اور سستی پر آمادہ کرتا ہے، اور اگر بیدار بھی کرتا ہے، تو صرف خون ریزی، شراب خوری اور دوسری ساری برائیوں کے لئے، مکہ میں (۶) محمدؐ کی قبر بجلی کا ایسا ستون ہے، جو مسلمانوں کے سروں میں جنونی کیفیت پیدا کر دیتا ہے، اور انھیں ہڈیاں، ہٹھریا، عقل فراموشی اور اللہ اللہ کے الفاظ کی رٹ لگانے پر مجبور کر دیتا ہے اور جو چیزیں اصل فطرت کو مرغوب ہیں، ان سے نفرت کا خوگر بناتا ہے، مثلاً تم خنزیر، شراب اور موسیقی وغیرہ اور ان میں سنگدلی اور فسق و فجور کے جذبات و خیالات کی پرورش کرتا ہے؟“

مشرق بویلیان اپنی کتاب تاریخ فرانس میں لکھتے ہیں :-

”محمدؐ مسلمانوں کے مذہب کے بانی ہیں، انھوں نے اپنے متبعین کو حکم دیا کہ وہ دنیا کو زیر کریں، اور سادہ مذاہب کو تبدیل کر کے اپنے مذہب کا بول بالا کریں، ان بت پرستوں (مسلمانوں) اور عیسائیوں میں کتنا بٹا فرق ہے، عربوں نے اپنے مذہب کو طاقت سے لوگوں پر مسلط کیا، اور لوگوں سے کہا کہ اسلام لاؤ، ورنہ موت کے لئے تیار ہو جاؤ، جبکہ مسیح کے ماننے والوں نے اپنی نیکی اور حسن سلوک سے لوگوں کو راحت بخشی، اگر یہ عرب ہم پر فتح یاب ہو جاتے، تو خدا جانے دنیا کی کیا حالت ہوتی، آج ہم بھی اجزائی اور مراکشی مسلمانوں جیسے ہوتے“

ڈاکٹر گلور نے اپنی کتاب ”تقدم التبشیر العالمی“ (عالمی مشنریوں کی ترقی) میں، جون ۱۹۶۶ء میں نیویارک سے شائع

ہوئی ہے، ان خیالات کا اظہار کیا ہے :-

”محمدؐ کی تلوار اور قرآن، یہ دونوں تہذیب، حریت اور حق کے سب سے بڑے دشمن ہیں، اور دنیا پر اب تک جو تباہی و بربادی منڈلا رہی ہے، اس کے سب سے بڑے باعث یہی ہیں، جس طرح قرآن، حقائق و خرافات اور قوانین اور دیومالائی تصورات کا عجیب و غریب مجموعہ ہے، اسی طرح تاریخی غلطیوں اور باطل خیالات کی بھی آمیزش آمیزش ہے، اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ وہ نہایت پھپھیدہ ہے، اس کی کسی خاص تفسیر کے بغیر اسے کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا، مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ ان کا معبود وہ اللہ ہے جو نہا ہے، بے نیاز ہے، اس کا نہ کوئی باپ ہے، اور نہ بیٹا، گویا اللہ ایسا ظالم و جاہل ہے، جس کو اپنی مخلوق و رعایا سے کوئی تعلق نہیں، حالانکہ اسلام ان دونوں کے ربا و تعلق کا ذکر کرتا ہے، محمدؐ ایک آمر مطلق تھے، ان کا خیال تھا کہ قوم پر بادشاہ کا تو یہ حق ہے کہ وہ اس کی مرضی پر چلے، مگر بادشاہ جو چاہے من مانی کرے، خود محمدؐ کی فطرت میں بھی یہ بات داخل تھی، چنانچہ جو ان کی مرضی پر چلے وہ اسے قابل گردانے زدن سمجھتے تھے، ان کا عربی لشکر تباہی و بربادی اور غلبہ و تسلط کا پیاسا تھا، جس کو اس کے پیغمبر نے ہدایت بھی دی تھی کہ جو ان کی اتباع کو نامنظور کرے، اور ان کے راستے سے دور ہو جائے اسے قتل کر دیں۔“

مشرق سفاری نے ۱۵۲ء میں قرآن مجید کا ترجمہ کیا تھا، ان کا خیال ہے کہ:

”محمدؐ نے اقتدار الہی کا اسی لئے سہارا لیا، تاکہ لوگ اس عقیدہ کو (آسانی سے) قبول کریں!

پھر انھوں نے خود پر بحیثیت رسول اللہ کے ایمان لانے کا مطالبہ کیا، حالانکہ یہ اعتقاد محض ایک فریب تھا، جس کو عقلی ضرورت نے جنم دیا تھا.....“

اس کج بحثی اور یادہ گوئی نے دراصل اسلام اور صلیبیت کے درمیان خلیج حائل کر دی اور دونوں میں ایسی شدید کشمکش پیدا کر دی، جس کے نتیجے میں صلیبی جنگوں کے تلخ و تند گھونٹ آج تک یورپ کے حلق سے نیچے نہیں ترسے اور نہ ہی وہ اس تلخی کو فراموش کر سکا ہے، نو مسلم محمدؐ (سابق لیوپولڈ وین)، ایک تلخ تجربہ کی طرح یہ حقیقت بیان کر چکے ہیں، کہ اسلام سے متعلق، یورپ کو ورثہ میں جو حقارت کے جذبات ملے وہ غیر عقلی تعصب کی صورت میں ان کی علمی بحثوں میں ظاہر ہو رہے ہیں، اور تاریخ نے یورپ اور عالم اسلام کے درمیان صلیبی جنگوں کے زمانہ

سے جو خلیج پیدا کی، اس پر کوئی پل نہیں بن سکا، اور نہ صرف یہ کہ باقی ہے، بلکہ اسلام کی تحقیر و تذلیل یورپ کے طرز فکر کا بنیاد  
حصہ بن چکی ہے، درحقیقت یورپ کے اولین مستشرقین نے موجود دور میں عیسائی مشنریوں کا رنگ روپ اختیار کر لیا ہے جن کی  
ریشہ دو دنیاں عالم اسلام میں جاری ہیں، ان لوگوں نے اسلامی تعلیمات اور اسلامی تاریخ کی ایسی مسخ اور بگڑی ہوئی  
تصویر پیش کی ہے، کہ وہ یورپ کے عیسائیوں کو ایک بت پرست مذہب نظر آتا ہے، گو بعد میں علوم استشرق، مشنریوں  
کے اثر سے آزاد ہو گئے، اس لئے ان پر جانبداری اور غیر عقلی رویہ اختیار کرنے اور مذہبی حمیت اور تعصب سے کام لینے کا  
الزام بھی نہیں عائد کیا جاسکتا، تاہم مستشرقین کو اسلام دشمنی ورثہ میں ملی ہے، اور وہ ان کی گھٹی میں داخل ہے، اس کا سبب  
صرف صلیبی جنگیں ہی نہیں، خود اسلام ہے، جو ان کی نظر میں سب سے بڑا خطرہ ہے، جیسا کہ لارنس براؤن نے اپنی کتاب میں یہ  
لکھا ہے کہ اسلام کے اندر جو وسعت اور اپنی بات کو منوانے کی جو طاقت نیز حرکت و حرارت اور توانائی پوشیدہ ہے، اس کی  
وجہ سے وہ یورپ کے سامراج کی راہ میں تہا دیوار اور کاوٹ ہے، اسی قسم کے خیالات کا اظہار دی سلم ورڈ مطبوعہ

۱۹۳۰ء کے ایک مضمون میں کیا گیا ہے: ✓ (۱)

"مغرب کی دنیا پر جو خوف، دہشت کا طاری ہونا ضروری ہے جس کے چند اسباب ہیں، اسلام کا جب سے  
کہ میں ظور ہوا، وہ عدوی لحاظ سے کبھی کمزور نہیں رہا، بلکہ ہمیشہ بڑھتا اور پھیلتا رہا، اور اسلام صرف  
ایک مذہب ہی نہیں ہے، بلکہ اس کے بنیادی ارکان میں جہاد بھی شامل ہے، ایسا اتفاق کبھی نہیں ہوا  
کہ کچھ لوگ اسلام میں داخل ہونے کے بعد دوبارہ عیسائی ہو گئے ہوں۔"

جرمن مستشرق بیکر نے صراحت کے ساتھ کہا کہ :-

"عیسائیت کی اسلام دشمنی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اسلام جب قرون وسطیٰ میں پھیلا تو وہ عیسائیت کے  
فروغ کی راہ میں ایک طاقتور پستہ بن گیا، اور ان ملکوں پر بھی حاوی ہو گیا، جو عیسائیت کو زنگین تھوڑے  
ایسے پُر از تعصب ماحول اور کلیائی طرز فکر کے ہوتے ہوئے کس کو اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کی اصل  
روح و حقیقت کو سمجھنے سے دلچسپی اور رغبت ہو سکتی تھی، یورپ میں مذہبی اصلاح اور روشنی دہیاری کے زمانہ میں بین  
کوسیا سے جدا کر دیا گیا، یہاں تک کہ بیسویں صدی آگئی، لیکن اسلام اور خصوصاً سیرت نبویؐ کے بارہ میں عیسائیت  
کے طرز فکر میں شتمہ برابر تبدیلی نہیں ہوئی، بلکہ اس تعصب پر مبنی طرز فکر کی تقویت کے لئے ایسے سلیج تیار ہوتے رہے، اور



اسلامیات کے تجزیہ اور پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کے مطالعہ کے لئے نسلوں کی نسلیں ان ایٹھوں پر اپنی اداکاری کا مظاہرہ کرتی رہیں، اسی قسم کے لوگ مستشرقین کے نام سے مشہور ہیں، ان میں سے بعض تو خالص کلیا کے آدمی تھے جو پادریوں کے لباس میں ملبوس تھے، لیکن ان کی اکثریت ان لوگوں پر مشتمل ہے، جن کو کلیا سے کوئی سرکاری تعلق اور واسطہ نہیں تھا، ان سے یہ توقع ضرور تھی کہ پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) پر ان کے حملوں میں نرمی ہوگی، اور پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شخصیت اور کارناموں سے متعلق ان کا گذشتہ موقف اور نظریہ بدلا ہوا ہوگا، اور ایک حد تک ایسا ہوا بھی چنانچہ لب و لہجہ اور سب و شتم میں کچھ شائستگی آگئی، لیکن طرز فکر میں کوئی تبدیلی نہیں آئی، سیرت نبوی سے ناواقفیت اور اس کے مباحث میں تعصب کی کارفرمایاں بدستور جاری رہیں، بے سرو پا تعلیل و تجزیہ کی مشقیں ہوتی رہیں، دانہ غلط فہمیوں کی تکرار ہوتی رہی، یہاں تک کہ جو محض وہم و خیال، تعصب اور تنگ نظری کی پیداوار تھا، اور جس کی بنیاد مستند واقعات کے بجائے شاذ اور غیر مستند روایات پر تھی، وہ لوگوں کی نگاہ میں یقین، اعتماد اور اعتبار کے درجہ تک پہنچ گیا۔ طرز فکر، انداز بحث اور طریقہ تحقیق میں مستشرقین نے جو بنیادی غلطیاں کی ہیں، ان میں سے کچھ کی ذیل نشاندہی کی جاتی ہے، اور اسی ضمن میں اس قبیل کی بعض اور غلطیوں کی جانب ہم اشارہ کریں گے۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ بعض اوقات مستشرقین ضعیف روایات کو لے کر انہی کی بنیاد پر اپنا فیصلہ صادر کر دیتے ہیں، اور ان کی تقویت کے لئے شاذ و غریب حدیث کو پیش کرتے ہیں، اور اسے مشہور و مستند روایت پر ترجیح دیدیتے ہیں، خواہ وہ نقد و جرح کی کسوٹی پر کتنی ہی کھوٹی کیوں نہ ثابت ہو، یہ لوگ ایسا قصداً اس لئے کرتے ہیں کہ یہی وہ داہد جہہ ہے جس سے وہ شکوک و شبہات کو ہوا دیتے ہیں،

دوسرے یہ کہ سیرت نبوی کے واقعات اور کارناموں کو وہ عیسائی یا یہودی اصولوں کی دین سمجھتے ہیں، مستشرقین کی بڑی تعداد نصرانی اور مسیحی ہے، اس لئے وہ اسلام کے محاسن کا اصل سہرا عیسائیت کے سر باندھتے ہیں، اور جو مستشرقین یہودی ہیں وہ اسرائیل کے قیام اور صہیونیت کے تسلط کے بعد خاص طور پر اس بات کی کوشش کرتے ہیں، کہ ہر عربی اور اسلامی چیز کا سہرا یہودیت سے ملا دیں، درحقیقت اس باب میں دونوں گروہ اپنے میلانات و خواہشات کے تابع ہیں، مثلاً برطانوی مستشرق مانٹگرمی واپٹ کہتے ہیں کہ "اپنے گھر والوں کے ساتھ یا ان کے بغیر محمد کی غار حرا میں آمد و رفت کوئی نامکن بات نہیں، یہ بھی ممکن ہے کہ موسم گرما میں شہر مکہ کی سخت گرمی کی وجہ سے جو لوگ طائف نہیں جاسکتے تھے، وہ غار حرا میں

چلے جاتے رہے ہوں گے ہو سکتا ہے کہ وہ یہودی اور عیسائی خصوصاً راہبوں کے اثر کی وجہ سے وہاں گئے ہوں، یا ہو سکتا ہے کہ خود محمدؐ کے ذاتی تجربہ نے ان میں بقائے دوام اور حیاتِ جاودانی کی آرزو، اُمنگ اور رغبت پیدا کی ہو، یہی مشرقِ دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ ناموس کا لفظ یونانی لفظ (Moms) سے مشتق ہے، جس کے معنی شریعت یا کتب مقدسہ کے ہیں، موسیٰؑ کے ذکر میں بھی یہ لفظ ملتا ہے، اور ورقہ بن نوفل نے جب محمدؐ پر وحی کی کیفیت دیکھی تو اسی ناموس کے لفظ سے اس کو تعبیر کیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ محمدؐ پر جو کچھ نازل ہوا وہ یہودیوں اور عیسائیوں کی مقدس کتابوں کے مشابہ و مماثل ہے، مگر محمدؐ کو یہ وہم تھا کہ وہ ایک قوم کے بانی اور اس کے شارع ہیں، اور جیسا کہ ابتدا میں ہوتا ہے، محمدؐ شروع میں طبعی طور سے مترود تھے، اس وقت ورقہ بن نوفل کی حوصلہ افزائی، محمدؐ کی داخلی کیفیات کے لئے اہم چیز ثابت ہوئی اسی لئے بعد کی اسلامی تعلیمات، ورقہ بن نوفل کے افکار سے بہت زیادہ متاثر نظر آتی ہیں“

اسلام پر پہلی نظر ڈالنے ہی سے یہ شبہہ رفع ہو جاتا ہے، اور معلوم ہو جاتا ہے کہ اس میں اور عیسائیت میں کوئی مشابہت نہیں ہے، لیکن اور گہری نظر سے دیکھا جائے تو دونوں کے بنیادی اختلافات بھی سامنے آجاتے ہیں، یہی حقیقت تھی جس نے ماضی میں مشنریوں کے مبلغوں کو بھڑکا دیا تھا، حال ہی میں پن گون سیریز کی ایک کتاب میں ایک پادری مشرق نے ایسے کئی موازنے کئے ہیں، جن میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اسلام اصلاً مسیحیت کی مسخ شدہ یا ناپختہ صورت ہے، مشہور مشرق کا نٹ ویل اسمتھ نے بھی اسلام اور مسیحیت میں یکسانی اور مشابہت کا ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کی ایک دوسرے سے نفرت اور دوری کی ایک وجہ یہ بھی ہے، کہ دونوں فریقوں نے ایک دوسرے کے عقائد کو سمجھنے میں غلطی سے کام لیا ہے، ان میں سے ہر ایک نے دوسرے کے عقیدہ کو کبھی اسی صورت میں پیش کرنے اور ڈھالنے کی کوشش کی جس صورت میں وہ خود اس عقیدہ پر ایمان رکھتا ہے، لیکن بہت سے دوسرے خیالات کی طرح یہ رائے بھی منصفانہ نہیں ہے، کیونکہ تنہا عیسائی ہی صدیوں سے اسلام کو سمجھنے بلکہ غلط سمجھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، ان کی یہ کوشش، عیسائی اصطلاحات کے ذریعہ سے ہوتی رہی ہے، اس کا انجام ظاہر ہے کہ بد فہمی اور بد عقیدگی کے علاوہ کیا ہو سکتا تھا، دوسری جانب مسلمانوں کا بنیادی زاویہ نگاہ ہمیشہ ایک ہی حالت میں رہا، کیونکہ یہ نقطہ نظر، قرآن کا عطا کردہ تھا، اسی لئے کسی مسلمان نے کبھی یہ کوشش نہیں کی کہ وہ عیسائیت کو کسی اور فریم میں اتارے، لیکن ایک عیسائی اپنی مقدس کتابوں میں ایسی صراحت نہیں پاتا ہے جو اس کو اسلام کے بارے میں ایک مسلمان کے اعتقاد و نقطہ نظر

کو قبول کرنے سے روک دے، اس کے باوجود وہ نہ صرف عیسائیت کے بارہ میں مسلمانوں کے اعتقاد کو رد کرتا ہے، بلکہ اسلام سے متعلق اس کی رائے کو بھی رد کرتا ہے، اور دونوں راہوں کو تبدیل کرنے میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھتا۔ یہ پرانے عیسائی مبلغ (کانٹنٹ ویل) اسٹورٹس اپنے قارئین کی ذہانت کا شاید احترام بھی نہیں کرتے، چنانچہ اپنے ایک مقالہ کے مقدمہ میں علی الاعلان یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اپنے معروضی اور خالص موضوعی مطالعہ کے بعد وہ صحیح معلومات پیش کر رہے ہیں، تاکہ انھیں صحیح اور محقق تسلیم کیا جائے، لیکن ان سب کے باوجود دوران بحث میں بڑے یقین کے ساتھ لکھتے ہیں کہ اب کبھی ظہور پر بھی اس حقیقت میں شک کی گنجائش باقی نہیں رہی کہ محمدؐ نے یہودیوں کی کتب تلمود اور دوسرے بعض تحریر شدہ صحیفوں کے افکار کو پیش کیا ہے اور مسیحیت کی نسبت و تعلق سے تو اس کا قوی احتمال ہے کہ محمدؐ کی وحی میں اس سے مدد لی گئی ہے، معروضی و موضوعی مطالعہ کا دعویٰ کرنے والے ان مستشرق کی یہ شاعرانہ خیال آرائی بھی لائق توجہ ہے، جو مقالہ کے آخر میں درج ہے کہ دنیا والوں کو غور کرنا چاہئے کہ اس وقت کیا صورت پیش آئے گی، جب لاکھوں مسلمانوں کے سامنے زندہ مسیح کی انجیل کو مناسب طور پر پیش کیا جائے گا۔

تیسری غلطی یہ ہے کہ یہ مستشرقین، اپنے مطالعہ میں معکوس طریقہ و نبح اختیار کرتے ہیں، اور نتائج کے استنباط میں بجا عقل کے ذوق پر اعتماد کرتے ہیں، ڈاکٹر جوآد علی نے لکھا ہے کہ اولین اکابر مستشرقین میں کیتانی اس طرز کے نمایاں نمائندہ تھے، اور آج تاریخ اسلام کے نئے ماہرین، انہی کے نقش قدم پر گامزن ہیں، یہ لوگ بنیادی طور پر ایک غلط فکر کو مدنظر رکھ کر اپنا مطالعہ شروع کرتے ہیں، پہلے سے رائے قائم کرتے ہیں، اور پھر واقعات میں ایسی چیزوں کو تلاش کرتے ہیں جو ان کی راہوں کی کسی بھی درجہ میں تائید کرتی ہوں، باقی باتوں کو وہ خارج از بحث قرار دیتے ہیں، کیتانی ذی رائے اور صاحب فکر تھے، انھوں نے سیرت نبویؐ کی تدوین سے پہلے ہی اس کے متعلق کچھ مخصوص خیالات قائم کر لئے تھے، چنانچہ جب انھوں نے سیرت سازی شروع کی، تو رطب و یابس ہر قسم کی روایتوں پر اعتماد کر لیا، اور ان روایتوں کو خاص طور پر قبول کر لیا جن سے ان کے موقف کی تائید ہوتی تھی، اور ان کے ضعف یا قبح کی کوئی پردا نہ کی، بلکہ انھیں دلیل بنالیا، اور پھر انہی کو مطابق اپنا فیصلہ بھی صادر کر دیا، حالانکہ یقین ہے کہ وہ علیؑ کے فن کے نزدیک وضعی اور جھوٹی روایات کے مشہور طرق و سلاسل سے واقف رہے ہوں گے، لیکن وہ علماء کے اقوال و آراء سے چشم پوشی کر گئے، وجہ ظاہر ہے کہ وہ صاحب فکر تھے، انھیں اپنے خیال کو ثابت کرنا تھا، خواہ جس طریقہ سے بھی یہ ممکن ہو، اگر وہ جدید طرز و اسلوب کے مطابق نقد و جرح سے کام لیتے اور



غلط روایات کو رد کرتے، تو پھر "سیرت سازی" کا کارنامہ کیسے انجام دیتے، نو مسلم مستشرق ایتن ڈینیہ اپنی کتاب اللہ کا میرا الغرب "مستشرق مغرب کی نظر میں" میں اس طرز و نہج کے متعلق بعض باتیں خوب لکھ گئے ہیں، فرماتے ہیں کہ ڈاکٹر اسنوگ میر گونج کی یہ رائے درست ہے، کہ "محمدؐ کی جدید سیرت سے اندازہ ہوتا ہے، کہ اگر آپ کسی نظریہ یا کسی رائے کے متعلق تمسخر کا رویہ اختیار کرتے ہیں، تو گویا تاریخی مباحث کے بائجھ اور بے جان ہونے کا اعلان کر رہے ہیں" اس حقیقت کو موجودہ مستشرقین کو بھی اپنے پیش نظر رکھنا بہتر ہوگا، کیونکہ اس سے انھیں اُن پرانے امراض سے چھٹکارا ملے گا، جنکی وجہ سے ان کو مقدور سے زیادہ محنت و زحمت کرنی پڑتی ہے، اور بلا شک و شبہ غلط نتائج تک جا پہنچتے ہیں، اور لامیالمہ انھیں اس کی ضرورت پیش آتی ہے، کہ وہ اپنے کسی خیال کی تائید کے لئے بعض روایتوں کو باطل قرار دے کر ان کی جگہ دوسری روایتوں کو گھڑ کر پیش کریں، اور یہ ظاہر ہے کہ بڑا مشکل کام ہے، بیسویں صدی میں ایک عالم کے لئے صرف اسی صلاحیت کا ہونا کافی نہیں ہے، بلکہ اس کو زمانہ، ماحول، مقام، رسوم اور ضروریات، رجحان اور میلانات سب سے بنیادی عوامل کی معرفت بھی ضروری ہے، اور اس سے بھی بڑھ کر ان باطنی عوامل کا شعور بھی لازمی ہے، جو عقل و قیاس کے پیمانوں سے پرے ہیں اور جو افراد و جماعت میں بہر حال اپنی تاثیر رکھتے ہیں، انگریزی و اطالوی فرانسیسی مستشرق لائانس پر اسی قسم کے الزامات عائد کئے ہیں، جن کے مرتکب اکثر مستشرقین ہوئے ہیں، کہ وہ کج اسلوب ہیں، اور معکوس طریقہ اختیار کرتے ہیں، ان کا مطالعہ ہی غلط ہے، خاص طور پر تاریخی واقعات سے اپنی ذاتی رایوں کو یہ لوگ جس طرح مدلل کرتے ہیں، وہ مطالعہ و تجزیہ کے نام پر ایک بدناما داغ ہے، افسوس ہوتا ہے کہ لائانس جیسے مستشرق، دلائل کو اکثر و بیشتر غلط رخ دیدیتے ہیں، ان کا یہ قطعاً علمی نہیں ہے، معروضیت و موضوعیت کی پرداہ کے بغیر وہ اپنے خاص معتقدات و افکار کی تائید میں ایک خیال کو چھوڑ کر دوسرا خیال اپنالیتے ہیں، مثلاً ایک عبارت میں "الاحابیش و عبید اهل مكة" کا جملہ ہے، اس میں داؤد تفسیر ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ احابیش عبید مکہ کے ضمن میں شامل ہیں، ایک اور عبارت میں ہے "الاحابیش دمن اطاعہم اتی القریشین من قبائل کنانہ و تھامہ" یہاں پر داؤد تمیز نام پر دلالت کر رہا ہے، لیکن لائانس نے اس عام نحوی قاعدہ کے برخلاف، اس عبارت کی تشریح اپنے خیال کے مطابق کی، اپنی پسند اور مرضی کے مطابق تاریخی واقعات کی تفسیر اور ان سے استنباط کی سینکڑوں مثالیں ان مستشرقین کی کتابوں میں موجود ہیں، مثلاً بروکلیمان نے غزوہ احزاب کو سلسلہ میں کہیں اس کی جانب اشارہ بھی نہیں کیا کہ مدینہ پر عرب کے قبائل کو حملہ کرنے کے لئے اُکسانے میں یہود کا حصہ تھا، ادا

نہ یہ ذکر کیا کہ آزمائش اور امتحان کی سخت ترین گھڑی میں بنو قریظہ نے رسول اللہ ﷺ سے اپنے معاہدہ کو توڑ دیا تھا، بلکہ وہ صرف اتنا کہتے ہیں کہ پھر مسلمانوں نے بنو قریظہ پر حملہ کر دیا، جن کا رویہ بہر حال خاموش و پوشیدہ تھا، مستشرقین اسرائیل و فلسطین نے غزوہ خندق میں نعیم بن مسعود کے واقعہ سے چشم پوشی کر کے صرف یہ لکھا ہے کہ یہ واقعہ مشرکین اور یہود کے درمیان عدم اعتماد کی وجہ سے پیش آیا، اس طرح وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یہودیوں کے لئے دھوکہ دینا ممکن ہی نہیں تھا۔

چوتھی بات یہ ہے کہ مستشرقین، اسلام دشمن عناصر پر بڑے مہربان ہوتے ہیں، خصوصاً یہودیوں کے لئے وہ اپنے دل میں بڑا نرم گوشہ رکھتے ہیں، اسرائیل و فلسطین بنو نضیر کے یہود پر مسلمانوں کے حملے کے سلسلہ میں اس کی جانب تو اشارہ کرتے ہیں کہ مورخین عرب کے نزدیک مسلمانوں کے حملہ کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں نے رسول اللہ ﷺ پر قاتلانہ حملہ کی سازش کی تھی، لیکن وہ کہتے ہیں، کہ مستشرقین اس روایت کی صحت کو قبول نہیں کرتے، ان کی دلیل یہ ہے کہ سورہ حشر میں جو بنو نضیر کی جلا وطنی کے بعد نازل ہوئی تھی، کہیں اس سازش کا ذکر نہیں ہے، وہ جوش میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ ہر حتم مینا رکھنے والا یہ سمجھ سکتا ہے، کہ بھلا ایسے حالات میں یہود کب یہ سازش کر سکتے تھے، اور اگر ان کو یہ سازش کرنی بھی ہوتی، تو وہ بجائے اس کے کہ آپ پر دیوار سے بھاری پتھر پھینکتے، آپ کو اچانک گھات میں پا کر قتل کر دیتے، اسرائیل و فلسطین شاید یہودیوں کی نفیات سے واقف نہیں، کہ یہ وہ قوم ہے جو آخر وقت تک کسی بھی وقت براہ راست تصادم سے بچتی رہتی ہے، بروکلان لکھتے ہیں، کہ مشرکین پر رسول اللہ ﷺ کے باقاعدہ حملہ اور لشکر کشی کی راہ میں بعض دقتیں اور رکاوٹیں تھیں، قدیم عربی شرافت فکر ماجرین کو اپنے قریشی بھائیوں سے جنگ کرنے سے روکتی تھی، مدینہ والے، اپنے طاقتور پڑوسیوں سے صلح و امن کی فضا کو خراب آلودہ کرنا نہیں چاہتے تھے، آخر کار رجب کا مہینہ آیا تو رسول اللہ ﷺ نے خفیہ احکام کے ساتھ ایک فوجی دستہ کو روانہ کیا، جس نے ایک تجارتی قافلہ پر اچانک حملہ کیا، اور کافی مال غنیمت کے ساتھ مدینہ واپس ہوا اس قدیم ضابطہ اخلاق کی قانون شکنی نے خود مدینہ میں نفرت کے جذبات بھڑکا دیئے تھے، مگر محمد نے اپنے پیروؤں کے عمل پر محض ہلکی سی نیکی کی اور کہا کہ ان لوگوں سے ان کا حکم سمجھنے میں سہو ہو گیا ہے، گو کہ ان لوگوں نے محمد ہی کی خواہش کے مطابق عمل کیا تھا، بروکلان ایک جگہ لکھتے ہیں کہ محمد کا عہد ابھی زیادہ نہیں گزرا تھا کہ ان کے اور اجبار یہود کے درمیان نزاع شروع ہو گئی، واقعہ یہ ہے کہ محمد دور دراز علاقہ میں، اپنے محدود علم کے باوجود یہودی علماء و علم دادر اک میں نبی امی سے

بڑھ کر تھے؛ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ محمد کے لئے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ اپنی فوج کی گرتی ہوئی ساکھ کو کسی دوسری صورت سے بحال کریں، چنانچہ غزوہ اہد کی شکست کے بعد ایک معمولی سی بات پر انھوں نے بنو نضیر پر حملہ کر دیا، مشرق و لہاذن لکھتے ہیں کہ غزوہ بدر کے بعد اسلام اپنی رواداری کی پالیسی پر قائم نہیں رہ سکا، بلکہ اس نے مدینہ کے اندر رعب اور دہشت کی سیاست شروع کر دی، منافقین کے مسئلہ کو ابھارنا اسی تبدیلی کی علامت ہے، اور یہودیوں کو ظاہر کیا گیا کہ وہ عہد شکن ہیں، چنانچہ چند ہی برسوں میں سارے یہودیوں کو یا تو جلا وطن کر دیا گیا، یا پھر ان کا خاتمہ کر دیا گیا، اور اس کے لئے چند لائینی اسباب تلاش کئے گئے، مارگو لیو تھ نے یہودیوں سے اپنی محبت کا اظہار یہ کہہ کر کیا کہ خیر کا سقوط، یہودیوں کے ساتھ سراسر ظلم تھا، جس کے لئے کوئی وجہ جواز نہیں، محمد نے ہجرت کے بعد، غارت گری اور لوٹ مار کا طریقہ اختیار کیا کہ والوں سے تو اس طرز عمل کی گنجائش یوں ہو سکتی ہے کہ ان لوگوں نے محمد کو اپنے شہر سے نکالا تھا، ان کے مال و جائیداد پر قبضہ کر لیا تھا، مدینہ کے یہودیوں کے سلسلہ میں بھی یہ کہا جاسکتا ہے، کہ ان سے محمد کو انتقام لینا تھا، لیکن خیر ولے تو مدینہ سے بہت دور تھے، وہ محمد یا ان کے متعلق کے حق میں کسی جرم و خطا اور ظلم و تعدی کے مرتکب نہیں ہوئے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ محمد کی سیاست میں کسی عظیم تبدیلی آگئی تھی، مدینہ میں آنے کے بعد ہی انھوں نے یہ اعلان کیا کہ یہودیوں کے ساتھ ان کا معاملہ مسلمانوں کی طرح ہوگا، لیکن ہجرت کے چھٹے سال میں ان کا یہ موقف سراسر بدل چکا تھا، اور اب محض اتنی ہی بات کسی پر حملہ کرنے کے لئے کافی تھی، کہ وہ غیر مسلم ہے، اس سے محمد کی اس ہوس مال و جاہ کا اندازہ ہوتا ہے، جس کی وجہ سے انھوں نے پے در پے حملے کئے، اسی ہوس میں پہلے سکندر اور بعد میں نپولین بھی سرشار تھا، خیر پر محمد کا قبضہ اس اندیشہ کا اعلان تھا کہ اسلام اس عالم کے لئے خطرہ بن گیا ہے، مشرق نوردی کی کو یہ حیرت ہی رہی کہ کاش عرب قبائل نے محمد کے خلاف اپنے معاہد اور دینی شعائر کے تحفظ کے لئے ایک متحدہ محاذ قائم کر لیا ہوتا، تو ان کا جہاد کامیاب نہ ہوتا، افسوس! عرب متحد نہیں ہوئے، اور ان کے اختلاف و انتشار نے محمد کو یہ مہلت دی کہ وہ یکے بعد دیگرے ہر قبیلہ کو مطیع کرتے جائیں۔ اور ان پر کبھی طاقت و قوت کے ذریعہ اور کبھی دوستانہ معاہدوں اور پراسن ذرائع سے غلبہ حاصل کرتے رہیں۔

پانچویں بات یہ کہ ان مستشرقین نے سیرت اور تاریخ - - - میں شکوک و شبہات پیدا کئے، اور اپنے ذوق و طبیعت اور مرضی سے ان کی نفی کی، یہاں تک کہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے اسم مبارک میں بھی شکوک پیدا



کئے، اور عجب کیا اگر ان کے امکان میں ہوتا تو وہ رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کے وجود مبارک میں ہی شک پیدا کرتے۔ بہر حال سیرت رسول سے متعلق صحیح تاریخ کی نسبت وہ جو چاہیں کہیں، اس حقیقت سے وہ انکار نہیں کر سکتے کہ تمام انبیاء و رسل میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت سب سے زیادہ واضح اور مفصل ہے، درحکم اس نقطہ پر اظہارِ خیال کرتے ہیں، کہ واقعی یہ انہوں کی بات ہے کہ بعض بڑے مستشرقین مثلاً میور، مارگو لیوٹو، لولڈ کی، اسپرنگر، ڈوزی، کیٹانی، مارسین، گوٹیم، گولڈزیر اور گارڈ فرڈ وغیرہ نے نقد میں بعض اوقات نہایت غلو سے کام لیا ہے، اور ان کی کتابوں میں خاص طور سے سیرت و کردار کئی کی گئی ہے، رنج کا مقام ہے کہ مستشرقین کا حاصل مطالعہ اور نتیجہ فکر برابر صلی رہا ہے، فادر لائس ممتاز مستشرق ہیں، مگر تعصب میں بھی ممتاز ہیں، اپنی شاندار کتابوں کو انہوں نے اسلام اور نبی اسلام کی دشمنی سے داغدار کر دیا، ان عیسائی عالم کے نزدیک حدیث اگر قرآن کے موافق ہے تو گویا وہ قرآن سے منقول ہے، اس لئے وہ کہتے ہیں کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جب دو دلیلوں کی مطابقت کا اقتضایہ ہو کہ انہیں رد کر دیا جائے، اور ان سے ایک دوسرے کی تائید و تقویت نہ ہو تو تاریخ کی تالیف کیوں کر ممکن ہوگی؟ مستشرقین بڑی خوبصورتی سے سیرت کا اصل مصدر قرآن کو بتاتے ہیں، اور پھر سیرت کے ان واقعات کی تردید کرتے ہیں جن کا ذکر قرآن میں نہیں، اس طرح صاحب قرآن کی سیرت کو مشکوک کر کے خود بخود قرآن کو بھی مشکوک بنا دیتے ہیں، گویا قرآن صرف ایک تاریخ کی کتاب ہے جس کا خاص مقصد حضرت محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی مفصل سیرت کا استقصاء ہے اور قرآن کے علاوہ سیرت کی دوسری روایتوں میں حضور (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جو فضائل یا حالات بیان ہوئے ہیں، وہ ناقابل قبول ہیں، اسپرنگر کہتے ہیں کہ "محمد کا نام قرآن کی چار سورتوں یعنی آل عمران، احزاب، محمد اور فتح میں آیا ہے، اور یہ ساری سورتیں مدنی ہیں" اس سے وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں، کہ ہجرت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے محمد کے نام کا استعمال نہیں ہوتا تھا، مدینہ میں انجیل کے اثر اور نصاریٰ سے ربط و ضبط کے بعد آپ نے اپنے لئے یہ نام بطور اسم علم اپنایا، کاش اسپرنگر سے کوئی یہ پوچھے کہ اگر نبی کریم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے اس نام کو انجیل کے مطالعہ کے بعد اپنایا، تو پھر وہ محمد کہاں ہیں جن کے بارے میں عہد نامہ قدیم و جدید میں بشارتیں موجود ہیں، سیرت سے متعلق مشکوک و شبہات پیدا کرنے اور صحیح واقعات کی غیر منصفانہ نفی کے اس طرزِ ادا کے بارہ میں مانٹگرمی واٹ نے ایک اچھی بات کہی، حالانکہ وہ خود اپنے اس اصول پر ہمیشہ عمل پیرا نہیں رہے، وہ کہتے ہیں کہ اگر واقعی ہماری خواہش یہ ہے کہ محمد سے متعلق مانسی میں جو غلطیاں ہوئی ہیں، انکی

اصلاح اور تصحیح کریں تو ہمارے لئے یہ ضروری ہے، کہ ہم سیرت کے واقعات کو سچ جانیں، سوائے کسی ایسی روایت کے جس کے خلاف کوئی قطعی دلیل موجود ہو، یہ بھی فراموش نہیں کرنا چاہئے کہ قطعی دلیل کی قبولیت کی شرط یہ ہے، کہ وہ زیادہ سے زیادہ درجہ امکان میں ہو، اور اس قسم کے موضوع میں اس کا حصول دشوار ہے۔

چھٹی بات یہ ہے کہ مشرقین کی تحریروں میں لامذہبی غیر معیاری اور غیر منطقی طرز استدلال نمایاں ہے، وہ سیرت کے زمانہ کو موجود زمانہ کے معیار کے مطابق جانچتے اور پرکھتے ہیں، اتین ڈینیہ اس قسم کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "یہ ناممکن ہے کہ تو دشوار ضرور ہے کہ مشرقین اپنی تحریروں کو اپنے جذبات و رجحانات اور اپنے ماحول اور اس کے اثرات سے بالاتر رکھیں، اسی وجہ سے سیرت نبوی اور سیرت صحابہ میں انھوں نے انتہائی درجہ تحریف و ترمیم سے کام لیکر اسکی اصل حقیقت پر پردہ ڈال دیا ہے، وہ یہ دعویٰ تو ضرور کرتے ہیں، کہ ان کی تنقید کا اسلوب معروفی تعصب سے پاک ہے، حقیقت پر مبنی اور سنجیدہ و علمی ہے، لیکن عالم یہ ہے، کہ اگر مولف جرمن مشرق ہے تو محمد جرمن لہجہ میں گفتگو کرتے نظر آتے ہیں اور اگر وہ اطالوی ہے، تو محمد کا طرز بھی اطالوی ہو جاتا ہے، اس طرح مصنف کے ساتھ محمد صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ کی شخصیت بھی بدلتی رہتی ہے، اگر ان لوگوں کی تحریر کردہ کتب سیرت میں اس کی صحیح تصویر تلاش کی جائے، تو وہ بالکل ہی نظر نہ آئے گی، یہ مشرقین صرف خیالی تصویریں پیش کرتے ہیں، جو حقیقت سے تمام تر دور ہوتی ہیں، والٹر اسکاٹ اور الیکٹر نڈر ڈیما س ڈو مارچی افسانوں میں جن لوگوں کا ذکر کیا ہے، ان کی تصویر اس کے مقابلہ میں حقیقت سے کہیں زیادہ قریب ہے، لیکن ان مشرقین نے افسانہ نگاروں کو بھی مات کر دیا، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کی سیرت نگاری وہ محض اپنی مغربی منطق اور موجودہ تصورات کے مطابق کرتے ہیں، ان کی کتابوں میں جرمن محمد، انگریز محمد اور فرانسیسی محمد ضرور ملتے ہیں، لیکن محمد عربیؐ کا پتہ کہیں نہیں چلتا، یہ اور بات ہے کہ حق کے جو یا، محمد کی روشن اور واضح سیرت کو پاہی لیتے ہیں، اس لامذہبی اور محدود و مقامی طرز استدلال نے اکثر مشرقین کو دوسری غلطیوں کا مرتکب بنا دیا ہے، اس کی نمایاں مثال وہ ہے، جسے فلہا وزن اور ان کے چند رفقا نے بیان کیا ہے، تحریک اسلامی مکہ میں محدود تھی، اور شروع میں مدینہ میں بھی اس کی یہی کیفیت رہی، مگر جب وہاں حالات سازگار ہوئے تو وہ عالمی مرحلہ میں داخل ہوئی، جس کے بارہ میں اس سے پہلے محمد نے سوچا بھی نہیں ہوگا، اسی طرح یہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ کی دور میں عدم تشدد کے قائل تھے، لیکن میں جب انھیں قوت و اقتدار حاصل ہوا، اور

ان کے ارد گرد جنگ ہو اور لڑائی کرنے والے اکٹھا ہو گئے، تو وہ طاقت اور تشدد کے اصول پر عمل پیرا ہو گئے، فلہذا ان کا خیال ہے کہ محمد کے حلقہ بگوشوں میں وہ لوگ بھی تھے، جن کا ان سے خوئی رشتہ نہ تھا، اور ان کا عقیدہ چونکہ خوئی رشتہ سے بڑھ کر تھا، اس لئے وہ چاہتے تو تعصب اور تنگ نظری کے اس دائرہ کو ختم کر دیتے، جو خوئی رشتہ کا نتیجہ تھا، لیکن وہ خوئی رشتہ و دائرہ سے ہٹ کر ایک وسیع دینی رشتہ و دائرہ کا تصور نہیں کر سکے، مستشرقین کے اس دہیائے نظریہ کی خود سرٹامس آرنلڈ نے تردید کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ تعجب ہے، قرآن کی آیات بنیات کے ہوتے ہوئے ہمارے کچھ مورخین نے کیسے یہ دعویٰ کر دیا کہ ابتداءً بانی اسلام نے اسلام کو عالمی دین کی حیثیت سے پیش نہیں کیا تھا، ان غلط کار مورخین میں سر ولیم میور بھی ہیں، جو رسالت محمدی کی آفاقیت کو بعد کی بات بتاتے ہیں، بہت سی آیات و احادیث کو باوجود محمد کو اس کا خیال نہیں ہوا، اور اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے، کہ انہیں اس کا خیال ہوا تھا، تب بھی یہ بہت مخفی اور پوشیدہ رہا، اور جو تک ان کے پیش نظر تھا، وہ صرف عرب تھا، کیونکہ یہ دین صرف اسی کے لئے ہی تھا، اور محمد نے اپنی بعثت و وفات کے وقت تک بجز عربوں کے کسی اور کو اسلام کی دعوت نہیں دی، گو اسلام کی عالمیت کا بیج بویا گیا تھا، لیکن اس کی نشوونما اور اس کے برگ و بار لانے میں منصوبوں اور پروگراموں سے زیادہ حالات و واقعات کو دخل ہے، آرنلڈ نے اس خیال کو باطل قرار دیتے ہوئے لکھا ہے، کہ اسلام کا پیغام صرف عرب تک محدود نہیں رہا، بلکہ اس کا فیضان ساری دنیا کے لئے عام تھا، جس طرح اس کے نزدیک صرف ایک ہی معبود ہے، اسی طرح دین بھی ایک ہی ہے، جس کی جانب ساری انسانیت کو دعوت دی گئی، اس بحث میں آرنلڈ کی ہمنوائی میں گولڈ زیمیر، فولڈ کی اور سخاؤ بھی شامل ہیں، جن کا خیال ہے کہ اسلام کا پیغام محض سرزمین عرب تک محدود نہیں تھا، بلکہ خدا کا یہ دین تمام مخلوقات کے لئے ہے، اس کا مقصد یہ ہے کہ ساری انسانیت اس کے سامنے سرنگوں ہو جائے، اور محمد چونکہ اللہ کے رسول تھے، اس لئے ان پر لازم تھا کہ وہ مطالبہ کرتے اور لوگوں کو خدا کی اطاعت قبول کرنے کی دعوت دیتے، اور یہ اعلان، اسلام کے آغاز سے ہی کر دیا گیا تھا، آرنلڈ نے فلما وزن اور میور وغیرہ کے اس نظریہ کی بھی تردید کی ہے، کہ محمد نے حالات کے تحت قوت و طاقت کا استعمال کیا ہے، مگر وہ یہ لکھ کر خود بھی غلطی کر گئے ہیں، کہ محمد کی خواہش اور ان کے ایک اندرونی جذبہ نے انہیں ایک نئے دین کی تشکیل کے لئے آمادہ کیا تھا، اور وہ اس راہ میں کامیاب ہوئے، لیکن اس کے ساتھ ہی انہوں نے نئے طرز پر ایک جداگانہ سیاسی نظام کی بنیاد بھی رکھی، حالانکہ ابتداءً ان کی یہی خواہش اور



کوشش رہی کہ وہ اپنے ہم وطنوں کو خدا کی وحدانیت کی دعوت دیں۔

حقیقت یہ ہے کہ سیرت نبوی کے فہم و مطالعہ کے لئے ایسی گہری نظر درکار ہے، جو اسلام کی تحریک کا اس حیثیت سے جائزہ لے کہ وہ خدا کے علم میں ایک مکمل پروگرام کی شکل میں تھی، جس کا ارتقار تدریجاً ہوا، اور یہ قرآن میں بھی متعین صورت میں تھا، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت اس پروگرام کو بہترین ڈھنگ سے اپنی بے نظیر صلاحیتوں، اعلیٰ اخلاق اور انتہائی ذہانت کے ساتھ نافذ کرنے والے کی تھی، قرآن کو حالات و اوقات کی رعایت سے نجاً نجماً حاصل ہوا ہے، لیکن یہ اس کے متعین خدائی پروگرام ہونے کے منافی نہیں ہے، دراصل وہ ایک بہترین نظام حیات ہے، جس میں جزئیات و کلیات آپس میں ایک دوسرے سے مربوط ہیں، یہ حالات و واقعات ایسے وقتی اور قطعی نہیں تھے، جو اسلام کی رفتار ترقی کو محدود کر دیتے، وہ ایک بہت اور مقصد تھا جو کبھی کبھی حالات و عادات زمانہ کے لئے روک، پھینچ اور ہمہ گیر انقلاب بن جاتا تھا، اس کا پوری طرح اسی سے اندازہ کیا جاسکتا ہے، کہ اول قدم ہی پر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جاہلیت کے رُخ پر لا الہ الا اللہ کا نقاب ڈال دیا تھا، اس وقت وہ کون سے وقتی حالات یا مقامی تقاضے تھے، جس نے اس انقلابی نشان کی جانب آپ کی رہنمائی کی تھی، جس نے جاہلیت کو بیخ و بن سے اکھاڑ دیا تھا، اور اس کی یادگاروں، رسم و رواج، نشانات و علامات اور معانی و مفہیم سب کو تہہ و بالا کر ڈالا تھا، آرنلڈ نے بھی اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے، کہ اسلام کا اس شان سے ظہور بالکل نہیں کھٹکتا، کیونکہ وہ بت پرست عربوں میں ایک نئی تحریک تھی، دو مختلف معاشروں میں اعلیٰ اخلاقی قدروں کا یہ کتنا زبردست تعارض تھا، اسلام، عرب معاشرہ میں محض اس لئے نہیں داخل ہوا کہ وہ چند ظالمانہ و وحشیانہ رواجوں کا خاتمہ کر دے، بلکہ وہ ایک مکمل انقلاب تھا، جس نے اپنے سے قبل کی زندگی کو یکسر بدل دیا تھا، واقعہ یہ ہے کہ محمد کی دعوت میں چند ایسی بنیادی باتیں تھیں، جو عام عربوں کے اس نقطہ نظر سے قطعاً مختلف تھیں، جن کو وہ بہت عزیز رکھتے تھے، ان کو یہ بات عجیب معلوم ہوتی کہ وہ نو مسلم جن کو یہ اسلام سے پہلے حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے، اب فضائل میں وہ ان سے آگے ہیں، قرآن ایک اعلیٰ کتاب تھی، جس کی آیتیں ہر نئے دور میں اور ہر زمان و مکان میں انسانیت کی رہنمائی کے لئے نازل ہوئی ہیں، وہ سلبی اور ایجابی کسی پہلو سے بھی کسی خاص زمانہ اور مخصوص فضا کے زیر اثر نہ تھا، جیسا کہ اکثر مشرقین عیسائیوں اور کیونسٹوں کا خیال ہے، اہل مغرب ہم یہ مطالبہ نہیں کرتے ہیں کہ وہ قرآن پر بحیثیت آسمانی کتاب ایمان

لائیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول تسلیم کریں، بلکہ ہمارا مطالبہ صرف یہ ہے کہ وہ غیر جانبدار ہو کر مقروضیت اختیار کریں، اور سیرت نبویؐ کا اسی حیثیت سے مطالعہ کریں، اور قرآن کریم کو ایک مثالی و نظریاتی کتاب سمجھیں جس کی تعلیمات، زبان و لہجہ اور وقتی حالات سے ماوراء ہیں، اس میں اگر چند وقتی حالات کا ذکر بھی ہے، تو یہ گونا گوں پاکیزہ قلمروں اور لوگوں کا سرچشمہ ہیں، جن سے مستشرقین کو غافل نہیں رہنا چاہئے،

یہ صحیح ہے کہ مستشرقین کا ایک طبقہ وہ بھی ہے، جس نے اپنی دقت نظر سے سیرت نبویؐ سے متعلق ہماری تاریخ اسلام کے بعض نازک، دقیق اور پوشیدہ گوشوں کی نقاب کشائی کی ہے، لیکن اس غلط نثر اور طرز فکر کی وجہ سے جس کی کچھ مثالیں ہم پیش کر چکے ہیں، اس نے اصل موضوع کے اندر بہت سے غلط نثر و ثمرات بھی شامل کر دیئے ہیں، اور یہ ایک فطری امر بھی ہے، کہ خطا سے خطا ہی سرزد ہوتی ہے، اور موضوعیت سے بعد و انحراف کے بعد ایسے ہی نثر برآمد ہوں گے، جو عظم کی روح اور سنجیدگی سے خالی ہوں گے۔

اس مختصر مضمون میں کسی تفصیلی بحث و مطالعہ اور تجزیہ و محاکمہ کی گنجائش نہیں، غور و فکر سے کام لینے والوں کو خود ہی پتہ چل جاتا ہے، کہ مستشرقین نے سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق جو کچھ لکھا ہے، اس کی تمہوں کے اندر ہر قسم کا تقاضا اور فکری اضطراب پٹا ہوا ہے، اور جس کا علمی بحث اور سنجیدہ اسلوب سے کوئی تعلق نہیں، لیکن یہ کلیہ استنثار سے خالی نہیں ہے، اور چند ایسے مستشرقین بھی ہیں جنہوں نے خود بھی سنجیدہ طرز فکر کو اپنایا، اور اپنے ہم قلم مستشرقین کی غلطیوں کو بھی واضح کیا، دینیہ واٹ، درنگم اور آرنلڈ کے بعض خیالات ہم گذشتہ صفحات میں پیش کر چکے ہیں، گو ان مستشرقین کا نقطہ نظر بھی زیادہ علمی اور پاکیزہ و شفاف نہیں ہے، مگر اس سے زیادہ کی توقع کرنا بھی محال اور دشوار ہے۔

بیسویں صدی کے آغاز اور روس میں بائبل کی انقلاب کی کامیابی کے ساتھ ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تاریخ اسلام کے متعلق ایک نیا موقف سامنے آیا، جو تاریخ کی مادی تعبیر کا نتیجہ تھا، اس کی یہ کوشش رہی کہ اپنے دستور و نثر کو مطابق جارحانہ انداز سے سیرت نبویؐ میں قطع و برید کر کے اس کی دھجی بکھردی جائے، تاکہ لوگوں کا اس سے تعلق ہی ختم ہو جائے، ان لوگوں کو جو کچھ اپنے موافق نظر آیا، اُسے تو لے لیا اور باقی کو نظر انداز کر دیا، اس طرح جو کچھ لیا اس کا تناسب بنائے گئے، کے مقابلہ میں ایک اور دہش کا ہے۔ چونکہ سیرت کے واقعات ان کی تحلیل و تجزیہ اور مخفی اغراض و خواہشات کے سراسر خلاف تھے، اس لئے انہوں نے تفسیر و تاویل اور قطع و برید میں بڑے عناد اور انتہائی زیادتی سے کام لیا، نیز فلسفہ اور واقعات

کے درمیان مطابقت کی تلاش و تحقیق اور تفسیل و توجیہ میں بھی ان لوگوں نے بڑی جانب داری کا ثبوت دیا، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک ہی واقعے کے بارہ میں ان کی رائیں مختلف و متضاد ہو گئیں، حالانکہ وہ ایک ہی مکتب فکر کے خوشہ چیں، اور ایک ہی دبستان سے تعلق رکھتے تھے، مثلاً بعض ماری مشرقین کا خیال ہے کہ مکہ و مدینہ میں عرب معاشرہ نے پہلی بار ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کا مشاہدہ کیا جس میں غلاموں کو بھی حق ملکیت دیا گیا تھا، یہ جو لفسکایا کا خیال ہے کہ قرآن نے غلام کے حق ملکیت کے مرحلہ کے مرکز ہونے کو تسلیم کیا ہے، وہ بلا نیف کے اس خیال سے متفق ہیں کہ کمزور طبقہ کا یہ دور اس بات کی نشان دہی کرتا ہے کہ عرب دوسری قوموں سے رابطہ قائم کرنے کی کوشش میں تھے، دوسرے ماری مشرقین کہتے ہیں کہ کمزور طبقہ کا معاشرہ فعلاً وجود میں آ گیا تھا، کلیون فنج کا خیال ہے کہ اسلام، جامداد سے نئے نفع اندوز طبقات کے مفاد کی رعایت رکھتا ہے، اور کمزور طبقہ کی سرمایہ داری کا حامی ہے، بعض کا قول ہے کہ اسلام صرف غریب طبقہ کی سرمایہ داری کا حامی ہے، بلا نیف کی رائے ہے کہ اسلام جس کا نامیندہ قرآن ہے اور برسر اقتدار طبقوں کے معاشرتی اور سیاسی مفاد کا لحاظ نہیں رکھتا، اسی لئے مسلمان جدید طبقوں کے استحصال کو ہانڈ کرنے کے لئے حدیثیں گھڑنے پر مجبور ہوئے، بعض کہتے ہیں کہ یہ اسلامی سرمایہ داری تھی، جس نے مقصد برآدی کے لئے عربی قبائل کو وحدت کی لڑی میں پرو دیا تھا، لیکن دوسرے ماری مشرقین کی رائے یہ ہے کہ قبائل وحدت کی طرف اچھل کود کر رہے تھے کہ اسلام کا آغاز ہوا، جس کی وجہ سے وحدت عمل میں آئی، خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارہ میں یہ آپس میں تضاد رائے کے شکار ہیں، کلیون فنج کہتے ہیں کہ اور نبیوں کی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایک نبی تھے، آپ نے توحید کی بشارت دی اور قبائل کو متحد کرنا چاہا، لیکن ٹولسٹون، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود کے ہی منکر ہیں، اور آپ کی شخصیت کو محض ایک افانومی شخصیت سمجھتے ہیں، بعض لوگ ظہور اسلام کے معترف ہیں، لیکن کلیون فنج کا خیال ہے کہ

اسلام کا ایک بڑا حصہ بعد میں کمزوروں کے مفادات کے تحفظ کی شکل میں سامنے آیا، جس کا تعلق محمد کی حیرناک کارکردگی سے ہے، ٹولسٹون اس حد تک بڑھ گئے کہ ان کے خیال میں اسلام ایک من گھڑت افسانہ ہے، جو خلافت کو دور میں برسر اقتدار طبقہ کے مفاد کی خاطر گھڑا گیا، اور اس کے وضع و اختراع میں ان پرانے اعتقادات سے استفادہ کیا گیا ہے، جن کو حقیقت کہا جاتا تھا۔



ان چند مثالوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مارکسیت ایک ایسا جدید مذہب ہے، جو اسلام اور پیغمبر اسلام سے بغض و نفرت میں عیسائیت سے کسی طرح کم نہیں ہے، موضوعی و معروضی مطالعہ سے انھیں بھی کوئی واسطہ نہیں، دراصل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور تاریخ اسلام کی حد تک یہ مارکسی جدید دور کے پادری ہیں، جنہوں نے اپنے بھیس ضرور بدل لئے ہیں، لیکن اپنے اندرون میں وہ وہی قدیم عیسائی پادری ہیں، جو اپنے کو جدید مادیت سے منسوب کرتے ہیں، ان لوگوں نے سیرت محمدیؐ کو اس سے کم دھندلا نہیں کیا ہے، جتنا قدیم نصاریٰ نے کیا تھا، ذیل میں مادی کلیسا کے ایک فرزند بندنی بوز کے بعض خیالات پیش کئے جاتے ہیں: وہ لکھتے ہیں کہ کمیوں کے ساتھ نبی کریمؐ کی جو سیاست تھی وہ نئے عوامل کو زیر اثر اور بعض دوسرے اسباب کی بنیاد پر جو حالات اور تجربات کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے، مدینہ میں بڑی حد بدل گئی تھی، مکہ سے وطن اصلی ہونے کے تعلقی اور وہاں کے لوگوں سے قرابت اور غزوہ بدر و خندق کے بعد پیش آنے والے جذبات اور سیاسی عوامل کی وجہ سے اپنے آپنے کی بھائیوں کے ساتھ نرمی و مہربانی کی سیاست اختیار کی، خود مکہ کے برسر اقتدار طبقہ نے بھی بدر کی شہادت اور اس میں لائق ہونے والے مالی نقصان کے بعد یہی مناسب سمجھا کہ چند شرطوں کے ساتھ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی جائے، جو یہ تھی، کہ کعبہ حج اور عکاظ کو اسی حال میں باقی رکھا جائے، جیسے وہ اسلام سے پہلے تھے، اور ان کے ساتھ عفو و درگزر کا معاملہ کیا جائے، نیز آپ ان کو بھی اپنے اس نئے عمل میں شریک کر لیں، جس میں انھیں اپنے لئے خیر اور بہتری کی توقع ہو، ان کی شرط تھی کہ آپ مدینہ ہی میں رہیں گے، اور مکہ والوں کے مالی معاملات میں مدخلت نہیں کریں گے، چنانچہ صلح حدیبیہ ہوئی اور تالیف قلوب کی سیاست اختیار کی گئی، جسے دوسرے لفظوں میں رواداری اور مسامحت کی سیاست بھی کہہ سکتے ہیں، اس کے نتیجے میں لوگ خدا کے دین میں جوق در جوق شامل ہو گئے، مگر یہ لوگ اسلام کو صحیح دین سمجھ کر اس میں نہیں شامل ہوئے تھے، بلکہ وہ اس لئے اسلام میں داخل ہوئے تھے کہ نئے حکمراں طبقہ کا قرب حاصل کر سکیں، اور اپنے قدیم مذہبی مرکزوں اور دولت کا تحفظ کر سکیں، بندنی بوزی کے خیال میں حدیبیہ یا کسی اور موقع کی ایک شرط یہ بھی جس پر دونوں فریق متفق تھے کہ نبی کریمؐ مکہ کے سربر آوردہ لوگوں پر طعن و تشنیع کرنے سے باز رہیں گے، اور وہاں کے غریبوں اور کمزوروں کو ان کے خلاف جنگ پر آمادہ نہیں کریں گے، میرے خیال میں اسی بنا پر مدنی باخصوص آخر دور کی سورتوں میں مکہ کے باشندوں کے بارے میں کوئی سخت آیت نازل نہیں ہوئی، نبی کریمؐ صلی اللہ علیہ وسلم کی معاشرتی زندگی مدینہ میں آکر بدل گئی، اور اسی وجہ سے نبی کی بعض اجتماعی اور دینی اصلاحات ناقص رہیں، اور جیسا کہ اہل یورپ کہتے ہیں، اس میں

نبی کریم ﷺ کے کسی قدر تساہل کو بھی دخل تھا، یہ بالکل بے سرو پا بات ہے، صلح حدیبیہ کی تمام شرطیں معروف و مشہور ہیں، نہ ان میں اس کا کہیں ذکر ہے، اور نہ کسی اور مقام اور زمانہ میں آپ نے اس طرح کی شرط فائدہ کی تھی، بندلی ہوزی یہ بھی لکھتے ہیں، کہ نبی کریم کا کئی دور تمہید اور تیاری کا دور تھا، جس میں مختلف طبقوں میں ایک نئی دعوت کو پھیلانے کی کوشش جاری تھی، اس دور میں ایک شخص جو اپنے اصولوں پر ثابت قدم اور اپنے عمل میں مخلص تھا، اس کے درمیان اور ان لوگوں کے درمیان الفاظ کی جنگ جاری تھی، جو اپنی قیادت اور دولت کے بارہ میں خطرات محسوس کر رہے تھے، چنانچہ اس شخص کے خلاف مقابلہ و صف آرائی ہوتی رہی، یہ دور کوششوں اور تناؤں کا دور تھا، اگر یہ کوششیں بار آور ہو جاتیں تو پورا ملک یکسر بدل جاتا، یہ دور کتنا اچھا اور عمدہ تھا، نبی کا دوسرا دور عمل تنظیم، جنگوں اور سیاست کا دور تھا، لیکن اس میں طرفین کی جانب سے تساہل برتا گیا، اس طرح کے موقع پر تساہل کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ بعض اصول ترک کر دیئے جائیں اور بعض مطالبوں سے دست برداری اختیار کر لی جائے، یا بعض افکار و خیالات سے رجوع کر لیا جائے، یا انھیں اس انداز سے پیش کیا جائے، جس سے دونوں فریق خوش اور مطمئن رہیں، اسی نوعیت کا معاملہ نبی اور صدر جمہوریہ مکہ ابوسفیان کے درمیان پیش آیا تھا، ابوسفیان نے نبی کی روحانی و عالمی قیادت، بتوں کی سچو، نماز اور زکوٰۃ کی ادائیگی منظور کر لی تھی، اور نبی نے یہ منظور کر لیا تھا کہ مکہ کی روحانی اور دینی مرکزیت برقرار رہے گی، مکہ کے اعیان و عائد کو نئی روحانی جمہوریت میں انتظام و انصراف کا حق ملے گا، اور ان کو ان کے حسب مرضی زندگی گزارنے کی مکمل آزادی حاصل ہوگی، اس معاہدہ میں غریبوں اور کمزوروں کا تیسرا گروپ سب سے زیادہ خسارہ میں رہا، حالانکہ اسی طبقہ کی خاطر جنگیں ہوئیں، اور اسی کی حالت درست کرنے اور بہتر بنانے کے لئے دعوت نبوی کا ظہور ہوا تھا، لیکن ابتدا میں ان لوگوں کو صرف کچھ صدقات و زکوٰۃ دے کر خوش کر دیا گیا، چنانچہ نبی اور ان کے خلفاء کے دور کے بعد اس طبقہ کو قصداً یا بلا قصد و ارادہ فراموش کر دیا گیا، چنانچہ یہ جیسا تھا دیا جا رہا، بلکہ پہلے سے بھی زبوں تر ہو گیا،

یہی مستشرق ایک جگہ لکھتے ہیں کہ "بلاشبہ نبی ﷺ نے اپنے اقوال و افعال کے ذریعہ مکہ اور مدینہ میں معاشرہ کے شر کے اسباب اور اس کے جرائم کو ختم کرنے کی اس طرح کوشش نہیں کی، جس طرح کی کوشش آجکل کمیونٹ کر رہے ہیں، اگر نبی کریم ﷺ چاہتے، تو جزیرۃ العرب میں صاحب اقتدار و اختیار ہونے کے بعد اجتماعی امراض کے جرائم ختم کر دیتے، اور وہ غریبوں اور کمزوروں اور غلاموں کے استحصال کو روک دیتے، معارف آگست ۱۹۸۳ء

## مستشرقین اور اسلام

از

شیخ انور الجندی، مصر مترجم عمیر الصدیق دریابادی ندوی، رفیق دارالمصنفین

مستشرقین کے ایک طبقہ کا دعویٰ ہے کہ قرآن کی تعلیمات اور واقعات کا ماخذ توریت و انجیل ہیں، یہ لوگ دراصل قرآن مجید کے متعدد ایسے اصولوں سے ناواقف ہیں، جن کے ذکر سے توریت و انجیل خالی ہیں، علاوہ ازیں قرآن مجید نے بعض واقعات کی جو تفصیل بیان کی ہے، ان سے یہود و نصاریٰ بے خبر تھے، باوجودے کہ وہ ان ہی کے دین و تاریخ سے متعلق تھے، مثلاً ان لوگوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش کے بعد ان کی والدہ حضرت مریمؑ کی کفالت حضرت زکریاؑ نے کی، اسی طرح قرآن مجید کی وہ پیشین گوئیاں جو بعد میں بالکل درست ثابت ہوئیں، جیسے ساتویں صدی عیسوی کے ابتدا میں رومیوں نے ایرانیوں سے ایسی زبردست شکست کھائی کہ بظاہر کسی کورومیوں کے دوبارہ غلبہ کی کوئی امید نہیں تھی، لیکن قرآن مجید نے پورے وثوق اور یقین کے ساتھ خبر دی کہ چند برسوں میں وہ پھر غالب آجائیں گے اور بالآخر یہ پیش گوئی پوری ہو کر رہی، اسی طرح قرآن مجید نے بعض ایسے واقعات کی خبر دی جن کا مشاہدہ اب موجودہ دور میں ہو رہا ہے، حالانکہ ان واقعات کا علم چودہ سو برس پہلے نہ تو کسی کو تھا اور نہ ہی مسلمانوں کے سوا ان کے ظہور و وقوع پر کسی کو یقین تھا اور توریت و انجیل میں بھی ان باتوں کا کوئی ادنیٰ ثبوت یا اشارہ موجود نہیں تھا، مثلاً فضا کی بلندیوں میں ہوا کا دباؤ کم ہو جانا آج ایک عام سائنسی اصول ہے، لیکن قرآن مجید نے بہت پہلے ایک آیت میں اس کی طرف اشارہ کیا تھا:

وَمَنْ يُرِدْ أَنْ يُضِلَّهُ يَجْعَلْ صَدْرَهُ  
ضَيْقًا حَرَجًا كَأَنَّمَا يَصْعَقُ فِي  
السَّمَاءِ (انعام: ۱۵)

اور اللہ جس کو گم راہ کرنا چاہتا ہے تو اس کے  
سینہ کو بالکل تنگ کر دیتا ہے، گویا اسے آسمان  
میں چڑھنا پڑ رہا ہے۔

اسی طرح بارش کے وقت زمین کے اہتراز کے بارے میں قرآن مجید نے بہت پہلے کہا تھا:

فَإِذَا آتَيْنَا عَلَىٰهَا الْمَاءَ اهْتَرَّتْ  
وَرَبَّتْ (حج: ۱)

پھر جہاں ہم نے اس پر مینہ برسایا کہ  
یگا یک وہ پھبک اٹھی اور پھول گئی۔

ڈیڑھ ہزار برس پہلے اس قسم کی معلومات ناقابل یقین خیال کی جاتی تھیں، مگر سائنس کی جدید تحقیقات کے بعد



کس کو ان میں شک و شبہ ہو سکتا ہے۔

اسی طرح قرآن مجید میں متعدد ایسی باتیں بیان ہوئیں جنہیں کسی طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب نہیں جاسکتا، کیونکہ ان میں آپ کے کسی خاص عرز عمل کی وجہ سے آپ پر عتاب کیا گیا ہے، ایسی صورت میں قرآن کا آپ کی تصنیف ہونا کسی طرح ممکن نہیں، کیونکہ اگر آپ خود ہی قرآن لکھتے تو پھر اپنے آپ پر عتاب کس طرح کرتے؟ غزوہ بدر کے اسیروں کی رہائی، ناپینا صحابی کی آمد اور منافقین کی نراذ جنازہ اور حضرت زینب بنت جحش کے واقعات میں تا در مطلق کا لہجہ، ذات نبوی کے طرز کلام سے واضح طور پر ممتاز اور جدا ہے، اور اس حقیقت کا غماز ہے کہ بیشک قرآن مجید کلام الہی ہے۔

اب یہ دعویٰ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تورات و انجیل کے معانی و مطالب اور ان کے آہنگ و اسلوب کو اختیار کیا تو اس کا سادہ جواب یہ ہے کہ قرآن کے مضامین اور تورات و انجیل کے مضامین میں نمایاں فرق ہے، یہاں تک کہ چند مشترک باتوں میں بھی بنیادی فرق موجود ہے، مثلاً حضرت مریم و عیسیٰ کے معاملات، عقیدہ تثلیث، واقعہ صلیب اور بنی آدم کے پیدائشی طور پر گنہگار ہونے کے عقائد و مسائل ایسے ہیں، جن میں قرآن اور انجیل کا تضاد ظاہر و واضح ہے، اس لئے مذکورہ دعویٰ کی کوئی حقیقت و اہمیت نہیں ہے،

ایک اور اعتراض یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کے منتظر اور متمنی تھے، اور اپنے ایک دوست کے متعلق گفتگو کیا کرتے تھے، لیکن مستند اور صحیح روایتوں سے قطعاً یہ منہم نہیں ہوتا کہ آپ خود کو موعود نبی سمجھتے تھے، ایسا ہوتا تو محدثین اور مؤرخین اس قسم کی روایتیں بیان کرنے میں ذرا بھی تامل نہ برتتے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے مشہور جاہلی شاعر امیہ بن ابی الصلت کے بارہ میں اس قسم کی روایتیں ملتی ہیں کہ اس کو یہ گمان تھا کہ وہ نبوت کا مستحق ہو سکتا ہے، اس کے برعکس قرآن مجید نے تو یہ صراحت کی ہے:

وَمَا كُنْتُمْ تُرْجَوْنَ أَنْ يُبْعَثَ إِلَيْكُمْ الْكِتَابُ  
إِلَّا رَحْمَةً مِّنْ رَبِّكُمْ. (قصص: ۹)

تم اس بات کو ہرگز امیدوار نہ تھے کہ تم پر کتاب نازل کی جائیگی، یہ تو محض تمہارے رب کی رحمت پر تمہیں نازل ہوئی ہے

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سچائی اور راست گوئی کے معترف تو آپ کے دشمن، حتیٰ کہ ابوجہل جیسے بدترین مخالف بھی تھے، اگر اس قسم کی کسی بات کا کوئی شائبہ بھی ہوتا تو وہ لوگ اس کا پردہ پگند کرنے میں بردبار نہ ہوتے اور ان کے ہم نواؤں

سے بھی زیادہ آگے ہوتے ہیں، یقیناً مستشرقین، منافقین اور یہودیوں کو بھی مخالفت کا ایک زبردست حربہ اور طاقتور دلیل مل جاتی۔

اسی طرح قرآن مجید سے سزا دینے کے ساتھ کہا کہ نبی کریم ﷺ کا کوئی معلم نہیں تھا جو آپ کو قرآن کی تعلیم دیتا۔

وَلَقَدْ لَعَلَّمْنَا لُقْمَانَ رَبِّهٖ مَا  
يُعَلِّمُهُ لِبَشَرِ لِسَانِ الَّذِي يُلْحِدُونَ  
إِلَيْهِ اَعْجَبِيْنَ ۗ وَهٰذَا السَّعْدُ الْعَرَبِيُّ حَمِيْنٌ  
ہمیں معلوم ہے یہ لوگ تمہارے مستحق کہتے  
ہیں کہ اس شخص کو ایک آدمی سکھاتا پڑھاتا  
ہے، حالانکہ ان کا اشارہ جس آدمی کی طرف  
ہی اسکی زبان غیبی ہے، اور یہ صاف عربی زبان ہے

(بھول: ۱۲)

قرآن مجید کے بعض الفاظ و کلمات کے بارہ میں چند محققین نے یہ خیال ظاہر کیا کہ وہ عربی کے بجائے دوسری زبانوں کے ہیں، مستشرقین نے اس تحقیق کو سند تسلیم کرتے ہوئے فیصلہ صادر کیا کہ قرآن کی عربیت کامل و خالص نہیں ہے، حالانکہ بظاہر غیر عربی نظر آنے والے یہ الفاظ حقیقتاً غیر عربی نہیں ہیں، بلکہ وہ قدیم عربی زبان میں تجارت، سفر اور دوسری قوموں کے اختلاط کی وجہ سے داخل ہو گئے تھے، اور زبانوں کے عام قواعد اور مزاج کے مطابق وہ اصل عربی زبان کا جزو بن کر اس میں استعمال ہونے لگے تھے، اسی لیے قرآن مجید نے بھی ان کو استعمال کیا، اور خدا نے اپنے بندوں سے ان ہی کی زبان میں گفتگو کی، یہ بات نامناسب اور غیر معقول بھی ہے کہ قرآن مجید استعمال تو ایسے الفاظ کرے جو غیر عربی ہوں یا عربوں کے لئے نامانوس ہوں اور ان کو عربی مبین کا نام دے، گویا ان کو ایسے الفاظ میں خطاب کرے جن کو وہ سمجھ ہی نہ سکیں،

محققین نے ایسے الفاظ کی تحقیق کی تو یہ ثابت ہوا کہ یہ الفاظ اصلاً عربی ہی تھے، بعد میں حبشی، سریانی اور فارسی زبانوں میں بھی داخل اور رائج ہوئے، یہ اعتراض پہلے بھی کیا گیا ہے، اسی لئے امام طبری نے ایک جگہ لکھا ہے کہ قرآن مجید کا مطالعہ کرنے والے کسی بھی صاحب عقل سلیم سے اس اعتقاد کی توقع نہیں کی جاسکتی کہ قرآن مجید کے چند الفاظ فارسی ہیں، بعض نبطی ہیں اور کئی حبشی ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ:

وَلَوْ جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَجْمِيًّا لَقَالُوا لَوْ

اگر ہم اس کو غیبی قرآن بنا کر بھیجتے تو یہ لوگ کہتے

لَا فَصَّلَتْ آيَاتُهُ  
کیوں نہیں اس کی آیات کھول کر بیان کی گئیں

مستشرقین اور عربی زبان داد پر مستشرقین کا حملہ بھی اصلاً قرآن مجید ہی سے جڑا ہوا ہے، اس کا مقصد یہ ہے عربی زبان داد کہ "بیان قرآن" اور عربی انشا پر دازی کی زبان کے درمیان ایک خلا کا وجود ثابت کر دیا جائے، اسی لئے مستشرقین کی پیہم کوشش یہ رہی ہے کہ عربوں کو عوامی زبان اور لاطینی حروف کی جانب زیادہ رغبت دلائی جائے، مراکش و شام میں فرانسیسی مستشرق ماسینیون اور مارگولیو تھ نے دوسرے عرب ممالک میں یہی مہم چلا رکھی ہے، اور ان دونوں نامور مستشرقین کا مرکز دمشق تھا، ان کا مقصد یہ تھا کہ جب عربی زبان، مقامی رنگ اختیار کرنے لگی، اور زبانیں غیر عربی لب و لہجہ سے مانوس ہو جائیں گی تو اسلام کی فہم کے راستے خود بخود منقطع ہو جائیں گے، اور اس کی عائد کردہ پابندیاں بھی ختم ہو جائیں گی۔

ان مستشرقین نے عربی زبان پر کئی اعتراضات کئے، مثلاً عربی زبان ناقص اور طلی مفہوم ادا کرنے کے لئے ناکافی ہے، بولنے میں مشکل، اور لکھنے میں دشوار ہے، اس کی سطح عام لوگوں کی فہم و ادراک سے بالاتر ہے، بولنے اور لکھنے کے طریقوں میں بڑا فرق ہے،

لوئس ماسینیون کا شمار ان انتہائی خطرناک مستشرقین میں ہوتا ہے، جو عربی کے لئے لاطینی حروف اور رسم الخط کو قبول کرنے کی دعوت دیتے تھے، ان کے خیال میں اس سے اعراب کی زحمت ختم ہو جائے گی اور غیر عربوں کے لئے بھی عربی زبان کی تحصیل زیادہ آسان ہو جائے گی، انھوں نے دمشق کی مجلس اعلیٰ کے ارکان کے سامنے اپنے اسی دعوت کو پیش کرتے ہوئے کہا کہ اگر لاطینی حروف کو قبول کر لیا گیا تو عربی زبان کی تجدید کے لئے یہ اہم وسیلہ ثابت ہوں گے، پھر انھوں نے پیرس میں بھی عرب نوجوانوں کی مختلف مجلسوں میں اسی تجویز کو دہرایا، لیکن یہ عربی زبان کی خوش نصیبی تھی کہ ان کو اپنی تحریک تحریر کے سلسلہ میں سخت مزاحمت اور وسیع رد عمل کا سامنا کرنا پڑا، اور گولیٹھ کی اسی قسم کی کوششوں کا انجام بھی ماسینیون سے مختلف نہیں رہا، چنانچہ جب انھوں نے ایرانیوں کے سامنے یہی تجویز رکھی، تو ایرانیوں نے سختی کے ساتھ رسم خط اور عربی حروف کو لاطینی میں تبدیل کرنے کی ان کوششوں کو رد کر دیا، مستشرقین سے پہلے عیسائی مشنریوں ولیم ویل کوکس اور ویل مور اور اسٹیانے بھی عوامی زبان کو اپنا ہدف بنایا تھا، مستشرقین مان کے بعد فصیحی یعنی قرآن کی زبان کے خلاف سرگرم عمل ہوئے، ایک مستشرق دنسک نے چند ایسے رسائل شائع کئے جن کی زبان قدیم مصری تھی، مگر وہ یورپی حروف میں لکھے گئے تھے



انہوں نے اپنے ایک رسالہ کا نام "لجرومیتہ مصری رکھاتھا، اس کی ایک عبارت کی تحریر کا نمونہ یہ جملہ ہے، بل لسان  
المصری ومعہا امسلة جس کی صحیح صورت یہ ہے باللسان المصری ومعہا امثلة۔

مستشرقین کے مقصد برآری کا ایک اہم ذریعہ عربی اکیڈمیاں بھی رہی ہیں، ان اکیڈمیوں کو انکا ملی تعاون  
برابر حاصل ہونا رہا، اور انہی کے ذریعہ یہ مطالبہ کیا گیا کہ قرآن کو موجودہ دور کی زبان کے مطابق لکھا جائے، اس طرح  
اس طریقہ تحریر کو ہی ختم کر دیا جائے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ سے رائج ہے، اور جس میں مختلف عربی لہجوں اور قرآنوں  
کی رعایت ملحوظ رکھی گئی ہے، مستشرقین کی یہ کوشش کوئی نئی بات نہیں، اسلام کے بدخواہوں کے انداز فکر و عمل میں روز آدن  
سے ہی ایک قسم کی یکسانی پائی جاتی ہے، چنانچہ امام احمد بن حنبلؒ بھی اپنے زمانہ میں اس کی تردید کر چکے ہیں وہ فرماتے ہیں  
کہ قرآن کی قرأت کے لئے ضروری ہے کہ وہ صحابہ کرام کے لکھے ہوئے نسخوں کے مطابق ہو، قرآن مجید کا نزول سات عربی  
لہجوں پر ہوا ہے، اور اس کا موجودہ خط ان تمام لہجوں کے موافق ہے، اس لئے اگر رسم خط میں تبدیلی کی گئی تو یہ زبان ہی  
ضائع ہو جائے گی۔

مستشرقین کی ایک سازش یہ بھی ہے کہ نحو و صرف کے علوم سے صرف نظر کیا جائے، کیونکہ اس سے زبان کی  
مشکلیں آسان ہو جائیں گی، اب اس ہمدردی کو کیا کہا جائے؟ اہل علم واقف ہیں کہ عربی زبان کی عظمت جن بنیادوں پر  
تائم ہے، وہ نحو و صرف کے مقررہ اصول و قواعد اور نیز بلاغت کے علوم یعنی معانی، بیان اور بدیع وغیرہ ضوابط کی  
مکمل محافظت کے متقاضی ہیں، اگر اس بنیادی علوم کے قواعد میں ذرا سی بے توجہی اور معمولی نرمی گوارا کی گئی تو زبان میں عیب  
ادبھی آسکتی ہے، اور عربی زبان کا سرمایہ امتیاز، اس کا زور دار اسلوب، نادر ترکیبیں اور بیخ جملے سب مسخ اور تباہ ہو جائیں گے۔  
مستشرقین نے ایک اور راگ چھیڑا جس میں ان کی ہمنوائی کئی مغرب زدہ عربوں نے بھی کی، اور وہ یہ کہ عربی زبان  
ہماری اپنی زبان ہے، اس کی اصلاح و ترقی اور اس میں رد و بدل وغیرہ کا حق و اختیار صرف ہم کو ہے، اس راگ کے بے سر  
ہونے کا احساس ہر صاحب ذوق کو ہوا، حقیقت یہ ہے کہ عربی زبان پر محض مسر یوں، شامیوں یا عربوں کا ہی حق نہیں ہے  
بلکہ ان کے ساتھ اس پر کم از کم آٹھ سو ملین مسلمانوں کا حق بھی ہے، جن کی ثقافت، فکر اور عقیدہ کی زبان عربی ہے، یورپ کی مقامی  
قومی زبانوں کے بارے میں تو یہ دعویٰ درست ہے ہو سکتا ہے، لیکن عربی جیسی قدیم و وسیع زبان کو کسی محدود خطہ ارض یا محض  
عربوں کی زبان قرار دینا کسی طرح بھی درست نہیں ہو سکتا، یہ خواہش یا دعویٰ اس قدر نمل ہے کہ تاریخ و تحقیق کی نظر میں کبھی درخند

اعتنا نہیں ہو سکتا۔

مستشرقین کا یہ دعویٰ بالکل ہی غلط اور خلاف واقعہ ہے کہ عربی زبان کا ایک عیب یہ بھی ہے کہ وہ دو زبانوں پر مشتمل ہے۔ ایک تحریر کی زبان اور دوسری گفتگو کی زبان، گویا یہ عیب صرف عربی زبان کے ساتھ خاص ہے، حالانکہ دنیا کی ساری زبانوں کا یہی حال ہے، یہاں تک کہ یورپ کی انتہائی ترقی یافتہ زبانیں بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں، ممکن ہو کہ تعلیم کے فروغ کے ساتھ گفتگو اور تحریر کے درمیانی فاصلے سمٹ جائیں، لیکن فطری طور سے یہ فاصلے ہر زبان میں قائم رہتے ہیں، اس لئے تحریر کی زبان کو گفتگو کی زبان کی پست سطح پر لانے کی کوشش بڑی مفہمکہ خیز ہے، جو زبان کی خصوصیت اور اس کے اصول ارتقا کے عین خلاف ہے۔

مستشرقین جب عربی زبان کے ضعف یا جمود کے بارہ میں اظہار خیال کرتے ہیں، تو وہ اس جمود کی اصل وجہ کو نظر انداز کر دیتے ہیں، درحقیقت اس جمود کا اصلی سبب ان کا اپنا مزاج ہے، جس نے عربی زبان کے فروغ کی راہوں میں رکاوٹیں پیدا کیں، مقامی زبانوں کو عربی زبان پر غالب کرنا چاہا، اور عوامی زبانوں اور روزمرہ کی بول چال کی محض اس لئے حوصلہ افزائی کی کہ اس سے عربی زبان کے فروغ و اشاعت میں رکاوٹیں حائل ہوں، استعمار کے نمایندوں مثلاً ڈنلوب نے تعلیمی پالیسی اس طرح مرتب کی کہ جو نوجوان اعلیٰ علمی ترقی کے سرچشمیوں سے فیض حاصل کرنا چاہیں، ان کے لئے عربی زبان بحیثیت ذریعہ تعلیم ناکافی ثابت ہو، اور یہ نوجوان ابتدائی تعلیم کے بعد ناموس ماحول اور اجنبی زبانوں کے دست نگر بن جائیں، پچھانچہ ہی ہوا کہ کچھ تو آکسفورڈ اور کیمبرج کی روایتی ثقافت کے پابند ہو گئے، بعضوں کا واضح شرفان عربی فکر سے عقیدہ ہی ختم ہو گیا، اور ایک طبقہ جرمن طرز اسلوب پر فریفتہ ہو گیا، مختصر یہ کہ سامراج نے قوم کو قومی زبان میں تسلیم پانے سے محروم کر دیا، جس کے نتیجہ میں قومی زبان کو سخت نقصان پہنچا، اور وہ دوسری زبانوں کے علوم بھی اپنے اندر منتقل کرنے کے قابل نہیں رہی، اور جن لوگوں نے ان علوم کو عربی زبان میں منتقل کرنے کی کوشش کی، انھیں دقت اور ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔

مستشرقین نے ایک سعی لاکھائی یہ بھی کی عربی اور لاطینی زبانوں کے درمیان موازنہ کیا جائے، عربی زبان کے ماہرین اور فضلا نے اس کے مسموم اثرات کو بروقت محسوس کیا، اس تحریک کا مقصد صرف یہ تھا کہ عربی زبان کو لاطینی میوزیم میں سجایا جائے، اور مصری اور شامی عراقی بول چال اور روزمرہ کو الگ الگ زبانوں کی حیثیت دی جائے، دنیا کے کئی دوسرے خطوں کی طرح ممکن ہے یہ سازش عرب میں بھی کامیاب ہو جاتی، مگر قرآن مجید جو عربی زبان کے لئے "عروۃ الوثقی" ہے، اس کا وجود اس

سازش کی ناکامی کے لئے کافی ثابت ہوا، واقعہ یہ ہے کہ عربی اور لاطینی زبانوں کے مابین، حالات اور مسائل کسی بھی اعتبار سے کوئی مشابہت نہیں ہے، لاطینی زبان مردہ ہو چکی، مختلف زبانوں میں اس کے کچھ اثرات اگر سرایت کر گئے تو اسکے اسباب سیاسی ہیں، مثلاً رومی حکومت کا خاتمہ اور اس کی سیاسی قوت کی بے اثری وغیرہ جس کی وجہ سے لاطینی زبان اقتدار کے ایوانوں اور خواص کے ماحول سے نکل کر یوں منتشر ہوئی کہ عوام میں کیس کیس صورت اس کے وجود کا احساس ہوتا رہا۔ اصل بات یہ ہے کہ مسیحیت عام طور سے مقامی بولیوں کی حوصلہ افزائی کرتی ہے، مشینریاں اپنا کام عوام سے شروع کرتی ہیں، اس لئے ان کا عوامی اور مقامی بولیوں پر توجہ دینا فطری ہے، قرآن کی بلاغت ہی اسلام کی دعوت کی اصلی روح ہے، اور اسی کا اعجاز تھا کہ اس نے تھوڑی سی مدت میں سریانی، قبطی، بربری، حبشی اور آرمی زبانوں کو بے اثر کر دیا۔ درحقیقت مقامی لہجے، عوامی اور معیاری زبان، نیز لاطینی حردت وغیرہ کی باتیں سب مستشرقین کی سازش کا نتیجہ ہیں جس کے مضر اثرات سے خود ہمارا مغرب زدہ طبقہ بھی محفوظ نہیں رہ سکا، چنانچہ ڈاکٹر محمد کمال حسین نے کہا کہ میں آسان اور سادہ زبان کا حامی ہوں، بلاغت کو اب بھول جانا چاہئے، کیونکہ ہم کو اس سے شدید نقصان اٹھانا پڑا ہے، یہ قول اس بات کا غماز ہے کہ لغت کا نہ عقیدہ سے کوئی تعلق ہے اور نہ عربی زبان کا تاریخ اسلام سے کوئی رشتہ ہے، اس کا منشا یہ ہے کہ سائنسی دور اور سائنسی علوم کو بہ طور غالب کیا جائے، اس قسم کی فکری سطحیت خواہ کیسی ہی کرشمہ سازی کرے وہ بہ حال عقائد و افکار پر ضرب نہیں لگا سکتی، اور نہ اس حقیقت پر پردہ ڈال سکتی ہے، کہ اسلامی انقلاب اور مسلم ثقافت نے عالمی اور انسانی ادب کو عام داستانوں، قصوں اور افسانوں کی پست سطح سے نکال کر فکری رشد، پاکیزگی، عمل، مستحکم نظریات اور ایمان و اخلاق کے مرتبہ کمال تک پہنچا دیا، اور جب یہ قدریں قرآنی بلاغت سے ہم آہنگ ہوئیں تو انسان کا قلب و نفس ذوق و شوق کے کبف و وجد سے سرشار وہم کنار ہوا، اصل بات یہ ہے کہ مستشرقین کو عربی زبان سے یک گونہ عداوت و نفرت ہے، اور اس کا ایک بڑا سبب یہ ہے کہ وہ عربی زبان کی فہم و معرفت سے قاصر اور بلاغت و بیان کی اصطلاحات سے ناواقف ہیں مستشرقین کے اس مرض کے اثرات، ان کے عرب شاگردوں میں بھی سرایت کر گئے، ان کے علاوہ وہ لوگ بھی مستشرقین کے حلقہ بگوش ہوئے، جن کو قرآن اور اسلام سے بغض ہے، اور اسی بنا پر انھیں نصیح عربی سے بھی دشمنی ہے، ان لوگوں میں سے بعض نے عربی زبان اور بعض نے عربی شاعری کی بنیادوں پر نیشہ زنی کو اپنا مسئلہ بنا لیا ہے، دراصل مقامی اور عوامی بولیوں کی حوصلہ افزائی کرنے والے اسلام کے دشمن ہیں، ان کا اولین مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو قرآن مجید سے



دور کر کے فکرِ اسلامی کی ساری عمارت زمیں بوس کر دیں، اور ایک زبان، ایک اسلام اور ایک کتاب کا وہ اصول ہی باقی نہ رہنے دیں، جو مسلمانوں کو وحدت کی لڑھی میں پر دسے رکھنے کا واحد طاقت ور ذریعہ ہے، انہی خطرات کے پیش نظر ۱۹۳۹ء میں مؤتمرِ عالمِ اسلامی نے ایک تاریخی قرارداد منظور کی تھی، جس کی رو سے سارے عالمِ اسلام میں عربی زبان کی تعلیم کو، قرآن کی زبان ہونے کا لحاظ کرتے ہوئے ضروری قرار دیا گیا تھا، یہ بھی فیصلہ ہوا تھا کہ ساری اسلامی زبانوں کا رسم خط عربی ہو،

مستشرقین نے عربی زبان میں فساد و خرابی پیدا کرنے کے لئے جو مہم چلائی ہے، اس کا نمونہ ہمیں ان کی عربی لغت کی کتاب منجد میں بھی ملتا ہے، اس میں اصل عربی زبان میں غیر عربی اصطلاحات کو منظم طریقہ سے داخل اور رائج کرنے کی کوشش کی گئی ہے، الفاظ کی تشریح و توضیح میں دانستہ غلط بیانی سے کام لیا گیا، مثلاً لفظ طلاق کی تشریح میں یہ لکھا گیا کہ وہ لوگ جن کو اسلام پہنچا ہے جبر داخل کیا گیا، لفظ ع، م، د کی تشریح میں لکھا ہے کہ محمود دیکھ پانی سے بچو کہ وہ ہونا، حالانکہ محمود عربی زبان کا لفظ نہیں ہے، بلکہ قبلی لفظ ہے، جو دال کے بجائے ذال سے لکھا جاتا ہے، ڈاکٹر مصطفیٰ جواد تحریر فرماتے ہیں کہ منجد کی غلطیاں حد شمار سے باہر ہیں، محض تین چوبیس غلطیاں کی ہم نے نشاندہی کی ہے، جب کہ ہم نے صرف ضرورت کے وقت ہی منجد دیکھی ہے۔

مستشرقین اور | مستشرقین میں مارگولیو تھ، کلان ہوار، گب، نلینو، بروکلان، بلاشیر، کراتشوفسکی وغیرہ نے عربی ادب عربی (۲) | ادب کے مطالعہ میں فرقہ باطنیہ اور انخوان الصفا کے ادب کو زیادہ اہمیت دی، اور اس کی روشنی میں یہ فیصلہ کیا کہ ادب عربی میں فارسی فکر اور یونانی ادب کی آمیزش ہے، مارگولیو تھ نے جاہلی شاعری کے بارے میں ایک خود ساختہ نظریہ قائم کیا، ۱۹۲۵ء میں انھوں نے اپنے خیالات کو استشرق کے علمبردار ایک رسالہ میں شائع کیا، ۱۹۲۶ء میں اسی مضمون کو طہ حسین نے اپنی کتاب الشعر الجاہلی میں شامل کر لیا، جس طرح دوسرے اسلامی علوم میں مستشرقین کا ایک مخصوص نظریہ ہے، اسی طرح ادب کو بھی وہ ایک خاص نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ بروکلان اپنی کتاب الادب العربی میں قرآن کے باب میں لکھتے ہیں، کہ قرآن کے بنیادی اصول نصرانیت سے ماخوذ ہیں لیکن گولڈ زبیر کا خیال ہے کہ ان آخذ کا تعلق یہودیت سے ہے، بعض لوگوں کے نزدیک وہ دونوں سے ماخوذ ہے، ان کے خیال میں کئی سورتیں نصرانیت سے اور مدنی یہودیت سے متاثر کا نتیجہ ہیں، کیونکہ مکہ میں مسلمانوں کے پڑوسی نجران کے عیسائی تھے اور

میں غطفان کے یہودیوں سے ان کا خلا ملا ہوا۔

عربی زبان کے قومی و عوامی ادب پر ان مستشرقین کی خاص توجہ رہی، عشقیہ شاعری، الف لیله کے افانوں اور انسانی کی کہانیوں کو بھی ان لوگوں نے اپنی ادبی تحقیق کا مرکز بنایا، نولدکی اور مولر نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہی مہلکوں کے ویرانہ پن کا اثر عربوں کی زبان پر آیا، اور پھر الہا کے شہری ادب میں نمایاں ہوا، مستشرقین کے مغرب زدہ عرب شاگردوں نے عربی ادب پر فرانسیسی مادی نظریات کو منطبق کر کے غلط نتائج پیش کرنے کی کوشش کی کہ انسان ماحول اور زمانہ کا پابند ہے، وہ مجبور ہے بے اختیار ہے، وہ ایک مادی حیوان اور غنیمت اور دہلی کا غلام ہے۔

مستشرقین نے سب سے تعلقات، مقالات، حریریں، کلیلہ دہنہ، جوان امر و القیس، الف لیله اور رسائل انخوان الصفا پر زیادہ دیا تحقیقی دیا، کیونکہ وہ اس عشقی عربی ادب کا کوئی اثر نہ تھا، جو قرآن و حدیث کے زیر اثر تھا، اسی طرح ان مستشرقین نے عمرانی آثار، انخوان اور فاک بے بیٹے شاعروں کے کلام کے اجراء پر زیادہ زور دیا تھا یہ سب تعصب اور اسلام دشمنی کے اثرات ہیں، گب نے عمرانی آثار کو عدلیطولی (دور شجاعت) قرار دیا، مستشرقین کو اسلام سے پہلے کے دور کو عمرانی کا نام دینا بھی گوارا نہیں، بلکہ وہ اسے رومی، ترقی اور تہذیب و ثقافت کا دور قرار دیتے ہیں، اور اسلام کے دور کو وسعت کے دور سے موسوم کرتے ہیں، تاکہ اس وہم و اشتباہ میں مبتلا کر دیں، کہ اسلام نے کوئی حقیقی انقلاب نہیں برپا کیا، بلکہ وہ محض اپنے سے پہلے کے دور کے تابع ہے، لغت کے دائرہ میں انہوں نے یہ وہم پیدا کیا کہ زبانیں وہ ہیں، شمالی اور جنوبی۔

گب اور سنکسن نے اس بات پر زور دیا کہ عرب دنیا، یونانی تہذیب و ثقافت سے متاثر ہے، خصوصاً علم کلام میں وہ مکمل طور پر یونانی تہذیب کی خوشہ چین ہے، اور نحو و بلاغت میں وہ یونانی کے ساتھ فارسی زبان و تمدن سے بھی متاثر ہے۔ گب کا یہ بھی قول ہے کہ جن لوگوں نے عباسی عہد میں فکر و فن کے پرچم کو سر بلند کیا، وہ یا تو مسیحی تھے یا نیم مسیحی، معتزہ کو بھی وہ اسی حیثیت سے اہمیت دیتے ہیں کہ یہ لوگ یونانی فکر سے متاثر تھے، آل بویہ اور شیعوں کی سیاسی کامیابیوں میں گب یونانی طرز فکر کے اثرات کی نشاندہی کرتے ہیں، وہ موشحات و مقالات کی بھی قدر کرتے ہیں، مگر مملوکی دور کو وہ انجھٹا کا دوکتے ہیں، حالانکہ یہ دور علمی کارناموں اور فتوحات سے بھرپور ہے، عہد عثمانی کے بھی وہ بڑے نکتہ چین اور اس کے متعلق سخت نفرت و تعصب کا اظہار کرتے ہیں، جدید عربی بیداری کو وہ فرانسیسی حملوں اور مشنریوں کے اثرات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

جاک بیرک اپنی کتاب مختارات من الادب العربی المعاصر میں عربی ادب کی نشاۃ ثانیہ کا سرتین عیسائی ادیبوں بطرس سکافی، بازجیاں اور جرجی زیدان کے سر باندھے ہیں، اور لکھتے ہیں کہ یہ روشن مشائخ اقلیت سے تعلق رکھتے ہیں، بعد میں مسلمان بھی اس میں شامل ہوئے، وہ مہاجرین ادیبوں مثلاً جبران و نقیہ کو بھی بڑی اہمیت دیتے ہیں ان کا خیال ہے کہ جدید عربی ادب کی نمایاں شخصیت طہ احسن ہیں، لیکن ان راویوں کی کوئی وقعت نہیں، کیونکہ وہ اپنے عہد کے خیالی ادب سے متاثر تھے، اسی لئے جب انھوں نے آزاد شاعری اور لوئیس عوض، حسین نوذری، نجیب محفوظ، اور سعید عقل وغیرہ کی تحریروں کو اہمیت دیا تو کوئی بھی ان کا ہمنوا نہ ہوا۔

ڈاکٹر بنت اشالی نے اپنے ایک تحقیقی مقالہ میں صرف نیکسن کے بارہ میں لکھا ہے کہ عربی فن پاروں کو سمجھنے میں ان بے شمار غلطیاں سرزد ہوئی ہیں، ان میں سے بعض سے تو صرف نظر کیا جاسکتا ہے، لیکن اکثر غلطیاں وہ ہیں جن سے منظرِ علم کی بڑی مضحک صورت سامنے آتی ہے۔

مستشرقین اور سنت | سنت و حدیث کے بارہ میں مستشرقین کا نقطہ نظر بعینہ وہی ہے جو اس سے پہلے قرآن اور سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق گزر چکا ہے، کیونکہ سنت بھی دراصل سیرت کا جزو اور قرآن کی تفسیر ہے، اس لئے اسے بھی مشابہہ مشکوک جعلی اور کھوٹا قرار دینا ضروری تھا، نو مسلم مشرق ایتان دینیہ لکھتے ہیں کہ یہ تصویر ہی دشوار ہے کہ سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم، لکھنے وقت یا حدیث کا مطالعہ کرتے ہوئے مستشرقین اپنے جذبات و خواہشات سے آزاد ہیں، اسی لئے انھوں نے سیرت نگاری میں اس قدر تحریف سے کام لیا کہ صحیح واقعہ اور اصل حقیقت رو پوش ہو گئی، باوجودیکہ ان لوگوں کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ معروضی اور غیر جانبدارانہ تنقید اور جدید علمی تحقیق کے اصولوں پر کار بند ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ان مستشرقین کے متعدد اعتراضات کا جواب ایتان دینیہ نے دیا ہے، ایک مشرق لائانس کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ لائانس کی علمی شہرت سے لوگوں کو دھوکہ ہو گیا ہے اور انھوں نے ان کو ثقہ سمجھ لیا ہے حالانکہ وہ اپنی کتابوں میں ایسے دلائل پیش کرتے ہیں، جن میں اکثر مغالطہ آمیز واقعات، حقیقت اور تاریخ کے خلاف ہیں، مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خلوت کو ناپسند کرتے تھے، حالانکہ تاریخ سے یہ پوری طرح ظاہر ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں تنہا ہی عبادت کرتے تھے، تاکہ آپ اپنے ذہن و شعور کو ایک نقطہ پر مرکوز کر کے اس مادی دنیا سے مکمل کیسویٰ حال کر سکیں، لائانس نے لکھا ہے کہ آپ پر غیب کا غلبہ رہتا تھا، حالانکہ قرآن میں ہے:



إِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ أَنَّكَ تَقُومُ أَدْنَىٰ مِن  
ثَلَاثِي اللَّيْلِ وَنِصْفَهُ وَثُلُثَهُ  
بیشک آپ کا رب جانتا ہے کہ دو تہائی رات سے  
بھی کم اور آدھی رات اور تہائی رات کی بوقت اٹھتے ہیں

لامانس نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پُر خُو ہوئے کا الزام بھی لگایا ہے، حالانکہ ہر شخص کو مسالو مہ ہے کہ کجا نے پیتے اور دنیاوی لذتوں سے آپ کس قدر بے نیاز و بے پرواہ تھے، لامانس جب بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کا ذکر کرتے ہیں تو وطن دشمنی کا کوئی موقع جانے نہیں دیتے اور ہر اسر تعصب و عناد سے کام لیتے ہیں، اس کے برخلاف اسلام کے دشمن ابو جہل، ابولہب اور منافقوں کی تعریف کرتے ہیں، اور ان کے معاملہ میں انتہائی نرم دکھائی دیتے ہیں جس کی وجہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ قاری اپنے دور کے عظیم ہیروؤں کے حالات کا مطالعہ کر رہا ہے، چند ایسے مستشرقین بھی ہیں جو لامانس کی طرح ہرزہ سرائی نہیں کرتے، بلکہ کبھی کبھی وہ کلمہ خیر و انصاف بھی کہہ دیتے ہیں، مثلاً کارلائل اور ہنری ڈی کاسٹری جن کا بیان ہے کہ عقل حیران ہے کہ قرآن کی آیات کا صدور ایک اُمتی انسان سے کیسے ہوا، سارا مشرق اس بات کا معترف ہے کہ لفظاً و معنی کسی بھی طرح سے اس قسم کی آیتیں پیش کرنے سے انسانی فکر قاصر ہے، محمد نے قرآن کو اپنی ناسا کی تصدیق کے ثبوت کے طور پر پیش کیا، جو آج تک ایک ایسا راز ہے جس کے طلسم کو توڑنا محال ہے، لیکن انہوں نے یہ کہ اس قسم کے خیالات رکھنے والے مستشرقین کی تعداد بہت کم ہے۔

اب ہم مستشرقین کے اس شبہہ کا ذکر کرتے ہیں کہ حدیث کی تدوین تاخیر سے ہوئی، یعنی دوسری صدی ہجری کے آغاز میں تدوین حدیث کا عمل شروع ہوا، جس سے مسلمانوں کو حدیث کے ذخیرہ میں کمی یا بیشی کرنے اور اپنے اغراض کے مطابق حدیث کو گھڑ لینے کا موقع ملا، گولڈزیئر، ڈوزی اور اسپرنگر اسی قسم کے خیالات کے ترجمان ہیں، گولڈزیئر کو اس بات کی صحت میں شک ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بہت سے صحیفوں کا وجود تھا، انہیں اس پر بھی کلام ہے کہ لوگوں کے سینوں میں حدیث محفوظ رہیں، اور وہ ثقہ راویوں کو ضعیف قرار دینے پر بھی مہر ہیں، اور یہ بھی ثابت کرتے ہیں کہ حدیث کو مدون کرنے والوں نے صرف انہی روایتوں کو جمع کیا ہے، جو ان کے اپنی ذاتی اغراض و خواہشات کے مطابق تھیں، اسپرنگر کا بھی یہی خیال ہے کہ تدوین حدیث کا عمل دوسری صدی ہجری میں شروع ہوا، اور ان حدیثوں کی روایت زبانی ہوئی، ڈوزی حدیثوں کی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے نسبت کے ہی منکر ہیں،

ان مستشرقین کے اعتراضات و شبہات کی علی و داریخی تردید ہوتی رہی ہے، جس سے ان کا تار و پود بکھر چکا ہے، یہاں ہم داکٹر

مصطفیٰ سابعی کا ایک بیان نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ احادیث رسولؐ کو یاد رکھنے اور ان کی نقل و روایت پر صحابہ کرام نے انتہائی توجہ دی، پھر ان کے بعد تابعین و تبع تابعین کا یہی طرز عمل رہا، ان لوگوں نے حدیثوں کو جمع کرنے اور ان کی روایت کرنے ہی کو کافی نہیں سمجھا، بلکہ انھیں تحریف اور کمی و زیادتی کے ہر شاہہ سے محفوظ رکھا، ان حضرات نے اس سلسلہ میں بے نظیر اور غیر معمولی جہد و کوشش کی، اور جعلی اور غلط روایتوں اور جھوٹے اور وضاع راویوں کا پتہ لگانے میں حیرت ناک دماغ سوزی کا ثبوت دیا، غلط اور گھڑی حدیثوں کی پہچان کے لئے سخت ضابطے اور اصول مقرر کئے، اور انتہائی محنت کے بعد حدیث کے ذخیرہ کو صاف کر کے ان کو صحیح کتابوں میں شامل کیا، اگر تدوین حدیث کے ان سارے مراحل کا دقت نظر سے جائزہ لیا جائے، تو مستشرقین کے تمام اعتراضات بے اصل معلوم ہوں گے، اور یہ ثابت ہو جائے گا کہ انھوں نے علم و تحقیق کے ساتھ کیسا مذاق اور کھیل کیا ہے، اور ذاتی بغض و عناد کی بنا پر تاریخ کا مرتبہ کس درجہ گرا دیا، ان مستشرقین کی علمی دیانت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ معراج بنی عباس نام کی ایک عامیانا اور پُر از خرافات کتاب کو جس کا کوئی علمی مقام نہیں ہے، وہ انتہائی اہمیت دیتے ہیں، اور اس کا موازنہ طریبہ خداوندی سے کرتے ہیں، ڈاکٹر مصطفیٰ سابعی نے یورپ کے طویل سفر میں مستشرقین کی معیت میں متعدد یونیورسٹیوں کا مشاہدہ کیا تھا جس کے بعد انھوں نے مستشرقین کے مندرجہ ذیل اغراض و مقاصد کی نشاندہی کی ہے۔

(۱) نصوص کو اپنے خود ساختہ نظریہ فکر اور من مانی خواہشات کے مطابق اور تابع کر دینا۔

(۲) بالقصد و بالارادہ نصوص میں تحریف کر دینا۔

(۳) تحریف کی گنجائش نہ ہونے کی صورت میں عبارت کا غلط مطلب نکالنا۔

(۴) مآخذ و مصادر کے بارے میں اپنا ذاتی فیصلہ تھوپنا۔

چنانچہ وہ ادبی کتابوں سے حوالے نقل کر کے اسے حدیث کے مباحث میں چسپاں کر دیتے ہیں، اور کتب تاریخ کے حوالے

دے کر انہی کے مطابق فقہی مسائل میں اپنا فیصلہ صادر کرتے ہیں، اس کے نتیجے میں وہ دیمیری کی کتاب الجوان کی روایتوں کو تو صحیح قرار دیتے ہیں، مگر امام مالک کی مؤطا کی روایتوں کی تکذیب کرتے ہیں۔

مستشرقین اور اسلامی قانون شریعت | چونکہ اسلام کی غرض و غایت ہی اسلامی شریعت ہے، اس لئے مستشرقین کی نگاہ غلط اندازہ و فتنہ ساز سے یہ گوشہ بھی مخفی و مستور نہیں رہا، چنانچہ لائسنس، مارگولیو تھ، گولڈ زیمیر، ریتان، گودان اور دوسرے مستشرقین

نے اسلامی شریعت میں بھی دو اندازی کر کے اس میں شکوک و شبہات پیدا کئے ہیں، اور اس میں تضاد و تناقض ثابت کیا ہے، یہ لوگ اسلامی قانون کے مطالعہ میں محقق کے بجائے داعض بن چکے ہیں، اور اسلامی قانون کو یہ باور کرانے لگے ہیں کہ ان کی پٹی اور تزلزلگی یہ ہے کہ اسلامی شریعت و قانون ہے، جو ان کی ترقی، کامیابی اور بہداری و سرفرازی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے، اور ان کی ترقی و بہداری کے مطابق ہونا چاہیے، زمانہ کی تبدیلیوں کے ساتھ اس میں بھی تبدیلی آنی چاہیے، حالانکہ اسلامی شریعت، خدائے حکیم کی مقرر کردہ ہے، جو معاشرہ کے امن و سکون اور حقیقی فوز و فلاح کی ضامن اور اپنے مشمولات و مضمرات اور جزئیات و تفصیلات کے اعتبار سے نہایت وسیع، کشادہ اور ہمہ گیر ہے، اور جس کی ساخت میں ایسی لچک ہے جو زمانہ اور ماحول کے تغیرات کو بطریق احسن قبول کرتی ہے، اسی بنا پر اس کے اصل اور راسخ اصولوں میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہی نہیں، قرآن، حدیث، سیرت اور دوسرے اسلامی موضوعات کی طرح اسلامی شریعت کے بارہ میں بھی یہ مستشرقین تضاد رائے بلکہ پراگندگی افکار کے شکار ہیں، ان کا دعویٰ کبھی یہ ہوتا ہے کہ وہ تمام عربوں کے عرف و عادات کا مجموعہ ہے، اور یہ انتہائی غلط اور باطل دعویٰ ہے، ساخت و غیرہ کے اس قسم کے خیالات کو علمائے اسلام نے پوری طرح لغو ثابت کر دیا ہے، اس سے بڑھ کر ان کا خطرناک دعویٰ یہ ہے کہ اسلامی شریعت دراصل رومی قوانین سے ماخوذ و مستعار ہے، یہ دعویٰ بھی سراسر باطل ہے، ۱۹۳۷ء میں لاہور میں قانون کی ایک بین الاقوامی کانفرنس میں باقاعدہ ایک قرارداد میں اس کی وضاحت کی گئی کہ اسلامی شریعت ایک مستقل بالذات شے ہے جس کا رومی قانون سے کوئی تعلق نہیں، اس طرح قانون و انصاف کے بین الاقوامی اداروں میں شریعت اسلامیہ کی نمایندگی قبول کرنی پڑی۔

اسلامی شریعت کی بحث میں مستشرقین نے دین و دنیا کی تقسیم اور حکومت و مذہب کی تفریق کا مسئلہ بھی اٹھایا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اسلام تو چند مخصوص عبادات کا نام ہے، اسے معاشرہ کے انتظام اور سیاست و حکومت سے کوئی تعلق نہیں ہے، گویا وہ اسلام کو اپنے دین سبھی پر قیاس کرتے ہیں جس کی دین اور سیاست کی دوئی کی پالیسی سے جنگیزی باقی رہ گئی ہے، اگر یہ مستشرقین واقعی اسلامی شریعت کا دیا متدارانہ تجزیہ کرتے تو انھیں یہ اعتراف کرنے میں تامل نہ ہوتا کہ اسلام اپنی خصوصیت اور مزاج کے اعتبار سے ایک دین حیات بھی ہے اور نظام حیات بھی، اور ان دونوں میں تفریق و فصل کی کوئی گنجائش نہیں، ان لوگوں نے البتہ دین و دنیا کے درمیان اس لئے حد فاصل قائم کی ہے کہ اسلامی معاشرہ میں اسلامی قوانین کے بجائے ان کے وضع کردہ قانون کی کاپی اور بالادستی قائم رہے، جس کے نتیجے میں وہ کبھی اسلامی معاشرہ پر منطبق ہی نہ ہو سکے۔



اوپر گزر چکا ہے، مستشرقین کے ایک طبقہ کا یہ کہنا ہے کہ اسلامی شریعت، رومی قوانین سے ماخوذ ہے، علمائے  
اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے شریعت اور قانون کے عمیق و دقیق فرق کی وضاحت کی ہے، اور بتایا ہے کہ شریعت جسم اور  
روح میں کوئی فرق نہیں کرتی، بلکہ ان میں ہر ایک کی پوری رعایت کرتی ہے، کیونکہ ان ان دونوں کا مجموعہ ہے، وہ یہ بھی  
واضح کرتے ہیں کہ فقہ اسلامی کے دائرہ بحث میں عبادات، معاملات اور عقوبات وغیرہ شامل ہیں، جبکہ رومی قوانین  
کا موضوع اشخاص اور ان کے مابین خصومات ہیں، اسلامی قوانین کا سرچشمہ وہ کلام الہی ہے جو آنحضرت ﷺ کی جانب  
وحی کیا گیا، اور رومی قانون انسانی عقل کی کار فرمائی کا نتیجہ ہے، اسلامی قانون کا خلاصہ و عطر لا الہ الا اللہ محمد  
رسول اللہ ہے، رومی قانون کا دار و مدار سربراہ حکومت یا عرف عام پر ہے، رومی قوانین کی کتابیں دستور و قانون  
امور مملکت اور نظام حکومت کے ضابطوں کو امور سیاست قرار دیتی ہیں، جب کہ فقہائے اسلام کے نزدیک مسلمانوں کا امام جس  
طرح ان کی نماز جماعت کا امام ہوتا ہے، اسی طرح وہ ان کا سربراہ حکومت بھی ہوتا ہے، قتل کے جرم میں مسلمانوں کے یہاں نیت  
کے اعتبار سے قتل عمد اور قتل خطا کی سزائیں دیت اور قصاص کی صورت میں مرتب ہوتی ہیں، لیکن رومی قوانین میں ایسی  
کوئی وضاحت نہیں، اسلام میں قتل، زنا، چوری، ہتھیان، شراب خوری اور ارتداد کے حدود کی نوعیت بھی یہی ہے، جبکہ رومی قوانین  
میں زنا، ہتھیان اور شراب نوشی حرام نہیں ہیں، اس لئے ان کی کوئی سزا ہی نہیں ہے۔

علمائے اسلام نے ان شبہات کا بھی جواب دیا ہے جو شناخت اور گولڈزیرو وغیرہ کے پیدا کردہ ہیں کہ اسلامی عالمی اور  
اور جرائم و عقوبات کے قوانین، قبائلی نظام سے ماخوذ و مستفاد ہیں، شیخ ابو زہرہ نے اس غلط نظریہ اور اس کے پس پشت تعصب  
و عناد کی حقیقت عالمانہ انداز سے بیان کی ہے،

مشرق و مہاوزن اور ان کے بعد کبتانی، بیکر، ڈیل اور گارڈھمن نے یہ الزام تراشی کی ہے کہ عربوں نے جب دوسرے  
مالک کو فتح کیا تو اس وقت وہ مالیات و اقتصادیات اور ٹیکس وغیرہ کے نظام و مسائل سے بالکل نا آشنا تھے، ولما یزن  
کا خیال ہے کہ انھوں نے اپنے مفتوحہ علاقوں سے غیر منظم طریقہ سے ٹیکس وصول کئے، اور پھر ایرانی و رومی نظام قانون کو  
اختیار کر لیا، اس اعتراض کا جواب دیا گیا کہ عرب اسلامی حکومت کے قیام سے ہی مالیات کے نظام سے بخوبی واقف تھے،  
اور بجز چند خاص صورتوں کے انھوں نے اپنے مفتوحہ علاقوں سے کبھی کوئی ظالمانہ ٹیکس وصول نہیں کیا، اگر ٹیکس یا جزیہ  
یا گیا تو باقاعدہ و باضابطہ طریقہ سے، جس کی وصولی اور حساب کا علیحدہ نظام تھا، اور حالات و واقعات کے لحاظ سے

مشرقیین اور زیادتی بھی ہوتی تھی، اور یہ سب مرکز خلافت کی خاص اور کڑی نگرانی میں ہوتا تھا۔

مشرقیین نے خراج کی اہمات کتب شایع کیں یہ بھی بن آدم اور امام ابو یوسف کی کتاب الخراج کو بھی شایع کیا جو پہلے بھی چھپی تھیں، لیکن ۱۹۷۷ء میں امام ابو یوسف کی کتاب الخراج کا جو نیا ایڈیشن ان مشرقیین کے اہتمام میں شایع ہوا ہے، وہ معتبر اور لائق اعتماد نہیں ہے، کیونکہ یہ ان کی تحریف اور قطع زبرد سے محفوظ نہیں رہ سکا، اور اس کے اغراض اور نیتوں کا پتہ چلتا ہے، انھوں نے اپنے خود ساختہ نظریات کے مطابق اسلامی قانون خراج کو ڈھالنے کی کوشش کی ہے، اور اس کی ایسی بگڑھی اور مسخ تصویر پیش کی ہے جو تمام تر ان کے نظریات اور اغراض کے تابع نظر آتی ہیں۔

مشرقیین اور حقیقۃً نبی کریم ﷺ کی شخصیت ہی مشرقیین کی پرزہ سرائی، دہیہ کاری اور خردہ گیری کا اصل محور و سیرت نبویؐ مرکز ہے، اس بارہ میں ان کا رویہ کبھی بڑا جارحانہ ہوتا ہے، اور کبھی وہ مغالطہ آمیز نرم لہجہ اختیار کرتے ہیں ڈاکٹر کمال عیاد لکھتے ہیں کہ یورپ میں قرون وسطیٰ سے ترقیوں میں عدی عیسوی تک اسلام کے بارہ میں عجیب و غریب خرافات اور داستان مشہور ہی ہیں، جن میں نبی کریم ﷺ کی ذات مبارک، سب سے زیادہ سب و منہم کا نشانہ بنائی گئی ہے، بعد میں یورپ نے مذہبی تعصب سے آزاد ہونے کا اعلان اور اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ بھی مسلمانوں کی طرح سیرت رسولؐ کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے، اٹھارہویں صدی میں کچھ مغربی اہل تلم نے نبی کریم ﷺ کی شخصیت کو مجرد کرنے سے پرہیز کیا، اور آپ کے معاملہ میں عدل و انصاف کا رویہ اختیار کیا، گویہ عمل تادیر قائم نہ رہ سکا، ان لوگوں نے یہ اعتراف کیا کہ اکثر مشرقیین کا یہ عام شیوہ ہے کہ وہ حقیقت پر پردہ ڈال کر اسلام کے حقیقی چہرہ کو انداز اور مسخ کرتے رہے ہیں، مشرقی گلیوم بوٹل نے سیرت رسول ﷺ کا یہی نقطہ نظر سے جائزہ لیا، میٹیل بوڈیہ نے کلیسا کے مصادر سے اپنی معلومات کو آب و رنگ بخشا، ہوٹیکر نے سیرت کو پیش کرتے وقت مسیحی مشنری کے فریضہ کو انجام دیا، کچھ لوگوں کی نظر انتخاب میں صرف وہی واقعات آئے، جن میں ان کے لئے طنز و تشنیع کی گنجائش تھی، مزید براں انھوں نے ان میں اپنی جانب بہت کچھ مٹھک اور بے سرو پا واقعات بھی شامل کر دیئے، جن آیتوں میں مسیحیت کا ذکر تھا، ان پر خصوصی توجہ دی گئی، اور انجیل و قرآن کے مابہ الاختلاف واقعات کو بیان کر کے قرآن مجید کی حقانیت پر مسخر کیا گیا، اس طرح وہ علیٰ سنجیدگی کے دعووں کے باوجود صلیبی شراہنگیزی کی روش پر ہی قائم رہے۔

ان مشرقیین کی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ سیرت رسول ﷺ کے چند واقعات کے متعلق سب کے خیالات

یہاں ہیں، مثلاً بھیرا اہلب، درقہ بن نوفل اور قس بن ساعدہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ملاقات کا ذکر کر کے سب عجب اور دور از کار تاج اخذ کرتے ہیں، یہ لوگ بھیرا اہلب سے آپ کے ایک مدت تک نبی تسلیم اخذ کرنے کا ذکر کر دینے حالانکہ اس حقیقت سے یہ واقف نہیں ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھیرا اہلب سے دس گیارہ سال کی عمر میں ملے تھے، اور یہ سن و سال ایسا نہیں ہے کہ اس میں آپ کوئی تعلیم حاصل کرتے، چہ جائے کہ دینی مسائل کا استیعاب استقصا کرتے، پھر آپ کی ان سے ملاقات صرف ایک بار ابوطالب کی موجودگی میں ہوئی تھی، بغفل محو تماشاً ہے کہ صرف اس تھوڑے سے وقت میں بھیرا نے ایک بچہ کو کیسے اس قدر فیضیاب کیا، اور آپ نے کس طرح ان تعلیمات کو بالاستیعاب یادداشت میں محفوظ رکھ کر تقریباً تیس برس کے بعد اپنی رسالت کی صورت میں پیش کیا، لیکن مستشرقین کے علمی ذوق کو اس سے کیا سروکار، انہیں تو محض بہتان تراشی کرنی تھی، درقہ بن نوفل کو یہ لوگ نصرانیت کے ایک داعی کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں، حالانکہ درقہ ایک موحد شخص تھے، اور انھوں نے اس کی خبر دی تھی کہ آپ وہی ہیں، جن کی بشارت حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دی تھی، اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے اخذ و استفادہ کیا ہوتا تو مشرکین مکہ ہی نہیں بلکہ تمام لوگوں میں ضرور یہ خبر عام ہوتی، جو ان کے حق میں ایک عمدہ حربہ ہوتی۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کو مجروح کرنے اور آپ کی مالگیر اور دائمی رسالت میں شک و شبہ پیدا کرنے کے لئے ان مستشرقین کا ایک خاص اور اہم اعتراض یہ ہے کہ آپ نے متعدد شادیاں کی تھیں، اس سے وہ آپ کے جنسی پہلو اور شہوت رانی کو نمایاں کرنا چاہتے ہیں، لیکن مادہ پرست یورپ کے یہ دانشور اس حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ آپ کی متعدد بیویاں اس وقت تھیں، جب آپ کا سن پچاس برس سے بھی تجاوز کر چکا تھا، علاوہ ازیں آپ نے تبلیغی و دعوتی مصارع کے پیش نظر کئی شادیاں کی تھیں، ورنہ آپ کی جوانی کی عمر کا بڑا حصہ ایک ہی حرم کے ساتھ گزرا۔

اسی طرح مستشرقین نے وحی کو بھی اپنا نغمہ ریشق بنایا ہے، وہ اسے آپ کی نفسیاتی و عقلی کمزوری اور بیماری کا نام دیتے ہیں، خالص مادہ پرست ہونے کی بنا پر یہ لوگ وحی کی حقیقت کے فہم و ادراک سے عاجز و قاصر ہیں، وحی کی کیفیات اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حامل ذوق حضرت جبریلؑ کے تعلقات کی نوعیت کو یہ لوگ نہیں سمجھ سکے اور نہ ان حدیثوں کے مفہوم و آگاہ ہو سکے جن میں حالات و کیفیات وحی بیان ہوئی ہیں، اس لئے انھوں نے اس کی نہایت غلط توجیہ کی ہے۔

کچھ مستشرقین اس نرم لہجہ سے اپنی بات شروع کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے زمانہ کے تقاضوں اور اپنی ماحول



کے چیلنجوں کی بناضی کی اور ان میں اصلاح و درستگی کی سعی بھی کی۔ گویا آپ کی حیثیت دنیا کے عام مصلحین اور لیڈروں کی طرح ایک مصلح، انقلاب حریت کے علمبردار اور معاشرتی، سماجی و اجتماعی انصاف کے داعی کی ہے۔ اور آپ صرف ایک رفیق مرتھے، اس قسم کی رائے زنی کا اصل سبب یہ ہے کہ ان لوگوں نے وحی اور پیغام الہی کی کنہ و کیفیت سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی، یا کی تو وہ اس میں عاجز و قاصر رہے، اس کے علاوہ بعض دوسرے اسباب بھی غلط فہمی کا باعث بنے ہیں جن کا اجالی ذکر اوپر ہو چکا ہے، یعنی نصوص اور اصل عباراتوں میں تحریف، مذہبی تعصب، اسلام اور مسلمانوں سے کد و عناد اور اپنی مرضی کے مطابق تشریح و تفسیر، اور دیدہ و دانستہ حق سے چشم پوشی۔ فریب اور لوگوں کو گمراہ کرنے کی عادت وغیرہ۔ مارگولیو تھ نے سیرت رسولؐ پر ایک ضخیم کتاب لکھی جس میں محققین نے بہت زیادہ غلطیوں کی نشاندہی کر کے ان کی اصل وجہ یہ بیان کی ہے کہ مارگولیو تھ واقعات کی تعبیر اپنی مرضی سے کرتے ہیں، غلط مفروضے قائم کرتے ہیں، اس کے علاوہ انھیں عربی زبان کا کافی علم تھا، لہذا اس نے خاص طور پر تحریف نصوص کے عمل کو اپنایا ہے، انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تاریخ پیدائش تک میں تحریف کر ڈالی ہے، اور بلا کسی مستند تاریخی ثبوت کے حضرت فاطمہ زہرا کی پاک سیرت کو بھی غیب دار بنانے کی کوشش کی ہے، اسی لئے ان کا اعلیٰ مقام اب خود مستشرقین کی نگاہ میں ساقط ہو چکا ہے، اور انھوں نے ان کی مضحک غلطیاں پیش کر کے ان کی بے اعتبار تحریروں سے محتاط رہنے کی تلقین کی ہے۔

محمد کامل عیاد کا بیان ہے کہ مستشرقین کی اکثریت محض اپنے مذہبی تعصب کی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کی قدر و قیمت پہنچانے سے قاصر رہی ہے، ان میں ایک قلیل تعداد ایسے لوگوں کی ضرور ہے جو مذہبی تعصب کی عینک سے واقعات کو نہیں دیکھتی ہے، لیکن وہ بھی اپنے نظریہ تاریخ میں اس حد تک مبالغہ کرتے ہیں جسکی وجہ سے سیرت رسولؐ کی روشن اور شفاف تصویر غبار آلودہ ہو جاتی ہے۔

ایک مستشرق زید، ایف برڈلی ہیں جن کی تصنیف سیرت رسولؐ کا ترجمہ عربی میں بھی ہوا ہے، یہ کتاب بھی غلط و ادہام سے پُر ہے، مثلاً وہ لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بتوں کی عبادت کرتے تھے، اور آپ کے حصہ میں ان بنی ہاشم کی درائی تھی جو کعبہ کے بتوں کے محافظ تھے، آپ نے اپنے دور دراز کے متعدد سفروں میں راہبوں سے اور سونے کا ظامیں و اعظوں سے مواد و معلومات فراہم کیں، برڈلی نے بحیرا راہب اور درقہ بن نوفل وغیرہ سے بھی آپ کے متاثر ہونے کا ذکر کیا ہے، اور ازواج مطہرات کے باب میں بھی داد تحقیق دی ہے، ان کا دعویٰ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شام، یمن، فلسطین

ایران اور ایشیائے کوچک کی سیاحت کی، خدا جانے وہ کون سے تاریخی حوالے ہیں جن کی بنیاد پر برڈالی نے آپ کے کثرت سفر کا ذکر کیا ہے، جب کہ نورخین کا اتفاق ہے کہ آپ نے دو یا تین بار صرف شام کا سفر کیا ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مستشرقین کی کتابوں کے ایڈیشن ضرور نئے ہوتے ہیں، لیکن ان کے مضامین کی فرسودگی اور پامالی میں رافق نہیں آیا، نو مسلم مستشرق ایتان <sup>طینیہ</sup> نے اسی حقیقت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ مستشرقین تقریباً تین چوتھائی صدی تک اس کوشش اور بحث و محصل میں لگے رہے کہ کچھ ایسے نازک اور دقیق گوشے دریافت کر لیں جن سے جمہور مسلمانوں کے متفق علیہ ذخیرہ سیرت کو ہمارا کر دیں، مگر وہ آج تک ایک نئی بات بھی دریافت کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے، بلکہ اگر ہم پورے یورپ کے مستشرقین کے کارناموں کا بنظر غائر جائزہ لیں تو سوائے غلطیوں اور غلط بیانیوں کے کچھ بھی نظر نہیں آسکا البتہ یہ حقیقت سامنے آئے گی، کہ ان لوگوں نے اپنی ساری کوشش و کاوش اس میں صرف کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت کو مسخ کر دیا جائے، اس کے لئے انھوں نے غیر مستند اور موضوع حدیثوں سے بھی مدد لی ہے، اور مستند واقعات و روایات کی ایسی توجیہ کی ہے، جن سے خلاف واقعہ اور غلط نتائج نکلے ہیں، اسی طرح مشکوک و مشتبہ روایتوں اور محدثین کے ضعیف و مرجوح اقوال کو اچھالنے کی کوشش کی ہے، یا حدیثوں کے بعض اجزا نکال کر انہیں دوسرے رنگ میں پیش کیا ہے، جیسا کہ مارگولیتس نے ایک روایت کے اس جز، یعنی انما احبب الی فی دنیاکم الطیب والنساء (تمہاری دنیا میں خوشبو اور عورتیں میرے لئے محبوب بنائی گئی ہیں) تو بیان کر دیا لیکن حدیث کے دوسرے حصہ وجعلت قوتہ علی فی الصلوٰۃ (اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں ہے) کو حذف کر دیا، تاکہ یہ ظاہر ہو کہ رسول اللہ ﷺ دنیا پر کس قدر

فریفتہ تھے۔

(معارف ستمبر ۱۹۸۳ء)



# ہمارے عصری تعلیمی اداروں

## مستشرقین کے اعتراضات

مولانا قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی (دہلی)

”مستشرقین“ کے نام سے یورپ اور امریکہ کے جن دانشوروں کو یاد کیا جاتا ہے ان کے متعلق مختلف رائیں ظاہر کی جاتی ہیں، کہا جاتا ہے، کہ یہ جماعت علوم و فنون کے شائقین کی ہے، سترہویں صدی عیسوی میں جب یورپ قرونِ مظلمہ کی تاریکی سے باہر آیا، اسلامی ممالک خصوصاً اندلس کے علمی خزانوں کے بواہرات اس کے قبضہ میں آئے، اور وہاں علم کی روشنی پھیلنی شروع ہوئی تو یہ اس کی طرف پلکے، ان میں سے ایک جماعت نے علوم اسلامی کو اپنا موضوع بنایا، تفسیر و حدیث و سیرت سے متعلق نایاب کتابوں کو جاں فشانی اور دیدہ ریزی کے ساتھ ایڈٹ کیا، شوق و محنت کے ساتھ مغربی زبانوں میں ان کے ترجمے کئے، اور ان کو زیور طبع سے آراستہ کر کے مشرق و مغرب میں پھیلایا۔

جس طرح ریگستان میں بٹکنے والا قافلہ آب سرد و شیریں کا چشمہ پاکر اس پر ٹوٹ پڑتا ہے، یہ تشنگانِ علم اسی طرح ان علوم پر ٹوٹے، اور انھوں نے اپنی علمی پیاس بھی بجھائی، اور دوسرے کو بھی سیراب کیا، مسند امام احمد بن حنبل اور طبقات ابن سعد کی تدوین و طباعت کے سلسلہ میں مار گولیتھ اور پروفیسر سنخاڈ قابلِ تشکر ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ یہ وہ دانشور ہیں جنہوں نے ایشیا اور افریقہ پر مغربی اقوام کے اقتدار حاصل کرنے کے بعد ان پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لئے ایشیائی اور اسلامی علوم و فنون کی طرف توجہ کی، جیسا کہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانہ میں ہوا کہ ۱۷۸۳ء میں کلکتہ میں ایشیاک سوسائٹی اور فورٹ ولیم کالج قائم کیا گیا۔ اور دہلی میں انیسویں صدی عیسوی کے اوائل میں دہلی کالج اور اس سے متعلق دارالترجمہ کی تاسیس کی گئی، جہاں ایک طرف انگریزی حکومت کی مشینری کے لئے ہندوستانی پرزے ڈھالے گئے، تو دوسری طرف نووارد مغربی حاکموں کو اپنی مشرقی رعایا کی زبان تاریخ و تمدن و تہذیب سے روشناس کرانے کا سامان کیا گیا۔



مستشرقین کی فرست بہت طویل ہے۔ مولانا شبلی نعمانی نے اپنی سرکۃ الآرا کتاب سیرۃ النبئی کے حصہ اول کے مقدمہ میں بہت سے نام گنائے ہیں۔ اور اب نصف صدی گزرنے کے بعد، ان میں خاصہ اضافہ ہو چکا ہے، اس لئے کہ متعلق کوئی ایک حکم رگانا انصاف سے بعید ہے، تاہم یہ حقیقت ناقابل انکار ہے، کہ ان میں بہت بڑی تعداد ان متعصب مصنفوں اور پادروؤں کی ہے، جنہوں نے فلسطین کے میدان میں مجاہدین اسلام کے ہاتھوں، ممالک یورپ کے مشترکہ عیسائی لشکروں کے شکست کھانے کے بعد مجاذ جنگ تبدیل کیا، اور اسلام اور پیغمبر اسلام کے خلاف قلمی جنگ شروع کی اور ان کیلئے روئے روشن پر ایسی کڑی نظر اچھالی کہ انسانیت و شرافت کا سر شرم و ندامت سے جھک گیا، اسی مقصد کو منظم طریقے پر پورا کرنے کے لئے بعد میں انہوں نے یورپ، امریکہ اور کینیڈا میں تحقیقات علوم اسلامی کے نام سے ادارے قائم کئے، اب زمانہ کے حالات بدل گئے ہیں، اس لئے طریقہ جنگ بھی بدل گیا ہے، اب پیغمبر اسلام اور تعلیمات اسلام پر جو کتابیں اور مضامین شائع کئے جا رہے ہیں، ان کا اندازہ مناظرانہ نہیں بلکہ محققانہ اور غیر جانبدارانہ اور نئی اصطلاح کے مطابق معروضی ہوتا ہے، مگر اس میں دودھ کے گلاس میں زہر اس خوبی سے ملائے ہیں کہ پینے والے کو احساس تک نہیں ہوتا اور اندر ہی اندر ایمان و یقین کی آتیں کاٹ دیتا ہے۔

"معروضی مطالعہ قرآن کا مطلب جیسا کہ بتایا جاتا ہے، یہ ہے کہ قرآن کا مطالعہ صرف ایک کتاب کی حیثیت سے کیا جائے، اور اس امر کو نظر انداز کر دیا جائے کہ وہ کس کی ہے اور اس کا مقصد کیا ہے، گویا شروع ہی میں قرآن کے کتاب اللہ ہونے کی نفی کر دی جائے، اور ایمان کی بنیاد ہی کو مندم کر دیا جائے، حالانکہ قرآن کریم وہ صحیفہ ہدایت ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کی رہنمائی کے لئے نازل کیا گیا ہے، اس سے استفادہ کی شرط اول یہ ہے کہ اس کے منزل من اللہ ہونے پر یقین ہو۔ دل میں اس کی پوری عظمت و حرمت ہو، اس سے ہدایت طلبی کا جذبہ کامل ہو، پھر آئینہ دل گناہوں کے زنگ سے پاک صاف ہو تاکہ اس میں ہدایت ربانی کی کرنیں بلوہ کر ہو سکیں۔ یہ شرائط جس درجہ میں پائی جائیں گی اسی درجہ میں ہدایت قرآن سے استفادہ ہو سکتا ہے اور نکتہ قرآنی کے خزانہ سے دامن طالب کو بھرا جاسکے گا۔"

قرآن کریم میں شروع ہی میں واضح کر دیا گیا ہے کہ ذَالِكِ الْكِتَابِ لَارْتِيْبٍ فِيْهِ، هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ  
 کہ یہ کتاب ایسی کتاب ہے، کہ جس کے منزل من اللہ ہونے میں، اور دین و دنیا کی صلاح و فلاح کا سرچشمہ ہونے میں

کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، یہ شمع ہدایت ہے، مگر ان لوگوں کے لئے جو تقویٰ رکھتے ہیں، تقویٰ نفس انسانی کی وہ کیفیت ہے جو اسے اللہ سے ڈرنے اور اس کی نافرمانی سے بچنے پر آمادہ کرے، "ہدایت قرآنی کا حصول اسی پر ہوتا ہے، اس کے بہت کم درجات ہیں، جس درجہ کا تقویٰ ہو گا اسی درجہ کی ہدایت حاصل ہو سکے گی۔

خوف خدا اور اللہ کی نافرمانی سے احتراز تو بعد کی بات ہے، جب ان کی بنیاد ایمان باللہ ہے، تو خواہ قرآن کریم کی الفاظ کی تحقیق میں ہزاروں صفحات سیاہ کر دیئے جائیں، اور قرآن کریم کی آیات کی ترتیب زمبویب میں جلدیں کی جلدیں تیار کر دی جائیں ہدایت ربانی اور حکمت قرآنی کی روشنی سے دل و دماغ منور نہ ہو سکیں گے۔

ان لوگوں کا حصہ قرآن کریم جیسی کتاب ہدایت میں سے بھی بجز ضلالت و شقاوت و گمراہی و حیرانی کے کچھ نہیں، چنانچہ ارشاد ربانی ہے کہ

يُضِلُّ بِهِ كَثِيرًا وَيَهْدِي بِهِ كَثِيرًا وَمَا يُضِلُّ بِهِ إِلَّا الْفَاسِقِينَ  
 اس قرآن کریم سے، اللہ تعالیٰ بہت سے لوگوں کو  
 گمراہ کرتا ہے، اور بہتوں کو ہدایت دیتا ہے، اور گمراہ  
 فاسقوں کو ہی کرتا ہے۔

حدیث میں بھی فرمایا گیا ہے۔

إِنَّ اللَّهَ يَرْفَعُ بِهَذَا الْكِتَابِ أَقْوَامًا  
 اللہ تعالیٰ اس کتاب کے ذریعہ کچھ قوموں کو بلند  
 و يَضَعُ بِهِ آخَرِينَ  
 کرتا ہے، اور کچھ کو گرتا ہے۔

بہر حال ہمارے ان مستشرقین کے شوق و محنت کی آپ داد دے سکتے ہیں، ان کے شاندار اداروں کی جہاں یہ بڑے بڑے وظیفہ دیکر مسلمان طلبہ کا شکار کرتے ہیں، ان کی عنیم اور خوبصورت کتابوں کی جن کی چمک دمک آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے آپ تعریف کر سکتے ہیں، مگر اسلام کی حقیقت اور قرآن کی حکمت کے انوار سے ان کے کارخانوں کو کیا تعلق، مجھے اس وقت ایک واقعہ یاد آگیا۔

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کی طلائی جلی بڑی شان و شوکت کے ساتھ منائی گئی، اس موقع پر مدارس اسلامیہ کی ایک کانفرنس بھی منعقد ہوئی تھی، اس کے پہلے اجلاس کی صدارت شیخ الاسلام مولانا حسین احمد مدنی نے فرمائی تھی، اور دوسرے اجلاس کی علامہ سیلیمان ندوی نے کی، میں ایک طالب علم کی حیثیت سے حضرت مدنی کے ساتھ تھا، مولانا

ابوبکر شہید، ناظم دینیات مسلم یونیورسٹی اس اجلاس کے صدر استقبالیہ تھے، حضرت مولانا ابوبکر نے حضرت مولانا مدنی کا غیر مقدم کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ :-

”الفاظ قرآن و حدیث کی تحقیق میں، خواہ یورپ اور امریکہ کے دانشور کتابوں کے انبار لگا دیں، مگر معافی و مطالب کتاب و سنت کی تحقیق کے لئے ہمیں آپ جیسے علمائے اعلام کے سامنے ہی زانوئے ادب تہ کرنا پڑے گا۔“

بہر حال یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ علوم اسلامیہ کی تعلیم و تحقیق کے سلسلہ میں، یورپ امریکہ اور کینیڈا کے اسلامیات کے ادارے، کھوٹے سکوں کی ٹکسال سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے، مگر ہماری انتہائی محرومی اور نادانی ہے کہ ہمارے ہندوستان کے اسلامی عصری تعلیمی اداروں میں وہاں کے بڑے سکوں کو ذرا خاص سمجھ کر قبول کیا جا رہا ہے۔

ہندوستان میں تین یونیورسٹیاں ہیں جن کا خصوصی تعلق مسلمانوں سے رہا ہے، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اور عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد، مسلم یونیورسٹی، تمام دنیا میں ہندوستانی مسلمانوں کے تعلیمی مرکز کی حیثیت سے شہرت رکھتی ہے، اور مسرت ہے کہ ہندوستان کی پارلیمنٹ نے بھی اس کی اس حیثیت کو قانونی طور پر تسلیم کر لیا ہے،

سر سید احمد خاں مرحوم نے انیکو محمد بن کالج کی حیثیت سے اس کی بنیاد ڈالی تو مقصد یہ فرار دیا کہ فلسفہ ہمارے دائیں ہاتھ میں ہوگا، نیچر سائنس بائیں ہاتھ میں اور لا الہ الا اللہ و محمد و رسول اللہ کا تاج سر پہ چنانچہ اس مقصد کے لئے انھوں نے شروع ہی میں شعبہ دینیات قائم کیا جس میں مولانا عبدالنصاری، مولانا سلیمان انشرف، مولانا ابوبکر شہید رحمہم اللہ اور مولانا سعید احمد اکبر آبادی جیسے علماء راہنہ شامل رہے۔

۱۹۲۰ء میں انگریزی حکومت کے اثرات سے آزاد ایک اسلامی یونیورسٹی کی ضرورت رئیس الاحرار مولانا محمد علی اور مسیح الملک حکیم اجل خاں نے محسوس کی تو جامعہ ملیہ اسلامیہ قائم ہوئی، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمود الحسن نے انتہائی ضعف و نقاہت میں اس کا افتتاح اس امید سے کیا کہ ملت اسلامیہ کے جس درد و غم سے ان کی ہڈیاں گھل رہی ہیں، یہ اس کا مدد دہوگی۔ اپنے استاد کی اسی آرزو کی تکمیل کے لئے حضرت مولانا عبدالنصاری نے وہاں بیت الحکمت قائم کیا، اور حضرت شاہ ولی اللہ کے فلسفہ اسلام کا درس دیا جس میں مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین پابندی کے ساتھ شریک ہوتے رہے، ڈاکٹر صاحب نے ایک مرتبہ مجھ سے فرمایا کہ ان کی خواہش ہے کہ انگریزی اور اردو ادب کے لئے ایسی کتابیں



تیار کی جائیں جن میں اسلامی عقائد و تعلیمات کو سمویا گیا ہو، تاکہ طلبہ اسلامی رنگ میں پوری طرح رنگے جاسکیں۔  
یہاں بھی علی گڑھ سے بھی زیادہ اہمیت کے ساتھ شعبہ دینیات قائم رہا جس میں مولانا عبدالحی فاروقی، مولانا محمد سورتی اور مولانا محمد اسلم جیراج پوری جیسے فضلاء، قرآن کریم، حدیث شریف اور ادب عربی کا درس دیتے رہے۔  
عثمانیہ یونیورسٹی کو بھی اس حیثیت سے اسلامی یونیورسٹی کہا جاسکتا ہے، کہ یہ ایک مسلم ریاست کے زیر سایہ قائم ہوئی  
اس میں شروع ہی سے بڑے اہتمام سے شعبہ دینیات قائم کیا گیا، جس میں مولانا مناظر احسن گیلانی جیسے فضلاء نے علوم  
اسلامی کی نشر و اشاعت کی اور ڈاکٹر حمید الشریحیے فاضل شاگرد پیدا ہوئے،

اب بھی مسلم یونیورسٹی کا شعبہ دینیات قائم ہے، مگر اس کی حیثیت کو بہتر بنانے کی ضرورت ہے، باقی دونوں  
یونیورسٹیوں میں شعبہ دینیات کو ختم کر دیا گیا ہے اور اس کے بجائے اسلامک اسٹڈیز ڈیپارٹمنٹ قائم کر دیا گیا ہے۔  
ان شعبوں میں عمل دخل زیادہ تر مستشرقین یورپ و امریکہ کے لائق شاگردوں کا ہے۔ نصاب تعلیم سے قرآن و حدیث  
کے متون کو خارج کرنے کے بعد صرف علوم اسلامی کی تاریخ اور ان کی تنقید پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔ نصابی کتابیں زیادہ  
ترانہ مستشرقین کے نتائج افکار ہیں، جن میں اسلام کو مغربی لباس میں پیش کیا جاتا ہے۔ اور تحقیق و تنقید کے نام پر،  
مفسرین و محدثین و فقہاء و صوفیہ کے افکار و کردار کو مجروح و مشتبہ بنایا جاتا ہے، تاکہ وہ ستون ہی گرا دیئے جائیں جن پر  
اسلام کی عظیم و رفیع عمارت قائم ہے، اس صورت حال کا نتیجہ واضح ہے، جب اساتذہ کرام کا یہ حال ہو تو غریب طلبہ  
کا علمی و عملی حیثیت سے جو حال ہو سکتا ہے ظاہر ہے۔

گر ہمیں مکتب است و ہمیں ملا کار طعناں تمام خواہد شد

یہی صورت حال کم و بیش ہندوستان کے علاوہ پاکستان، مصر و شام وغیرہ میں بھی ہو سکتی ہے، مگر وہاں کسی بھی  
وقت رائے عامہ کو منظم کر کے طاقت کے ذریعہ ان حالات کو بدلایا جاسکتا ہے، مگر ہندوستان کے مسلمان ایسا نہیں کر سکتے۔  
تاہم وہ ایک ایسے ملک کے شہری ہونے کی حیثیت سے جہاں ان کو اپنی تہذیب اپنا تمدن اور اپنے علوم کو باقی رکھنے کا  
بلکہ ان کو پروان چڑھانے کا دستوری حق دیا گیا ہے، اپنی آواز بلند کر سکتے ہیں، اور اپنی ملی و دینی امید گاہوں کو، جن کو ان کے  
بزرگوں نے خون جگر سے سینچ کر پروان چڑھایا ہے، برباد ہونے سے بچانے کی کوشش کر سکتے ہیں۔

ملا متار کے خاتمہ کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ڈاکٹر مشیر الحق نے اس پر کافی روشنی ڈالی۔

(۲)

## مستشرقین اور تاریخ ترکی

ان

ڈاکٹر اکمل ایوبی، ادارہ علوم اسلامیہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

”ترکوں کے خلاف مستشرقین نے جو علمی مہم چلائی ہے، اس مقالہ سے اس کا اندازہ ہوگا۔“

مستشرقین نے اسلام اور مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کو براہ راست مجروح کرنے کے ساتھ ہی ساتھ اسلامی دنیا کے اتحاد اور یک جہتی کو کمزور کرنے کے لئے بالواسطہ طریقوں سے بھی کام لیا ہے، اس سلسلے میں انھوں نے ان ترکوں کو آدھار بنانے کی کامیاب کوشش کی، جنھوں نے صدیوں تک اسلام کا جھنڈا بلند رکھا، خانہ کعبہ کے پاس بنے، اسلامی سلطوت کا نشان رہے، اور شوکت اسلامی کے نقیب کے فرائض بھی انجام دیئے، جہاں تک ترکوں کی قدیم تاریخ کا تعلق ہے، وہ ماضی کے پردے میں چھپی ہوئی ہے، چینی ماخذوں کی رو سے ترکوں کا وجود سن ۳۱۲ ق م تک ملتا ہے، دوسری صدی قبل مسیح میں ان کے مختلف قبیلے چین کی شمالی سرحد پر لوٹ مار کیا کرتے تھے، لیکن چھٹی صدی عیسوی میں ان کا دائرہ اتنا وسیع ہوا کہ مشرقی اور وسطی ایشیا ان کی تنگ و دو کے میدان بن گئے، اسی صدی میں ترکوں نے ایک طاقتور سلطنت بھی قائم کر لی تھی جو منگولیا اور چین کی شمالی سرحد سے لے کر بحر اسود تک پھیلی ہوئی تھی، لیکن ان کے مختلف قبائل وقتاً فوقتاً مغربی ایشیا اور مشرقی یورپ کی آبادیوں پر بھی حملہ کرتے رہے، ان قبائل میں کسی طرح کا قومی یا نسلی احساس موجود نہ تھا، اور نہ ان کی کوئی مشترک زبان تھی، ترکی زبان کے ساتھ ہی ساتھ یورپی ایرانی اور منگولی زبانیں بھی ان کے جہگوں میں بولی جاتی تھیں، ان کا ابتدائی مسلک آسمان پرستی یا آتش پرستی تھا، لیکن رفتہ رفتہ انھوں نے سامانیت، بدھ مت اور عیسائیت کو اپنایا لیکن آخر میں انھوں نے مذہب اسلام اختیار کیا۔ اسلام کے حلقہ بگوش ہونے اور مسلم علاقوں میں ہجرت کرنے کی وجہ سے ترکوں نے اپنی مادری زبان میں تبدیلی کی اور اپنے مخصوص قدیم رسم الخط کو تبدیل کر کے عربی رسم الخط اپنایا، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اپنے تمدن، معاشرت، سماج، اخلاق، ادب اور زبان پر اسلامی تہذیب و تمدن کا بہت گہرا اثر پڑا۔ اور جب خود ان کی حکومتیں ایشیا اور یورپ میں قائم ہوئیں تو یہ قوم اسلامی شوکت و طاقت کی غلبہ دار بن گئی، اور ان علاقوں میں اسلامی تمدن کے بیج ہی نہیں بوئے

بلکہ ان علاقوں کو پوری طرح اسلامی رنگ میں رنگ دیا، جہاں مسلمان ہزار کوششوں کے باوجود اپنے قدم نہیں جما پائے تھے، اس وقت ترک نام ہی ہیبت پیدا کر دینے کے لئے کافی تھا، اور انہیں شکست دینا یا ان کی قوت کو تباہ کرنا ایک ناممکن امر سمجھا جاتا تھا، اسی ہیبت کی وجہ سے فتح قسطنطنیہ کے تقریباً دو سو سال کے بعد بھی ایک فرانسیسی مصنف (Guillett) نے ۱۶۸۱ء میں اپنی کتاب میں لکھا تھا کہ ہر عیسائی کو ہمیشہ یہ دعا کرتے رہنا چاہئے کہ خدا پھر کوئی سلطان محمد ثانی نہ پیدا کرے، جس نے قسطنطنیہ کو فتح کر کے سلطان فاتح کا لقب پایا تھا، اس وقت ترکوں کے فتح و ظفر کا سیلاب آگے بڑھتا گیا، یہاں تک کہ اس نے اسٹریا کو تاخت و تاراج کر دیا اور اس طرح اگر ایک طرف اندلس مسلمانوں کے قبضہ سے نکلا تو دوسری طرف اس زمانہ میں ترکوں نے اپنی فتوحات سے اسکا بخوبی تلافی کر دینے کے بعد ترک یعنی یورپ کا نیا دشمن دینا کے دروازوں بحیرہ ادقیانوس اور بحیرہ اسود کے شمالی سواحل تک پہنچ گیا، اور فتح مصر کے بعد ترکوں کے کلاہ تفتان میں خادم اکرمین الشریفین کا طرہ امتیاز بھی لگ گیا۔

ترکوں نے اپنی قومیت کی طرف سے ہمیشہ بیگانگی برتی تھی، وہ اپنے آپ کو مسلمان قوم تصور کرتے تھے، مستشرقین نے اسی رنگ کو مضبوطی سے پکڑا اور اسلامی اتحاد کو ضرب لگانے کی غرض سے ترکوں کو ان کی اصل قومیت کا احساس دلا دیا۔ لگ گئے جس کا دار و مدار نسل اور مادری زبان پر ہے۔ اس کی تکمیل کی غرض سے ایک فرانسیسی مستشرق GOSSEPH De Guignies نے آٹھویں صدی کے وسط میں ایک ذہنی خاکہ بنایا اور اسکی شکل دینے کے لئے ترکوں کی قدیم تاریخ لکھی، اور ان کے ان کارناموں کو شاندار الفاظ میں پیش کیا جو ترکوں نے اسلام قبول کرنے سے پہلے انجام دیئے تھے، اس مستشرق کی یہ کتاب علمی اور تحقیقی ضرورت ہے، لیکن اس نے قدیم غیر اسلامی ترکی تہذیب کے احیاء کی دعوت اس لئے دی کہ ترکوں کے اسلامی معاشرہ میں انتشار پیدا ہوا، اس کا مقصد ترکوں کا تعلق غیر مسلم ترکوں سے قائم کرنا تھا، اور ان کو یہ بتانا تھا، کہ وہ صرف مسلمان نہیں ہیں بلکہ ترک بھی ہیں، یا یوں کہئے کہ وہ ترک پہلے ہیں اور مسلمان بعد میں اور ان کا غیر اسلامی دور بہت شاندار رہا ہے، اسی مقصد کے حصول کے لئے جو سف دان ہمر، ڈیمیری، رادولف اور جاہون نے اپنی تصانیف کے ذریعہ کوشش کی، ہو درتھ، سرجیس ولیم ریڈ ہاؤس اور ایاس ہون وکنس گیب کی تصانیف بھی اسی سلسلے کی کرطیاں ہیں، اسی نقطہ نظر سے ارتھمر ملی ڈیوڈس نے بھی اپنی کتاب *A grammar of the Turkian Language* لکھی جو ۱۸۳۲ء میں لندن سے شائع ہوئی، یوں تو ڈیوڈس کی کتاب



ترکی قواعد سے متعلق ہے، لیکن مصنف نے اس کتاب میں ایک طویل مقدمہ بھی شامل کیا ہے جس میں ترکوں کی قدیم ترین تاریخ کو بہت نمایاں انداز سے پیش کیا گیا ہے، اور ان کے کارناموں کو خود ترکوں کو بتانے کی کوشش کی گئی ہے، ترک ابھی تک اپنی تاریخ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شروع کرتے تھے، اور خلفائے راشدینؓ بنو امیہ اور عباسی دور کو اپنی ہی تاریخ کے ابواب تصور کرتے تھے، لیکن مستشرقین نے یہ کوشش کی کہ ترک اپنی قدیم تاریخ اور اسلام سے پہلے کی داستان سُکر خوش ہوں اور ان میں اس پر فخر کرنے کا شوق پیدا ہو، تاکہ رفتہ رفتہ مذہبی احساس اور اسلامی اخوت کے بدلے ان میں نسلی تاثرات فروغ پا جائیں اور اسلامی اتحاد کو ضرب لگے اور ترکوں کی قومیت کا دار و مدار مذہب کے بجائے ترکی نسل پر قائم ہو جائے، ان مستشرقین کا اصل مقصد ترکوں کے اسلامی ذہن کو بدلنا، اسلامی وحدت کو پارہ پارہ کرنا اور اسلامی تہذیب کو نقصان پہنچانا تھا، ان کو اس مقصد میں خاطر خواہ کامیابی حاصل ہوئی اور ان کی تحریروں سے متاثر ہو کر ترکوں کا ایک حلقہ ان کا ہمنوا بن گیا یہ حلقہ ان ہی مستشرقین کے زیر اثر برابر فروغ پاتا رہا، ان کے مستقل داعی پیدا ہوتے گئے، اور ان ہی کے ترک شاگردوں میں سے مصطفیٰ جلال الدین پاشا، احمد جودت پاشا، شمس الدین شامی، احمد مدحت، نجیب عام، بورصالی طاہر، احمد علی سلیمان پاشا، محمد مراد، علی توفیق جیسے مصنفین ایک ذہنی انقلاب برپا کرنے میں لگ گئے، اس انقلاب کا رخ ترکوں کے فلسفی ضیاء گوک آلپ نے باضابطہ ترکیت کی طرف موڑا جس کی وجہ سے ترکوں کا لگاؤ اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن سے کسی حد تک کم ہوا، اور مصطفیٰ کمال اتاترک نے اپنے اصلاحی کارناموں کے ذریعہ سے ترکوں کا تعلق صرف مذہب اسلام اور اسلامی تہذیب و تمدن ہی سے نہیں بلکہ ان کا رشتہ اسلامی دنیا سے بھی منقطع کرنے کی کوشش کی، مستشرقین کا بنیادی مقصد بھی یہی تھا، چنانچہ مغرب میں اتاترک کے ان کارناموں کا زور شور سے چرچا کیا گیا اور یہ ظاہر کیا گیا کہ ترکی میں انقلاب برپا ہو گیا ہے اور ترکوں نے اپنا رشتہ اسلام سے بالکل منقطع کر لیا ہے، اس خیال کی اشاعت ٹوائسن بی، کرک ووڈ، ورتھم، مہتری این آرم اسٹرونگ، ہیری لیوک وغیرہ جیسے مصنفوں نے کی، ان نامور مصنفوں نے اتاترک کی سیاسی، اور قومی خدمات کے ساتھ ہی ساتھ اس کی بے دینی اور اس کی بے اعتدالی اور اس کی نا عاقبت اندیشی کو اس کا کارنامہ قرار دیا تھا، یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے، ان مصنفوں نے مسلمان ترکوں کی تاریخ لکھتے وقت تعصب سے کام لیکر غلطی بددیانتی کا ثبوت دیا ہے، اور زہراؤد خیالات کا اظہار کیا ہے، ان مستشرقین کو ترکوں سے سخت دشمنی تھی، ان کی تحریریں کینہ پروری سے پُر ہیں، ان بیشتر تحریروں میں تسلیفی مشن کی روح کار فرما ہے، مگر جب مصطفیٰ کمال اتاترک نے خود مستشرقین کے مقاصد کی تکمیل کر دی تو اس کی شان میں تہذیب و

پڑھنا ان کا اخلاقی فخر بن گیا اور سب نے اپنی اپنی بساط کے مطابق اس کی تشریح کی، اس کو سرفروش مجاہد، پر جوش  
 فدائی وطن و ملت، قابل ترین سیاست دان، قوم کا مصداق، ملک و ملت کی تعمیر کے لئے دلا دلا کر مجاہد، مجاہد آزادی  
 کا عاشق، مجاہد اعظم، شہید، شہداء، دل و دماغ اور روح تک کو آزاد کرانے والا انسان اور عظیم الشان جذبات  
 کا نورانی پسیر کہا گیا اور ان کی کتابوں کی کتابیں ہم ہندوستانیوں کی معلومات کا مافذ بھی بنیں، اس لئے واقعات کی حقیقی  
 نوعیت اور صحیح صورت حال پر روشنی پڑی، اور نہ ہی عام انداز غیر سرکاری ترکوں کا نقطہ نظر پوری وضاحت  
 سے ہمارے سامنے آسکا، غالباً اسی وجہ سے ہندوستان میں مصطفیٰ کمال انا ترک سے ایک طرح کی خوش عقیدگی پائی  
 گئی اور دینی حلقوں میں بھی اس پر تنقید گوارا نہیں کی گئی اور اس کے سیاسی اور قومی خدمات کی وجہ سے دین کے خلاف  
 اس کے اقدامات کو بھی نظر انداز کر دیا گیا، اس لئے اب اس کی بھی ضرورت ہے کہ ہمارے یہاں ایسا بھی علمی اور تحقیقی کام  
 ہو جس سے مصطفیٰ کمال انا ترک کی اصلاحات کے ساتھ ہی ساتھ اسلام سے ترکوں کی وفاداری کی تصویر بھی سامنے آجائے  
 اور اس فرق کی وضاحت بھی ہو جائے جو حکومت کے مختصر و محدود طبقے اور مسلمان ترک عوام کے درمیان پہلے بھی تھا، اور  
 آج بھی موجود ہے۔

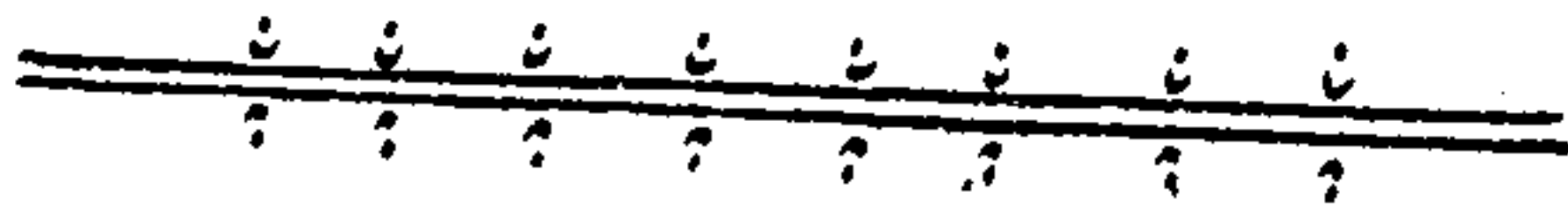
یورپی ممالک کو ترکوں سے سخت عداوتی چہنچہ مغربی اہل قلم حضرات نے بھی ترکوں کی تاریخ لکھتے وقت تعصب  
 سے کام لیا ہے، اور ترکوں کے مذہب یعنی اسلام پر طعنہ زنی اور دیوانہ دار اعتراضات کئے ہیں، اس وقت ان کی تمام  
 تصنیفات و تالیفات پر تبصرہ کرنا مشکل ہے، تاہم چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں، ایورسلی نے اپنی کتاب دی، ٹرکس اپارٹ  
 میں عثمانی سلطان بایزید یلدرم (۱۳۸۹ء - ۱۴۰۲ء) کے حالات زندگی (ص ۲۸) لکھتے وقت ایک ترکی کہاوت  
 یا مقولہ کو قرآن کریم کی آیت قرار دے کر اسلام کا دشمن ہونے کا ثبوت پیش کیا ہے، اصل واقعہ یہ ہے کہ امیر کرمانیہ علاء الدین  
 مغربی ایشیا کے ترکوں کی سرداری کا خواہشمند تھا، اس لئے عثمانیوں سے اس کی عداوت تھی، وہ دولت عثمانیہ کو نقصان  
 پہنچانے کی برابر کوشش کرتا رہا، اور متعدد بار عثمانی علاقوں پر حملے کئے، جن میں سخت مقابلے بھی ہوئے، ایک مقابلہ میں  
 علاء الدین نے سلطان بایزید یلدرم کے سالار عسکر تیمور تاش کو گرفتار بھی کر لیا، یہ خبر سن کر یلدرم نے کرمانیوں پر حملہ کیا  
 اور ان کو شکست دے کر اپنے سالار عسکر کو آزاد ہی نہیں کر لیا بلکہ علاء الدین اور اس کے دو لڑکوں کو گرفتار بھی کر لیا سلطان  
 نے ان تینوں کو تیمور تاش کی حسرت میں دے دیا، مگر اس نے بایزید یلدرم کی اجازت کے بغیر ہی تینوں کو پھانسی دیدی

یلدرم یہ سکر بہت برہم ہوا اور رنجیدہ بھی، مگر وہ اس ترکی کہاوت یا مقولہ کو یاد کر کے خاموش ہو گیا کہ "ایک امیر کی موت اتنی بری نہیں ہے جتنا ایک صوبے کا نقصان"۔ ہمارے مستشرق ایورسلی نے اس ترکی کہاوت یا مقولہ کو قرآن کریم کی ایک آیت قرار دیتے ہوئے یہ تحریر فرمایا ہے کہ اس آیت کے بموجب یلدرم نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ کرمانیہ کی پوری ریاست پر قبضہ کر کے اسے عثمانی سلطنت میں شامل کر لیا جائے، یہ سفید جھوٹ قرآن کریم کی بے حرمتی اور اسلام سے دشمنی ہی کی وجہ سے تحریر کیا گیا ہے اسی طرح ایورسلی ایک جگہ اور لکھتا ہے کہ مغربی ایشیا کے عیسائی ترکوں سے ڈر کر اسلام لائے تھے۔ اور ان کے اور ترکوں کے درمیان شادی بیاہ کے تعلقات قائم ہو گئے اور دونوں کے میل سے ایک نئی نسل تیار ہونے لگی، جو دوسری ریاستوں کے باشندوں سے بہت کچھ مختلف تھی اور اپنے کو "عثمانی" کہتی تھی، اس بیان سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ صرف ایشیا کے پرانے عیسائی یعنی نو مسلم اور مسلمان ترکوں کے درمیان شادیوں کے نتیجے میں جو اولادیں ہوئیں وہ "عثمانی" کہلاتی تھیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو عثمانی کا باشندہ تھا، عثمانی کہلاتا تھا، اس میں نسل، مذہب اور زبان کی تفریق نہیں تھی، اسی طرح اچ۔ اے کبزن نے اپنی کتاب "دی فونڈیشن آف دی ادٹومن اپائز میں یہ تحقیق کسی ثبوت کے بغیر پیش کی ہے کہ عثمانی سلطنت کا پہلا تاجدار یعنی سلطان عثمان اور اس کے تمام ساتھی بہت پرست تھے جو بعد میں مسلمان ہوئے ہیں۔ اس مصنف نے عثمان کی فاتحانہ سرگرمیوں کے متعلق یہ بھی لکھا ہے کہ یہ سلاجقہ، قونیا کے خاتمہ کا نہیں بلکہ اس تبدیلی مذہب ہی کا نتیجہ تھا کہ ۶۸۹ھ (۱۲۹۰ء) کے بعد عثمان کی فاتحانہ سرگرمیاں شروع ہو گئیں جب کہ اس سے قبل صفوت کی زندگی کے پچاس سال ان سرگرمیوں سے خالی تھے۔ اس نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ "عثمانی اسلام سے وابستہ ہیں۔ اور ان میں تبلیغی جوش ہے۔ یہ لوگ یونانیوں یعنی بازنطینیوں نے اور تاناریوں دونوں کے یکساں دشمن ہیں" مستشرقین نے سلطان عثمان کی ہمت، شجاعت اور اور اس کے عدل و انصاف کی خوب خوب تعریف کی ہے لیکن اس کے دامن پر خون کے دھبے بھی یہ کہہ کر لگا دینے کی کوشش کی ہے کہ اس نے اپنے ایک بے گناہ بڑھے چچا کو قتل کر دیا تھا، جب کہ اس کے شواہد نہیں ملتے ہیں۔ اس سے کسی کو انکار نہ ہو گا کہ عثمانی ترکوں نے عیسائیوں کے نابالغ بچوں کو اسلامی تعلیمات دیکر اور ترکی زبان سکھا کر ایک ایسی زبردست فوج تیار کر لی تھی جس نے عثمانی فتوحات کی رفتار میں ایک سیلاب کی قوت پیدا کر دی تھی۔ وہ فوج اپنی نوعیت کے اعتبار سے نئی تھی اس لئے نئی چری یعنی نئی فوج کہلاتی۔ اس نئی چری لفظ کی شکل یورپی زبانوں میں کافی بگڑ گئی ہے۔ فارسی اور ہمارے مادری اردو زبان میں بھی غلطی سے "جان نثاری"۔



ہو گیا ہے، بعض عربی کتابوں میں اسے "انکشاری" بھی لکھا گیا ہے۔ اس سلسلے میں صرف یہ بات قابل ذکر ہے کہ نبی چری کی بنیاد سلطان اورخان (۱۳۲۴ء تا ۱۳۵۹ء) کے دور حکومت میں رکھی گئی تھی اور سب سے پہلے ایک ہزار نوجوانوں کی فوج بنائی گئی تھی، مستشرقین نے لکھا ہے کہ سلطان اورخان نے ان تمام نوجوانوں کو جمع کیا اور اور حاجی بکتاش ولی نامی صوفی بزرگ کے سامنے پیش کیا جنہوں نے اس نئی فوج کی کامیابی کی دعادی یہ واقعہ سر اسر غلط ہے۔ کیونکہ حاجی بکتاش ولی نامی بزرگ سلطان عثمان کے دور میں تھے۔ اور تیرہویں صدی کے آخر میں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ اور سلطان اورخان کے زمانہ میں ان کا وجود نہ تھا۔ میرے خیال سے "نبی چری" کو حاجی بکتاش ولی جیسے نامی صوفی سے منسوب کر دینے سے مستشرقین کا مقصد یہ ثابت کرنا رہا ہو گا کہ مسلمانوں کے صوفیوں نے بھی اسلام کو تلوار سے پھیلانے میں مدد دی ہے۔ اسی طرح مستشرقین نے سلطان عثمان کے جانشینوں کے محاسن کا اعتراف بہت کم کیا ہے۔ اور ان کی سنگ دلی اور نقص عہد کے متعدد جھوٹے واقعات بیان کئے ہیں۔ سلطان محمد نے قسطنطنیہ کی فتح کے روز جس رحمدلی اور رقیق القلبی کا ثبوت دیا ہے۔ اس کی مثال اس کے کسی ہم عصر نے پیش نہ کی۔ اس کے باوجود مستشرقین نے لکھا ہے کہ سلطان اور اس کے سپاہیوں نے بہت سے مظالم کئے اور یونانیوں کی پوری جماعت پر نہایت سخت مصیبت ٹوٹ پڑی ان ہی مستشرقین نے سلطان محمد فاتح کو دل کھول کر برا بھلا کہا ہے اور اس کو بدکار اور نفس پرست تک بتا کرنے کی کوشش کی ہے، اس سلسلے میں ڈیوک نوٹار اس اور اس کے لڑکوں کے قتل کا واقعہ بیان کیا جاتا ہے اور اس کا یہ سبب بتایا گیا ہے کہ ڈیوک نوٹار اس نے اپنے لڑکوں کو سلطان محمد فاتح کی غلوت عیش میں بھیجنے سے انکار کر دیا تھا، جب کہ یہ قتل اس سازش کا نتیجہ تھا۔ جو ڈیوک نوٹار اس قسطنطنیہ کو ترکوں سے آزاد کرنے کے لئے اٹلی سے کر رہا تھا۔ اسی طرح سر جارج لارینٹ نے اپنی کتاب "ترکی میں اسلام سے متعلق یہ بیان دیا ہے کہ وہ علم کی روشنی پھیلانے کا مخالف تھا۔ اور عثمانی ترکوں کی نسبت یہ کہا ہے کہ یہ قوم منظم جہالت کی دلدادہ تھی۔ اسی طرح کے بہت سے بیانات مستشرقین نے اسلام اور مسلمان ترکوں سے متعلق اپنی کتابوں میں درج کئے ہیں۔ اور حق اور سچائی کے بجائے تعصب اور تنگ نظری سے کام لیا ہے، انہوں نے ترکوں کی تاریخ لکھنے میں جس تعصب کا مظاہرہ کیا ہے اس کا اعتراف اب چند یورپین اسکالرز نے کرنے لگے ہیں

ابھی رسالہ اسلام اور عصر جدید کی جلد ۱۲۔ شماره ۱۵۱ ادا بت جنوری ۱۹۸۲ء میں پروفیسر ضیاء الحسن فاروقی صاحب نے برنارڈ لونس کے ایک اس مقالہ کا ترجمہ شایع کیا ہے۔ جس کا عنوان "اسلام ہے۔ یہ مقالہ جس کا انگریزی سے اردو ترجمہ جناب نذیر الدین مینائی صاحب نے کیا ہے۔ کافی پہلے کا لکھا ہوا ہے۔ مگر بہت کم حضرات کی نظروں سے گزرا ہوگا۔ اس مقالہ میں برنارڈ لونس نے خود اقرار کیا ہے کہ "یورپ میں لکھی گئی اسلامی تہذیب و تمدن سے متعلق کیا ہیں زیادہ تر ایسے حضرات نے لکھی ہیں جو اصل ماخذ کی زبان سے ناواقف تھے۔" اسی مقالے میں برنارڈ لونس نے عثمان ترکوں کے متعلق تحریر کیا ہے کہ "یورپ میں مسلمانوں کی فتوحات میں دور رس اثرات کے اعتبار سے عثمانی ترکوں کی فتوحات کو بہت اہمیت حاصل ہے عثمانی ترکوں کے حملوں اور فتوحات کا آغاز چودھویں صدی عیسوی سے ہوتا ہے، عثمانی فتوحات نے یورپ کے بڑے حصے کو یونان، بلقان، ہنگری اور پولینڈ تک اسلامی حکومت کے زیر نگیں کر لیا۔" برنارڈ لونس مزید لکھتے ہیں کہ "یورپی تاریخ کی زیادہ تر کتابیں ان ممالک میں عثمانی حکومت اور اس کے اثرات کو مسخ کر کے پیش کرتی ہیں۔ یہ کتابیں خالصتاً مغربی شواہد پر مبنی ہیں۔ جو زیادہ تر ناقص گھڑی ہوئی اور غیر معتبر ہیں۔ ان کتابوں میں تاریخ یورپ میں ترکوں کے رول کی افسوسناک حد تک گمراہ کن تعبیر ملتی ہے۔ برنارڈ لونس کے اس بیان سے بھی اس امر کی تصدیق ہو جاتی ہے کہ مستشرقین کی "معتبر" کتابیں کتنی غیر معتبر ہیں اس لئے اب مسلمان اہل قلم حضرات کو خود اپنی مذہبی، علمی، تہذیبی اور ادبی تاریخ نہ صرف اپنی مادری زبان میں بلکہ یورپین زبانوں میں بھی لکھنی چاہئے۔ تاکہ مستشرقین کے تخریبی اور تشکیکی اثرات کو رد کیا جاسکے اور مستند و صحیح مندرجہ معلومات اور نقطہ نظر اصل ماخذ کی بنیاد پر پیش کیا جاسکے۔"



بھی ظاہر کیا

رجب وہ پوری نہیں

# مستشرقین کی خدمات

اور

## ان کے حدود

ان

جناب سید وحید الدین صاحب ہمدرد نگر، نئی دہلی

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ مغربی عالموں نے علوم اسلامی کی بہت بڑی خدمت انجام دی ہے، بہت سے مخطوطات جو دور دراز کتب خانوں میں پوشیدہ تھے، ان کا سراغ لگایا، سائنٹفک طریقے سے ان کو ایڈٹ کیا اور دنیائے اسلام سے انکو روشناس کرایا، آج بھی مسلمان علماء نے اس سلسلے میں کچھ کام کیا، کیا اعتبار مقرر، کیا باعتبار معیار ان کا مجموعی طور پر مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ ہر عالم جب کسی دوسری تہذیب کا مطالعہ کرتا ہے تو وہ ان روایات اور تعصبات سے اپنے کو منزہ نہیں کر سکتا جن میں اس کی پرورش ہوئی ہے۔ اس طرح ہر تہذیب کا علمبردار اپنے ساتھ اپنی ہی تہذیب کا بوجھ اٹھائے رکھتا ہے، اور اپنی ہی روایات کی روشنی میں دوسری تہذیب کو جانچنے اور اس پر حکم لگانے کی کوشش کرتا ہے۔ مستشرقین کا اسلام کے ساتھ معاملہ اپنی خاص نوعیت رکھتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ مستشرقین عام طور پر یا تو یہودی نسل رہے ہیں یا پھر عیسائی سے وابستہ رہے ہیں۔ صلیبی جنگوں نے ایک معاندانہ فضا پیدا کر دی تھی، جس کا اثر اب تک باقی ہے۔ اسلام اور عیسائیت کے تعلقات اس طرح شروع ہوئے ہیں جو اسے ایسے ماحول میں نشوونما



پلتے ہے جو اسلام کی صحیح تفہیم کے لئے بالکل ناسازگار تھا۔ خاص طور پر رسول اللہ کی سیرت کذب و افتراء کا نشانہ بن گئی، یہاں یہ بات بھی واضح ہو جانا چاہئے کہ اسلامی ثقافت کے دوسرے پہلو بھی ہیں۔ جن کا براہ راست مذہب سے تعلق نہیں۔ جیسے فن تعمیر، شعری، مصوری، ادبی، تاریخی، اور سائنسی علوم جیسے ریاضی، ہیئت، بصریات، تاریخ وغیرہ، ان علوم کے بارے میں مستشرقین کا رویہ بڑی حد تک مذہبی تعصبات سے آلودہ نہیں ہوا ہے۔ جرمن مستشرق زخاؤ نے البیرونی کی کتاب الہند کو ایڈٹ کیا البیرونی کی اہمیت کا احساس اسی زمانہ سے دن بدن بڑھتا گیا۔ اسی طرح ابن خلدون کا کارنامہ بہت بڑی حد تک مستشرقین ہی کی کاوشوں سے ہمارے سامنے آیا اور دنیا کو معلوم ہوا کہ تاریخ کے عمرانی شعور کا سرچشمہ اسلامی فکر و نظر میں ملتا ہے۔ اصل مشکل اس وقت اڑتی ہے۔ جب ہم دینیاتی مسائل، قرآن حکیم اور رسول اللہ کی سیرت کا جائزہ لیتے ہیں یہاں پہلے تو اس بات کو دیکھنے کے لئے دل سے اعتراف کر لینا چاہئے کہ مذہبی معالما میں بعض باتیں ایسی ہوتی ہیں جن سے متعلق ہم یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ لوگ بغیر فضل الہی کے ان سے اتفاق کر سکیں۔ لیکن ہم یہ ضرور توقع رکھ سکتے ہیں کہ وہ قیاس آرائیوں اور امکانات کو اپنے حدود میں رکھیں۔ لیکن افسوس یہ ہے کہ مستشرقین نے اکثر ایسا نہیں کیا ہے بلکہ جہاں کوئی امکان سلبی نوعیت کا ہوا اس کو انہوں نے دوسرے امکانات پر غلبہ دے دیا۔

مستشرقین کے اس رویے کی ایک افسوسناک مثال نبی کریمؐ کے واقعہ سے دی جاسکتی ہے جہاں اس واقعہ کے بیان میں تخمیل کو زیادہ جگہ دی گئی ہے۔ یہاں میرا اس واقعہ کی نوعیت یا اہمیت سے بالکل سروکار نہیں ہے۔ یہ تو مورخین کا کام ہے کہ اس کی صحیح طور پر جانچ کریں۔ یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ جہاں رسول اللہؐ کے صحابی سعد بن معاذ کے حکم بنائے جانے کا ذکر ہے۔ وہاں بول و Bulw جیسے مستشرقین نے اس گمان کا اظہار کیا ہے کہ سعد کا فیصلہ رسول اللہؐ کے ایما پر ہوا ہوگا۔ مورخ تاریخ میں امکانات کا لحاظ کئے بغیر آگے نہیں بڑھ سکتا لیکن ایسا امکان جس کا نشانہ ایسی شخصیت ہو جس کے تقدس کے سہارے کروڑوں مسلمان اپنی روحانی نجات کا وسیلہ ڈھونڈتے ہیں۔ انتہائی افسوسناک ہے ایک سے زیادہ مستشرقین نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ پہلے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہودیوں سے بہت سی توقعات وابستہ تھیں۔ اور جب وہ پوری نہیں ہوئیں تو آپ نے قبلہ کا رخ بدل دیا۔

بعض دیانت دار مغربی عالموں نے مستشرقین کے "حدود" کا خود ہی اعتراف کیا ہے۔ اور بڑا ڈبوس نے اپنے ایک مضمون "اسلام" کی ابتدا اس طرح کی ہے۔

"یہ کہا گیا ہے کہ عربوں کی تاریخ یورپ میں خاص طور پر ایسے مورخین نے لکھی۔ جو عربی سے نابلد تھے یا ایسے عربی دانوں نے لکھی جو تاریخ سے نابلد تھے۔ یہ بھی چھپی ہوئی بات نہیں ہے کہ ایسے علوم و فنون کے کوئی فنی صلاحیت کے بغیر عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔ ان فاضلوں کے ہاتھ میں رہے جو متعلقہ علم و فن سے بالکل ناواقف تھے۔ مثال کے طور پر مسلمانوں نے فلسفیانہ فکریں جو خدمت انجام دی ہے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا جاسکا اور سمجھا جانے لگا کہ وہ ارسطو کے صرف نقال اور ناقل رہے ہیں، چونکہ مغربی فلسفہ کی تاریخ میں عیسائی علم کلام کو سب سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں دی جاتی تھی اسلئے مسلمانوں کے تفکر اور ان کے علم کلام کے سلسلہ میں ان کی خدمات کو بھی نظر انداز کر دیا گیا، اور اب یہ آہستہ آہستہ معلوم ہو رہا ہے کہ نہ صرف عیسائی علم کلام مسلمانوں کے تفکر کے بغیر سمجھا جاسکتا ہے۔ بلکہ بعض بنیادی تصورات ایسے بھی مسلمان فلاسفہ نے پیش کئے جن کا اثر فلسفیانہ تفکر پر کافی رہا۔ ابن رشد کے علاوہ ابن طفیل نے جو تعلیم کا خاکہ اپنے فلسفیانہ رومانس حتی بن یقظان میں پیش کیا ہے۔ وہ فلسفہ تعلیم کے مباحث میں اب قابل توجہ بن گیا ہے۔ اور یہ سوال کہ خدا کا تصور کہاں تک رہا ہے۔ اور کہاں تک اکتابی، ایسا سوال ہے جس کی ہدائے بازگشت ہم کو دیکارٹ اور لائبر کے فلسفہ میں ملتی ہے۔ یہی حال تصوف کا ہے۔ ابتدا میں تو مستشرقین تصوف کے ماخذ دوسرے مذہب میں دھونڈتے رہے، کسی نے فنا کے تصور کو بدھ مذہب کے زواں سے جوڑنے کی کوشش کی، اور کسی نے صوفیانہ تصور توحید کو دیدانت سے ملانے کی کوشش کی، لیکن اب مینون کی سرکردگی میں ایک ایسا گروہ پیدا ہوا جو قرآن ہی میں تصوف کی بنیادیں تلاش کرتا ہے۔ اور اس کو خاص اسلامی مظہر قرار دیتا ہے، گوکہ یہ بات بھی واضح ہے کہ تاریخ تصوف میں بہت سی بے راہروی رہی ہے۔ اور یہ کیفیات سے مغلوب صوفیہ کی زبان سے ایسے الفاظ بھی صادر ہوئے جن کو کئی کے معنی سمجھا گیا۔ لیکن ان کی تمام باتوں کے باوجود تصوف کا بنیادی مزاج تسلیم درضار ہے۔ اور قرآن ہی کے تصور احسان کو ایک بنیادی رکن قرار دیا گیا ہے۔

یہاں یہ بات بھی واضح کر دینا ضروری ہے کہ مستشرقین سب ایک طرح کے نہیں رہے، بلکہ بعض ایسے بھی رہے ہیں جنہوں نے راسخ العقیدہ عیسائی ہونے کے باوجود کھلے دل سے اس حقیقت کو نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے کہ عیسائی

روحانیت اور وہ ادب جو عیسائی روحانیت سے متاثر ہے۔ اسلام کے اثرات کو بین طور پر ظاہر کرتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے نمایاں مقام ہسپانوی مستشرق پروفیسر اسین پلاسیوس (ASIN PALACIOS) کا ہے جس نے امام غزالی پر سب سے جامع کتاب لکھی، اگرچہ اس نے اپنی کتاب کا نام کچھ ایسا رکھ لیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ غزالی کا جو شعور تھا، وہ اسلام سے زیادہ عیسائیت کے زیادہ قریب ہے، اس نے غزالی کے صوفیانہ شعور کو مسیحی شعور کی مثال سمجھا لیکن سب سے بڑا نمایاں کام اس نے یہ کیا کہ مغربی ادب اور خاص طور پر دانتے کے شاعرانہ شامہ کار طریقہ سیرمدی میں اسلامی اثرات کا کھوج لگایا جس سے مغرب کے ایک خاص طبقہ میں شدید رد عمل پیدا ہوا اس نے اپنی کتاب.....

ST-JOHN OF THE CROSS AND ISLAM میں اس بات کو پایہ ثبوت کو پہنچا دیا کہ عیسائی زہد اور باطنی زندگی کے علمبردار اس حد تک اسلام سے متاثر ہوئے کہ اس حلقہ کی اصطلاحات میں ہسپانوی صوفی ابن عباد کا اثر ملتا ہے اور یہاں ہم کو خالص صوفیانہ تمثیلات ملتی ہیں، بہر صورت ان کی تصانیف اور ان کے بنیادی خیالات سے متعلق ہمارا رد عمل کیسا ہی سلیبی کیوں نہ ہو، ان کی خدمات اتنی عظیم ہیں کہ جن کو تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں، اگر کوئی شخص مسلمان یا غیر مسلم، اسلام کے ادب و مزاج کا جائزہ لینا چاہے تو ان کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔

اب میں ان تحدیدات کا مختصر ذکر کرنا چاہتا ہوں جن سے مغربی انداز فکر بری طرح متاثر ہے، یہاں کوئی تفصیلی جائزہ تو پیش نہیں کیا جاسکتا کیونکہ نہ تو میں مورخ ہوں نہ کوئی اسلامیات کا طالب علم۔ اس لئے میں ایک مختصر تبصرہ ایک اہم کتاب کے بعض مضامین پر پیش کروں گا جس سے مستشرقین کی خدمات اور ان کی تحدیدات دونوں اچھی طرح سامنے آجائیں گی یہ کتاب مشہور جرمن مستشرق رودی پارٹ (RUDI PARET) کی مرتب کردہ ہے اس کا نام القرآن ہے۔ اس میں پارٹ نے ان مضامین کا انتخاب کیا ہے۔ جو قرآن سے متعلق مغرب میں لکھے گئے، زیادہ تر مضامین جرمن زبان میں ہیں، اور بعض انگریزی اور فرانسیسی میں بھی ہیں، یہاں ہم کو اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ پارٹ کا اور ان کے رفقا کا اسلام کے متعلق کیا زاویہ نگاہ ہے، اور کس حد تک یہ مقولہ کہ العالم حجاب الاکبر ان پر صادق آتا ہے۔ اور ساتھ ہی اس میں ایک ایسے مستشرق کا بھی مضمون ہے جس میں اس نے اپنے مذہبی رفقا کے خلاف بڑے موثر انداز میں اپنی آواز بلند کی ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ مغربی تحقیق ابھی تک ان تعصبات سے خود کو آزاد نہیں کر سکی ہے۔ جو رسول خدا کی شخصیت



اور اسلام کی مذہبی بنیادوں کے متعلق ان کو درجہ میں ملے ہیں اس کا ثبوت اس سے بھی ملتے ہے کہ جن غیر مسلم محققین کا جغرافیائی دائرہ اسلام اور عیسائیت کی کشمکش سے باہر ہے ان کی تصانیف کا مزاج بالکل مختلف ہے۔ مثلاً جاپانی عالم ایزوتسو (IZUTSU) نے جو کچھ اسلامی تصوف اور دینیاتی تصورات کے متعلق سپر قلم کیا ہے وہ ان طریقہ ہائے کار سے بالکل ہٹا ہوا ہے جن پر مغربی فکر کا مزین رہی ہے، اس امر کا پروفیسر برنارڈ ڈیلوس نے کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔

”مغربی دینیاتی تعصبات کی آخری نشانیاں اب بھی بعض مغربی فضلا کے پاس ملتی ہیں جو غلی خول اور ڈھے ہوئے حواشی میں ظاہر ہوتی ہیں۔“

پروفیسر پارٹ کی مرتب کردہ کتاب میں جو مضامین جمع کئے گئے ہیں وہ اس کا بین ثبوت ہیں کہ کیوں قرآن ہمیشہ

مغربی نااضل کیلئے ایک کتاب مخنوم کی حیثیت رکھتا رہا ہے۔ پارٹ کا لکھا ہوا آری کے قرآن کے ترجمہ پر تبصرہ

قابل توجہ ہے، آری مسلم روایت کا احترام کرتے ہوئے اس کو ترجمہ کا نام نہیں دیتے بلکہ وہ اسے ایک تعبیر قرار

دیتے ہیں، اور مغربی علماء کی قرآن کو نئے سرے سے ترتیب دینے کی کوششوں کو بہت ناپسند کرتے ہیں۔ آری کے

زردیک گو کہ وحی کا نزول بیک وقت نہیں ہوا لیکن ان چیدہ چیدہ پیامات الہی کو بحیثیت کل کے دیکھنا ہوگا

جب آری نے قرآن کے انگریزی ترجمہ کو تعبیر کا نام دیا تو پارٹ نے اس کو مسلمان دوستوں کی خوشنودی کے حصول

کا وسیلہ قرار دیا ہے۔ یہ جرمن نااضل تسلیم کرتے ہوئے کہ خود ترجمہ کی کوشش ایک مشکوک عمل ہے، خود قرآنی متن کے

متعلق نہایت ہی معاندانہ مشاہدات سے گریز نہیں کرتا۔ قرآن کا کوئی مترجم اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا کہ قرآن اس

معنی میں کتاب نہیں ہے جس معنی میں کتابیں ہمارے کتب خانوں کی زینت بنتی ہیں۔ قرآن نہ صرف ایسی کتاب

ہے جو پڑھی جاتی ہو بلکہ وہ قابل تلاوت و قرأت بھی ہے۔ اور یہ چیز ترجمہ میں نہیں پیدا ہو سکتی، اسی کتاب میں بول کا

بھی ایک مضمون قرآنی مماثلتوں اور مقابلتوں (SIMILARITIES AND COMPARISONS) پر ہے

جو بہت قابل توجہ ہے۔ وہ اپنی توجہ خاص طور پر سورہ نور کی آیات پر مرکوز کرتے ہیں۔ وہ یقینی طور پر یہ کہنے سے قاصر

ہیں کہ کیا واقعی یہ آیات روحانی معنویت اور عمق کو ظاہر کرتی ہیں یا نہیں۔ ان کو بس اتنا یقین ہے کہ رسول اللہ

نے عیسائی راہبوں کی صحرائی خلوت گاہوں میں جو چراغ روشن دیکھے تھے انھوں نے ان پر اتنا گہرا اثر چھوڑا کہ

قرآن میں بطور تشبیہ کے ان کا استعمال کیا گیا، وہ یہ تو ماننا ہے کہ یہاں جو مثال پیش کی گئی ہے۔ وہ قابل توجہ اور اوتھی ہے، لیکن کسی نہ کسی طرح سے اس کی اہمیت گھٹانے کی کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔

اس کتاب کا مرتب ایک ممتاز جرمن عالم ضرور ہے۔ اور اس کا قرآن کا جرمن ترجمہ مستشرقین کے نزدیک بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ وہ تاریخی طرز تحقیق کا بڑا علم بردار ہے حالانکہ اس طریقہ کار پر حال میں مغربی فضلا نے بڑی سخت تنقید کی ہے اور اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ کسی سوسائٹی اور نظام حیات کے اقدار کو نظر انداز کر کے ہم اس تہذیب کے مزاج کو سمجھ نہیں سکتے اور صرف تاریخی کھوج سے ہم صداقت کا پتہ نہیں لگا سکتے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ برسوں کی تحقیق اور کاوش کے بعد پارٹ کس نتیجہ پر پہنچتا ہے۔ اس کے نزدیک اسلامیات سے متعلق مغربی علماء کی تحقیق نے جو نتائج پیش کئے ہیں وہ بنیادی طور پر صحیح اور مغروضی ہیں۔ اور اب اگر کسی تبدیلی کی توقع کی جاسکتی ہے تو اس کی صرف ضمنی حیثیت ہوگی۔ اب ایسے سنسنی خیز نتائج پیش ہونے کی مستقبل میں توقع نہیں کی جاسکتی جن سے پچھلے نتائج کا بطلان ہو سکے۔ ہاں پارٹ کی تحقیق نے ایک سنسنی خیز نتیجہ تو ضرور پیش کیا ہے۔ اس کے انکشاف کے مطابق قرآن نہ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اٹھائے جانے کا قائل ہے۔ بلکہ اس کا بھی کہ ان کی مقدس ماں بھی آسمان پر اٹھالی گئیں اور ساتھ ہی پارٹ کے کہنے کے مطابق رسول اللہ کو یہ بھی یقین تھا کہ ایامِ اواخر میں حضرت مریم کا ظہور ہوگا۔ بعد میں اسی خیال کی تائید میں ایک دوسرے محقق ہیننگ (GLENNING) کا ایک پورا مقالہ دیا گیا ہے۔ یہ معلوم ہونا چاہئے کہ یہ خیال کہ حضرت مریم آسمان پر اٹھالی گئیں۔ کیتھولک کلیسا کا ایک عقیدہ بن گیا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس عجیب سے مفروضہ کی کیا بنیادیں لراہم کی گئی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پارٹ اور ہیننگ دونوں دوستانہ مراسلت کے ذریعہ ایک دوسرے سے فیضیائے ہوئے۔ ان کے دعوے کی بنیاد قرآن حکیم کی یہ آیات ہیں۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا أَنْ

أَرَادَ أَنْ يَهْلِكَ الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ وَفِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ

وَمَا يَتَّبِعُهَا إِلَّا يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۵-۱۷)

اس آیت سے ہیننگ یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم دونوں کو زندہ ٹھہرا دیا گیا۔

اور یہ بھی تصور کیا گیا ہے کہ دونوں عالم سماوی میں زندہ موجود ہیں اور اسی لئے پیغمبر اسلام حضرت مریم کی اس عالم سماوی میں جسمانی منتقلی کے قائل تھے۔ اس عقیدے میں ہیننگ کو مشرقی کلیسا کے عقیدے کی جھلک نظر آتی ہے ان کو یہ بات قابل لحاظ معلوم ہوتی ہے، کہ حضرت مریم کا ذکر حضرت مسیح علیہ السلام کے ساتھ ساتھ کیا گیا۔ اور یہ صرف اس لئے ہوا ہے کہ پیغمبر اسلام نہ صرف حضرت مسیح بلکہ حضرت مریم کی بھی عالم سماوی میں جسمانی منتقلی کو تسلیم کرتے ہیں، ہمارے فاضل محقق رقم طراز ہیں۔ شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ پہلے حضرت مسیح کو ابن مریم کہا گیا یا شاید حضرت مسیح کے تسلسل حیات کا خیال ان کے ذہن میں حضرت مریم کے تسلسل حیات کے تصور کا محرک بنا۔ ان دو امکانات میں وہ دوسرے امکان کو ترجیح دیتے ہیں اور اس کا فیصلہ کن ثبوت وہ اس میں دیکھتے ہیں کہ پیغمبر اسلام نے مشرقی کلیسا سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اس سارے نظریہ کا مقصد یہ بتانا ہے کہ کس طرح عیسائی اثر قرآنی تصورات میں عمل پیرا رہا۔ حالانکہ یہ سادھی توجیہ تو یہ ہے کہ یہاں قرآن کے پیش نظر حضرت مسیح کی اور حضرت مریم کی مخصوص حیثیت ہے۔ بلکہ اس کا اصرار تو صرف قدرت الہی پر ہے جو کسی ارضی مخلوق کے متعلق کوئی استشارہ انہیں رکھتی، خواہ اس کا مقام کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو۔ جب قرآن حضرت مسیح اور ان کی ماں کا ذکر کرتا ہے تو ان کا ذکر تمام ارضی مخلوقات کے ساتھ کرتا ہے، یہاں اس کا تعلق ان کے تقدس سے کچھ نہیں ہے طرفہ تماشایہ ہے کہ اس آیت کو جس میں عیسائی تصور مسیح کے خلاف سختی سے آواز اٹھائی گئی ہے، تو مردہ گریسی دینیاتی تصورات میں منتقل کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ بہر حال پیغمبر اسلام سے ایسے عقیدے کو منسوب کرنا جو ان کے ماننے والوں کے لئے بالکل اجنبیت رکھتا ہے سائنسی تحقیق کے مطالبات کے بالکل منافی ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ خود پروفیسر پارٹ یعنی اس کتاب کے فاضل مرتب رسول اللہ کی سیرت کے متعلق کیا کہتے ہیں ان کے مقالہ کی بحث اس سے ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت قرآن کی روشنی میں کس طرح نمودار ہوتی ہے اور ہم رسول اللہ کی زندگی کے متعلق قرآن سے کیا مواد حاصل کر سکتے ہیں۔ پارٹ کے کہنے کے مطابق سب سے پہلے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ بہت ہی حتمی انداز میں آدمی تھے کیونکہ انہوں نے اپنی تمام فتوحات کا اپنے آپ کو ذمہ دار قرار نہیں دیا۔ بلکہ انکا محض سے ان کو تائید الہی سے منسوب کیا یہاں تک کہ مکہ کی فتح کے لئے کہا گیا ہے، فتح کے معنی میں نہیں ہے۔ بلکہ اس کا مطلب "فیصلہ" ہے، دوسرے



الفاظ میں اس کامیابی کا سہرا رسول اللہ اپنے یا اپنی جماعت کے سر نہیں لیتے بلکہ خدا کی عظمت اور قدرت کا سہرا لیتے ہیں۔ لیکن ایک پیغمبر تو پیغمبر ہر مسلمان آج بھی جب وہ کچھ کامیابی حاصل کرتا ہے اور اس کی توقع پوری ہوتی ہے خواہ اس کی سطح کچھ بھی کیوں نہ ہو، مادی یا روحانی، خدا کا شکر "الحمد للہ کے ساتھ بجا لاتا ہے اور اپنی ذات کی نفی کرتے ہوئے فضل الہی میں اپنی کامیابی ڈھونڈتا ہے۔ یہاں انکساری کا کوئی سوال نہیں بلکہ اس چیز کو وہ حقیقت جانتا ہے۔ اور یہی اس کا ایمان ہے۔ اس کی انکساری اس ایمان ہی کا ایک جزو ہے۔ رسول کے ضمن میں انکساری کا بیان مذہبی اقدار کے شعور کی طرف سے بے حسنی کی علامت ہے۔

پارٹ اپنے بہت سے رفقاء کے ساتھ جو طریقہ کار اختیار کرتا ہے۔ اس میں وہ تاریخی طریقہ کار کے ساتھ ساتھ نفسیاتی تعبیر بھی شامل کرتا ہے۔ وہ ان واقعات میں جو قرآن میں پچھلے پیغمبروں کے متعلق بیان کئے گئے ہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تجربہ کا عکس دیکھتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں وہ ابتدائی تاریخ میں صورت حاضرہ کو پاتا ہے۔ یعنی اگر قرآن میں پچھلے پیغمبروں کے متعلق سوسائٹی کے اونچے طبقے دلائل کی مختصمت کا ذکر ہے تو وہ اس سے نتیجہ نکالتا ہے کہ رسول اللہ بھی اس قسم کی مختصمت سے دوچار رہے ہونگے اور اس بات کی تائید ان کے سوانح نگاروں سے ہوتی ہے، اس سے ہمارا ذہل مصنف ایک بہت دلچسپ انکشاف کا سہرا اپنے سر لیتا ہے۔ یعنی جہاں حضرت شعیب کی مخالفت ہوئی تو مخالفوں نے کہا: شعیب ہم کچھ نہیں سمجھتے جو تم کہہ رہے ہو۔ تمہارا تعلق ہم میں کے کمزور لوگوں سے ہے۔ اگر ہم کو تمہارے تینے کا خیال نہ ہوتا تو ہم تم پر پتھر پھینکتے کیونکہ تم ہمارے مقابلہ میں طاقتور نہیں ہو۔ قالوا ایشعیب ما نفقہ کثیرا مما تقول وانا لندراک فینا ضعیفا وکولنا من هطک لرجحناک وما انت علینا بعزیزہ (ہود ۱۱، ۹۱)

اب پروفیسر پارٹ کے خیال میں یہاں پتھر پھینکنے سے مطلب انکساری نہیں ہے جیسا کہ انجیل کے قصوں میں وارد ہوا ہے بلکہ دھکی ہے۔ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی گئی ہوگی کہ اگر وہ اپنی دعوت کو یونہی چلاتے رہے تو ان پر پتھر پھینکے جائیں گے۔ یہ واقعہ کہ کوئی دھکی انہیں دی گئی ہوگی کسی دوسرے ذریعہ سے نہیں معلوم ہوتا سوائے ان قصوں کے جو دوسرے پیغمبروں کے متعلق بیان کئے گئے ہیں۔ ہم کو پروفیسر پارٹ کی خیالی آرائی سے کچھ بحث نہیں بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ پتھر رسول اللہ کی ذات پر آج بھی پھینکے جاتے ہیں۔ لیکن وہ عرب

کے قدیم صحرا کے گلی کوچوں سے نہیں بلکہ بیسویں صدی کے یورپ کی دانشگاہوں کے مستند مراکز اور رسول اللہ کی مذہبیت پارٹ کی دلچسپی کا اصل موضوع نہیں بنتا یہ بتانا کہ وہ ایک آدمی تھے اور ان میں وہ تمام کمزوریاں موجود تھیں جو ایک آدمی میں ہوتی ہیں۔ پیغمبر بھی ایسے واقعات سے دوچار ہوئے کہ ان پر ناگامی و محرومی کا غلبہ ہوا۔ حزن و ملال بھی ان پر چھا گیا۔ لیکن اس سے کیا ہوتا ہے۔ کیا کسی غیر یقینی حالت نے ان کو اپنے راستے سے برگشتہ کیا۔ انھوں نے کبھی خدا ہونے کا دعویٰ نہیں کیا۔ لیکن وہ ہم جیسے انسان ہونے کے باوجود بھی ہم سے الگ تھے۔ ایسے انسان جن کی مثال کی تکرار نہیں ہو سکتی اور اس سے زیادہ گہرے معنوں میں جس معنی میں کسی فرد کی بھی تکرار نہیں ہو سکتی۔ ہم اپنے سارے فضل و ناموری کے باوجود کسی فرد میں وہ پروردگار اور محبت پیدا نہیں کر سکتے جو انھوں نے نہ صرف اپنے معاصرین میں پیدا کی، بلکہ آج بھی بے شمار لوگوں کے دلوں پر ان کی حکومت ایسی ہے کہ چودہ سو سال کے بعد بھی ان کے لئے وہ جان کی بازی لگانے کیلئے تیار ہیں اور انھوں نے وہ مقام حاصل کر لیا ہے۔ جس کو نہ کسی تلوار اور نہ کسی کا قلم مٹا سکتا ہے۔ اور جس کے نام کے طفیل ہر دور میں دالہانہ شاعری اور وجد آفرین تصوف کے بہترین نمونے دیکھنے میں آئے۔

لیکن پارٹ کی مرتب کی ہوئی اسی کتاب میں ایک مضمون دکھایا گیا ہے جس نے بڑی سختی سے ان تمام کوششوں کی مذمت کی ہے۔ جو رسول اللہ کے کردار اور شخصیت کو مسخ کرنے کے سلسلے میں کی جاتی ہیں، اس مضمون کا اصل کے کہنے کے مطابق مستشرقین جزئیات میں اس طرح پھنس گئے ہیں اور قرآن و اسلام کی خصوصیت کا سراغ و تاریخ میں تلاش کرنے میں اس قدر سرگرداں ہو گئے ہیں کہ رسول اللہ کی تخلیقی شخصیت تک ان کی رسائی نہ ہو سکی۔ اس کے یہ الفاظ قابل غور ہیں: کبھی بھی عقلی علوم کے ذریعے اس شخصیت کے اسرار کو بے نقاب کرنا ممکن نہ ہو سکے گا۔ اور کبھی بھی ہم اپنی جانچ اور تحقیق کے ذریعے یہ پتہ چلانے کے قابل نہ ہو سکیں گے کہ وہ کیا واردات تھے۔ جنہوں نے ان کی روح کو متاثر کیا یہاں تک کہ انھوں نے اپنے ضمیر کی حیران مآشوں سے گذر کر اپنے کو خدا کی طرف سے منتخب کردہ ایک نذیر اور رسول قرار دیا۔ اس کے مطابق اگر ہم اس حقیقت کو مان لیں تو یہ سوال کہ رسول اللہ کے پیش نظر کیا نمونے اور تاریخ کے کون سے ماخذ تھے، جن سے انھوں نے استفادہ کیا، غیر اہم سوال بن جاتا ہے۔ یعنی وہ سوالات

جو تاریخ کے مینکانکی تصورات کے لئے بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ اپنی معنویت کھودیتے ہیں۔

پھر یہی مصنف لکھتا ہے کہ عیسائی مناظر اس بات پر متمرکز ہے ہیں کہ مدینہ کا زمانہ باطنی انحطاط کا زمانہ تھا، اور مدینہ میں وہ ابتدائی دلولہ باقی نہیں رہا تھا۔ لیکن اس قسم کا تصور یہ حقیقت نظر انداز کر دیتا ہے کہ سچا مذہب پورے انسان پر حاوی ہوتا ہے۔ اور اس کی تمام قوتوں کو متحرک کرتا ہے۔ یہ سوال کہ کیا رسول اللہ نے مکہ میں بھی سیاسی عمل میں کچھ حصہ لیا ہے۔ لایعنی ہے۔ کیونکہ ان کے لئے مذہبی اور سیاسی سرگرمیوں کا امتیاز کوئی معنی نہیں رکھتا۔ اصل یہ ہے کہ مدینہ میں ان کو وہ سازگار ماحول ملا جہاں وہ اپنی مکہ کی دعوت کو عملی شکل دے سکے اور جو بھی تصویر ہم رسول اللہ کی کھینچیں وہ نامکمل رہے گی۔ اگر ہم ان کی شخصیت کے جادو کو نظر انداز کر دیں یہ ان کی شخصیت ہی کی قوت تھی کہ انھوں نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اپنی طرف کھینچا۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن میں ان کو اسوۂ حسنہ کہا گیا ہے قرآن حکیم تو تفسیروں اور تشریحوں کے ذریعے امت کے سامنے پیش ہوا ہے۔ اور تعبیر و توجیہ کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ لیکن یہ رسول اللہ کا ہی اسوہ ہے جو راہبر اور راہنما کی حیثیت سے ان کے نام لیواؤں کے سامنے آیا ہے۔ جب کبھی بھی اجنبی اثرات کا غلبہ مسلمانوں کے لئے ایک خطرہ بنا تو سنت کی تجدید ان کا نعرہ بنی اور اب بھی مسلمانوں کے تقویٰ اور زہد میں ہم اس تجربہ الہی کی جھلک دیکھتے ہیں جس نے تیرہ سو (چودہ سو برس) برس پہلے عرب کے دور دراز صحرائیں محمد بن عبد اللہ کو مجبور کیا کہ وہ دنیا کے سامنے آئے اور خدا اور اس کے فیصلہ کا پیام دنیا کو سنائے۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مستشرقین کی جماعت ایسی جماعت نہیں ہے جس کے تمام افسر ادرہم یکسانیت کے ساتھ کوئی حکم لگا سکیں۔ خوشی کی بات ہے کہ مغرب کے عالموں کو بھی یہ احساس ہو گیا ہے کہ کسی دین پر مذہبی شعور سے بیگانہ ہو کر حکم نہیں لگایا جاسکتا۔



# منگرمی واٹ کی کتاب

## محمد ایٹ مکہ پر ایک نظر

از

سید صباح الدین عبد الرحمن

ڈبلو منگرمی واٹ نے محمد ایٹ مکہ، محمد ایٹ مدینہ، محمد دی ایٹ مسبین وغیرہ لکھ کر بڑی شہرت حاصل کر لی۔ ان کے مضامین ایسے جرائد میں نکلتے ہیں جو مسلمانوں کی راسخ العقیدگی کے حامل ہیں، انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز نئی دہلی میں قرآن پاک کی دوسری بین الاقوامی کانگریس دسمبر ۱۹۸۲ء میں ہوئی تھی، تو وہ بھی اس میں مدعو تھے، اور ان کی بعض رائے کے حوالے بھی تقریروں میں سننے میں آئے، ان کی تصانیف کی شہرت تو سنی تھی، لیکن پڑھنے کا موقع نہیں ملا تھا، ان کی تصانیف خاص طور پر حاصل کیں، ان کا مطالعہ شروع کیا، تو معلوم ہوا کہ وہ انہی مستشرقین میں ہیں، جو اتھائی زہریلی باتیں اپنے طاقت ور اور ماہرانہ انداز میں کہہ کر اپنی مطلب برآری کی کوشش کرتے ہیں،

میرے پیش نظر اس وقت ان کی کتاب محمد ایٹ مکہ کا وہ ایڈیشن ہے، جو ۱۹۵۲ء میں چھپا، اب اسکے کسی ایڈیشن تکل چکے ہیں، نئے ایڈیشن سامنے نہ رہنے کی وجہ سے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ پہلے ایڈیشن اور بعد کے ایڈیشن میں کیا کیا ترمیمات کی گئی ہیں، لیکن پہلے ایڈیشن میں سب سے پہلے اس کتاب کے ماخذوں پر نظر پڑی، اس میں زیادہ تر اہر نہیں، رچرٹیل، بول، کاتانی، انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، گولڈ زہر، جسفری کینیس، نکلسن، تولد کی، سیل اینڈ وہری، ٹوری، دہادسن اور وسط وغیرہ کے نام لے، بخاری کا ذکر ضرور ہے، لیکن اس سے

مدد فریسی ترجمہ سے لی گئی ہے، قرآن مجید کو چرڈ بل کے ترجمہ سے سمجھا گیا ہے، ذوقی کی کتاب اخبار مکہ کا  
سہارا جرمن اسکالر وٹن منٹ سے لیا گیا ہے، ابن ہشام کی کتاب سیرت رسول اللہؐ، ابن سعد کی طبقات،  
طبری کی تاریخ الرسل والملوک اور واقعی کی کتاب المغازی کا ذکر ضرور کر دیا گیا ہے، مگر یورپی مصنفوں  
کی کتابوں کے حوالے اس کثرت سے ہیں کہ عربی کی تصانیف دبی ہوئی نظر آتی ہیں،

یورپ اور امریکہ کے فضلا نے تحقیق و تدقیق کا یہ معیار قائم کر رکھا ہے، کہ اس میں حوالے معاصر  
ماخذوں اور نہیں تو زمانہ کے لحاظ سے قریب تر زمانہ کے ماخذوں کے حوالے دے کر اس کو مستند اور  
بنایا جائے، ترجمہ کے حوالوں سے اس کا پایہ گر جاتا ہے، پھر بہت بعد کے مصنفوں کے حوالوں سے یہی تحقیق <sup>الاعتناء</sup> تحریر ملاحظہ  
ہو جاتی ہے، لیکن زیر نظر کتاب کے مصنف نے زیادہ تر انیسویں اور بیسویں صدی کے مصنفوں کی کتابوں کے  
حوالے دیے ہیں، اور ان ہی کا سہارا لیا ہے، جن سے ان کی نیت کے کھوٹ کو مدد پہنچ سکتی ہے، اور پھر عربی  
کی اصل کتابوں کے حوالے کے بجائے ان کے ترجمہ سے استفادہ کیا گیا ہے، اس لحاظ سے اس کتاب کی وقعت  
بڑی حد تک گر جاتی ہے،

ابن اسحاق، ابن ہشام، کتاب المغازی از واقعی اور طبقات ابن سعد اور تاریخ طبری کے حوالے  
مصنف نے ضرور دیے ہیں، مگر اسی حد تک جتنے ان کے لیے مفید تھے، ان کتابوں کا جو ناقدانہ تجزیہ کیا گیا  
ہے، اس سے مصنف بظاہر بے خبر معلوم ہوتے ہیں، ابن اسحاق نے فن مغازی میں شہرت حاصل کی، وہ امام  
فن مغازی سمجھے جاتے ہیں، مغازی میں زیادہ تر لڑائیوں اور معرکہ آرائیوں کا ذکر ہوتا ہے، اس لیے یہ فن  
سیرت نگاری سے مختلف ہے، ابن اسحاق پر یہ اعتراض ہے کہ انہوں نے بعض واقعات یہودیوں سے سن کر لکھے  
ہیں، اس لیے ان پر پورا اعتماد نہیں کیا جاسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک گروہ ان کو ثقہ سمجھتا ہے، تو اسی درجہ کا  
دوسرا گروہ ان کو بے اعتبار قرار دیتا ہے، محمد ابن اسحاق ہی کی کتاب کو زیادہ منفعہ اور اضافہ کر کے ابن ہشام  
نے اپنی سیرت مرتب کی، لیکن ان پر یہ اعتراض ہے کہ انہوں نے اس کتاب کو زیادہ تر بکالی کے واسطے سے روا  
کیا ہے، بکالی اگرچہ رتبہ کے شخص سمجھے جاتے ہیں، لیکن امام بخاری کے اسناد ابن مدینی اور نسائی کہتے ہیں، کہ وہ  
ضعیف ہیں، ابو حاتم بھی کہتے ہیں، کہ وہ اسناد کے قابل نہیں،

واقعی کی روایتیں تو موجودہ دور کے سنجیدہ علمی حلقوں میں بالکل قابل قبول نہیں سمجھی جاتی ہیں کیونکہ اس کی لغوی بیانی مسئلہ عام ہو چکی ہے، محدثین کہتے ہیں کہ وہ اپنے جی سے روایتیں گھڑتا ہے، اس لیے وہ اس کو کذاب کہتے ہیں، استاذی المحترم مولانا سید سلیمان ندوی تحریر فرماتے ہیں:

دنیا جانتی ہے کہ واقعی کی حیثیت ایک داستان گو کی ہے، جس کا شمار معتبر مورخین میں نہیں ہو سکتا، تاریخ دستیر میں اس کا حوالہ دینا ایسا ہی ہے، جیسے آپ ملا الزبیر کی سوانح عمری میں رینالڈس کا حوالہ دیں، ..... امام شافعیؒ نے اگرچہ اس سے روایت کی ہے، مگر یہ صاف تصریح ہے کہ امام اس کی تصنیفات کو جھوٹ کا ابتداء کہا کرتے تھے، (مقالات سلیمان جلد ۲ صفحہ ۱۱۸)

پھر واقعی کس طرح معتبر ہو سکتا ہے؟

طبقات ابن سعد کا بڑا حصہ واقعی سے ماخوذ ہے، جو روایتیں واقعی سے لی گئی ہیں، وہ اس لیے صحیح نہیں سمجھی جاسکتی ہیں، کہ یہ ابن سعد میں درج ہیں،

طبری کی تاریخ مستند ضروری ہے، لیکن وہ بہت سی روایتیں ایسے راویوں کے ذریعہ بیان کرتا ہے، جن میں بہت سے ضعیف الروایہ اور غیر مستند ہیں، اس لیے سیرت پر جو کچھ لکھا ہے، اس میں اکثر جگہ مستند احادیث کی کتابوں سے کام نہیں لیا ہے،

آج سے تقریباً ستر برس پہلے علامہ شبلیؒ نے سیرت کے ماخذوں پر بڑی سیر حال کی ہے، جو اب تک چراغ راہ اور نشان منزل کی حیثیت رکھتے ہیں، ان کا خیال ہے کہ معازی واقعی، سیرت ابن ہشام، سیرت محمد ابن اسحاق اور تاریخ طبری وغیرہ سیرت و تاریخ کی کتابیں ضرور ہیں، لیکن سیرت کی تصنیفات میں ایک بھی نہیں جو استناد کے لحاظ سے بلند رتبہ ہو (سیرت النبیؐ جلد اول ص ۹) وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ روزمرہ اور عام واقعات میں ابن سعد، ابن ہشام اور طبری کی عام روایتیں کافی خیال کی جاتی ہیں، لیکن جو واقعات کچھ بھی اہمیت رکھتے ہیں، ان کے متعلق تنقید اور تحقیق سے کام لینے اور رکورد کاوش کرنے کی خاص ضرورت ہے (ص ۱۰۱) مولانا شبلیؒ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی ترتیب کے کچھ اصول بتائے ہیں، جس کی وضاحت



مختصر طریقہ پر اس طرح کی جاسکتی ہے کہ سب سے پہلے یہ کہ سیرت کے واقعات کے متعلق جو کچھ قرآن مجید میں مذکور ہے ان کو سب سے مقدم رکھا جائے، کیونکہ بہت سے واقعات کے متعلق خود قرآن مجید میں ایسی تصریحات یا اشارے موجود ہیں جن سے احتمالی مباحث کا فیصلہ ہو جاتا ہے، قرآن مجید کے بعد حدیث کا درجہ ہے، احادیث صحیحہ کے سامنے عام سیرت کی کتابوں کی روایتیں نظر انداز کی جاسکتی ہیں، جو واقعات بخاری و مسلم وغیرہ میں مذکور ہیں، ان کے مقابلہ میں سیرت یا تاریخ کی روایت کی کوئی ضرورت نہیں، اگر عام استقرار اور تفحص سے کام لیا جائے، تو تمام اہم واقعات میں خود صحاح ستہ کی روایتیں مل جاتی ہیں، بصورت اختلاف روایات احادیث کے رواۃ ارباب فقہ و ہوش کی روایات کو دوسروں پر ترجیح دینی چاہیے، سیرت کی کتابوں میں جو واقعات ہوں ان میں سلسلہ علت و معلول کی تلاش نہایت ضروری ہے، اور جو روایت عام و جوہ عقلی ہر شاخہ عام، اصول مسلمہ اور قرآن حال کے خلاف ہوگی، لایق حجت نہ ہوگی، اہم موضوع پر مختلف روایات کی تطبیق و جمع سے اس کی تسلی کرینی چاہیے، کہ راوی سے ادائے مطلب میں تو غلطی نہیں ہونی ہی وغیرہ وغیرہ،

مولانا شبلی نے اپنے زمانہ میں لکھا تھا، کیا یورپ کے سیرت نگاران پیغمبر اسلامؐ میں کسی نے بھی اس جانکاہی اور نکتہ بینی کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی لائف کے لیے قلم اٹھایا ہے؟ انہوں نے اس وقت یہ سوال اٹھایا تھا، کہ کیا ایک غیر مسلم ان قواعد اور اصول کی مراعات کے ساتھ قلم اٹھا سکتا ہے، ڈبلیو، منٹگری و اسٹ سے بھی یہ سوال کیا جاسکتا ہے، مگر وہ کیوں اس جانکاہی اور نکتہ بینی کی زحمت گوارا کرتے،

وہ قرآن کے ماخذ کو یہ لکھ کر ہلکا کر دیتے ہیں.... کہ اس میں تو عقائد وغیرہ کی تفصیل ہے اس زمانہ کے اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی حالات نہیں ہیں، اور یہ دعویٰ بھی کیا ہے کہ ان حالات کے بغیر عقائد کو توازن کے ساتھ سمجھا نہیں جاسکتا ہے، خوب، زبور، توریت اور انجیل میں کیا اس زمانہ کے اس قسم کے مسائل حالات مل جاتے ہیں، تب ہی ان کے عقائد سمجھے میں آتے ہیں،

یورپ کے مصنفوں نے معلوم نہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کتنی کتابیں لکھی ہیں، فارستر، اردنگ، اسپرنگر، میور، مارگولیتھ، ڈی بیسی جانسٹن، مینریہ اور خدا جانے اور کتنے ان گنت اہل قلم ہیں جنہوں نے آپؐ کی سیرت پر بہت کچھ لکھا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کی سیرت پر کچھ لکھنا ان کے لیے فخر کی بات ہی اور

ہونی بھی چاہیے، لیکن اس فخر کے ساتھ وہ اپنی طبیعت کے مطابق تیش عقرب سے بھی باز نہیں آتے، منگھری داٹ  
 بھی یہ فخر حاصل کرتا چاہتے تھے، اس لیے قلم اٹھایا، اور مختلف جلدیں لکھ ڈالیں، ان کا خیال ہے، کہ محمد کی ایک  
 تازہ سوانح عمری اس لیے لکھنے کی ضرورت تھی، کہ اسلام کے طلبہ آپ کی سیرت کا مطالعہ تاریخی نقطہ نظر سے  
 کرنے کے خواہاں ہیں، اس لیے انھوں نے مورخ بن کر اس کتاب میں اس زمانہ کے اقتصادی، معاشرتی اور  
 سیاسی پس منظر کو پیش کیا ہے، ان کا یہ بھی خیال ہے کہ اس میں ایسے سوالات کے بھی جوابات ملیں گے، جو پہلے  
 نہیں اٹھائے گئے، مگر اس کا فیصلہ ان کے ناظرین ہی کر سکتے ہیں، کہ انھوں نے جو کچھ لکھا ہے، کیا ان کے پیشرو  
 یورپین مصنفین نہیں لکھ چکے ہیں، اردنگ، میور اور مارگولتھ وغیرہ کے ابتدائی ابواب میں وہ سب کچھ ملیگا،  
 جو مصنف نے اپنے ابتدائی باب میں لکھا ہے، انھوں نے اپنے پیشرو مصنفوں کی تحریروں کو اپنے انداز میں مرتب  
 کر دیا ہے، اسی کے ساتھ ان کے ناظرین کو یہ حق ہے کہ وہ فیصلہ کریں کہ وہ چبائے ہوئے نوالے کو چہا رہے ہیں، یا  
 کوئی نئی بات پیش کر رہے ہیں، یا اس کتاب میں کس حد تک وہ مورخ ہیں، کس حد تک عیسائیت کے خالص مبلغ اور  
 حامی ہیں، صحیح تو یہ ہے کہ وہ ایک نئے مقصد کے تحت اپنی کتاب لکھنا چاہتے تھے، جس کے لیے وہ ایک نتیجہ پر  
 پہلے پہنچ گئے تھے، اسی کے مطابق اپنی تحقیق اور محنت کا صغریٰ اور کبریٰ مرتب کر لیا، ان کا کیا مقصد ہے  
 وہ آئندہ سطروں میں ظاہر ہوگا،

کتاب کے پہلے باب میں عرب کے اقتصادی، سیاسی، معاشرتی، اخلاقی، مذہبی اور ذہنی پس منظر کا  
 احاطہ کیا گیا ہے، اقتصادی حالات پر تبصرہ کرتے ہوئے مصنف کا دعویٰ ہے کہ قرآن ریگستانی فصاحت میں نہیں  
 بلکہ اعلیٰ تمول کی صورت میں نازل ہوا، (ص ۳) لیکن اس دعویٰ کے باوجود وہ ایک چلتا ہوا فقرہ یہ بھی لکھ جاتے  
 ہیں کہ عرب کے باشندے بھوک سے عاجز ہو کر فتوحات کے لیے چل پڑے (ص ۳) یہ لکھ کر ان کی فتوحات کی عظمت  
 کو کم کرنے کی کوشش کی، مگر اقتصادی حالات کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ نہیں بتایا کہ اس پس منظر میں اسلام کی  
 تبلیغ و اشاعت میں مدد یار کاوٹ پہنچی، اس کی وضاحت کے بغیر عمد جاہلیت کے مکہ کی سیاست کا ذکر چھڑ دیتے  
 ہیں، جس کے تجزیہ میں ان کے دل کا گوشہ بڑا نرم ہو گیا ہے، مکہ کی سیاست کے عنوان سے جو کچھ لکھا ہے، اس میں قریش  
 کی دھڑبندی، حلف الفضول، مکہ میں مختلف افراد اور قبائل کے اثرات، اس کی خارجہ پالیسی، اس پر بازنطینی اثرات

اور حبشہ کی حکومتوں کی لچائی نظر، اس پر ابرہہ کے حملہ وغیرہ کا ذکر کرنے کے بعد رقمطراز ہیں کہ محمد کی بعثت اس وقت ہوئی، جب مکہ میں بڑی دولت اور بین الاقوامی سیاست کی آمیزش ناگزیر طور پر تھی، (ص ۱۱)

وہ ایام جاہلیت کے قریش کی عقلمندانہ اور صبر آزما سیاست دانی اور حکم کے بھی معترف ہیں، لکھتے ہیں کہ ان کی سیاسی عقلمندی میں حکم چمکتا نظر آتا ہے، (ص ۱۱) ان کی رائے ہے کہ ان کی قبائلی کش مکش معمولی درجہ کی تھی، جو مشرکہ مفاد ہی کی خاطر تھی، (ص ۸) وہ یہ بھی ظاہر کرنا چاہتے ہیں، کہ مکہ میں جمہوریت تھی، اسکا موازنہ آئینس کی جمہوریت سے کرتے ہوئے لکھتے ہیں، کہ آئینس میں اخلاقی اصولوں اور ایمان داری پر زیادہ زور دیا جاتا ہے، لیکن مکہ کے لوگ اس کے لیے فکر مند رہتے کہ علی ساریت سے ایک چھارہ نکالیے ابھر سکتا ہے، (ص ۱۰)

مکہ کی خارجہ پالیسی پر بھی بحث ہے، جس کو پڑھنے کے بعد یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کوئی پھڑا ہوا نہیں بلکہ ایک ترقی پذیر علاقہ تھا، وہ لکھتے ہیں کہ باز نطنی اور ایرانی امپائر جیسی دو بڑی قوتوں کے ساتھ حبشہ جیسی چھوٹی قوت کو بھی مکہ سے برابر دیکھی رہتی، یہ دیکھی اس کی تجارتی سرگرمیوں کی وجہ سے رہی، باز نطنی حکومت سے مکہ کے تعلقات دوستانہ رہے، حبشہ باز نطنی حکومت کا دوست تھا، اس لیے ان دونوں قوتوں سے جب کوئی خطرہ نہ ہوتا، تو مکہ کا تجارتی کارواں دور دور تک جاتا، مگر جب حبشہ سے تعلقات اچھے نہیں رہے، تو ابرہہ نے مکہ پر حملہ کر دیا، اس کے وجوہ یہ بھی رہے، کہ ابرہہ کی نظر میں مکہ کی برہمنی ہونی نفع بخش تجارت کھٹکی، پھر اس کو جو تقدس حاصل تھا، اس کی اہمیت بھی اس کو پسند نہیں آئی، شاید اس کے حرم کی دولت پر بھی اس کی لچائی نظر پڑی، پھر اس تجزیہ سے بھی محفوظ کیا ہے، کہ مکہ اس زمانہ کی بڑی قوتوں کی کشاکش میں غیر جانبداری کو اپنے لیے ضروری سمجھتا، اور جب باز نطنی اور ایرانی طاقتیں برس برس پیکار ہوتیں، تو مکہ کی اس غیر جانبداری کی اہمیت بڑھ جاتی، یہ سب کچھ لکھنے کے بعد وہ رقمطراز ہیں، کہ مفید معلومات کے نہ رہنے کی وجہ سے یہ تمام باتیں قیاسات ہی سے لکھی جا رہی ہیں، جن میں اگر بہت سی تفصیلات صحیح نہیں ہوں گی، تو اس کی عام مرقعہ آرائی (Sound) ہی نظر آتی ہے، (ص ۱۶) ایسے طرز استدلال اور انداز تحقیق کا کیا جواب ہو سکتا ہے، مولانا شبلی نے آج سے بہت پہلے ایسے یورپین سیرت نگاروں کے متعلق لکھا کہ وہ نہایت دور دراز قیاسات اور احتمالات سے سلسلہ معلومات پیدا کرتے ہیں، جن میں بہت کچھ ان کی خود غرضی اور خاص مطلع نظر کو دخل ہوتا



ہے، وہ اپنے مقصد کو ایک محور بنا لیتے ہیں، اور تمام واقعات اسی کے گرد گھومتے ہیں، (سیرۃ النبی ص ۵۸) مصنف کی تحریر کی بڑی خوبی یہ ہے، اگر کوئی ناقد ان پر یہ اعتراض کرے، کہ ان کی کتاب میں عرب کے ایام جاہلیت کے تاریک اور اندازہ پہلوؤں کا ذکر نہیں تو وہ ان کی نشاندہی آسانی سے کر دیں گے لیکن ان کے قلم کی پاکبندی اسی میں نظر آتی ہے، کہ یہ تاریک اور اندازہ پہلو اس دور کے روشن پہلوؤں کی تفسیر میں دب کر رہ گئے ہیں، اب تک مسلمانوں کے سامنے ایام جاہلیت کی بڑی بھیانک تصویر تھی، جس کو مصنف اپنے خاص مقصد کے تحت رد کرنا چاہتے ہیں، وہ اس دور کی تجارتی سرگرمیوں اور دوسری خوبیوں کی مرقع آرائی اس لیے کرتے ہیں، کہ یہ ظاہر ہو کہ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد مسلمانوں سے ان کا تصادم ان کی اپنی قدروں کو برقرار رکھنے کی خاطر کھا، غزوات مذہبی لڑائیاں نہ تھیں، بلکہ تجارتی برتری کی خاطر لڑی گئیں، وہ مکہ کے لوگوں کی معاشرتی اور اخلاقی خوبیوں کے بیان کرنے میں فراخ دلی سے کام لیتے ہیں، مسلمان مورخین تو یہ بتاتے ہیں کہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کے زمانے تک عیش و نعمت کے سامان بہت کم تھے، اس زمانہ میں گھروں میں جائے ضرورت تھے، چھلینیاں نہ تھیں، بھوسے کو چھونک کر اڑاتے تھے، جو رہ جاتا کھا، وہی اٹا ہوتا کھا، بخاری کی حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ راتوں کو گھروں میں چراغ نہیں جلتے تھے، تاریخ ادراک میں یہ تصریح موجود ہے، کہ عرب کھنکھورا، گوہ اور گرگٹ اور جانوروں کے چمڑے کھاتے تھے، بتوں پر آدمیوں کی قربانی چڑھانی جاتی تھی، باپ کی منکوہ بیٹے کو وراثت میں ملتی تھی، حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ شادی جائز تھی، ازدواج کی کوئی حد نہیں تھی، قمار بازی، شراب خواری اور زنا کا کارواج عام تھا، لڑائیوں میں لوگوں کو زندہ جلادینا، مستورات کا پیٹ چاک کر ڈالنا، معصوم بچوں کو تیغ کرنا عموماً جائز تھا، (سیرت النبی ج ۱ ص ۱۱۸-۱۲۸) مولانا شبلی نے مستند حوالوں سے لکھا ہے، کہ قریش میں سخت بد اخلاقیوں کا پھیلنا ہوئی تھیں، بڑے بڑے ارباب اقتدار نہایت ذلیل بد اخلاقیوں کے مرتکب تھے، ابولہب جو خاندان ہاشم میں سب سے زیادہ ممتاز تھا، اس نے حرم محترم کے خزانہ سے غزال زریں چرا کر بیچ ڈالا تھا، ابن شریق جو بنو زہرہ کا حلیف اور دوسائے عرب میں شمار کیا جاتا تھا، نام اور کذاب تھا، نضر بن حارث کو جھوٹ بولنے کی سخت عادت تھی، اسی طرح اکثر ارباب جاہ مختلف قسم کے اعمال شنیعہ میں گرفتار تھے

سیرت النبیؐ جلد اول ص ۲۱۷، معارف مطبوعہ مصر ۱۹۵۵

مسلمانوں کا یہ اعتقاد ہے کہ اسی ظلمت، تیرگی اور تاریکی کو دور کرنے کے لیے ایک آفتاب عالم تبار کی ضرورت تھی، جو رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے پوری ہوئی، لیکن ہمارے فاضل مصنف موجودہ دور کی سیاسی، اقتصادی اور عمرانی اصطلاحات کا سہارا لے کر یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ مسلمان مورخین جو کچھ بیان کرتے ہیں، وہ سراسر غلط ہے، عربوں میں قبائلی یک تہتی کے ساتھ انفرادیت تھی، جب مختلف قبائل مل جاتے، تو ان کا اعلیٰ ترین یونٹ بن جاتا، (ص ۱۷) ان میں اتحاد، ایک مشترکہ زبان، شعری روایت اور مادی مفاد کی بناء پر تھا، ان کی بددیانتہ اقتصادی تجارتی اور سرمایہ دارانہ اقتصادیت کی طرف منتقل ہو رہی تھی، (ص ۱۸) وہ لڑائی میں بہادر، مصیبت میں صابر، انتقام لینے میں مشتعل مزاج، کمزوروں کے حامی، اور طاقتوروں کے خلاف سرکش ہوتے، (ص ۲۰) ان میں فیاضی، میزبانی، وفاداری، اطاعت شعاری جیسی اہم خوبیاں تھیں، ان کو اپنی آن اور عزت زیادہ محبوب تھی، جن کے لیے وہ قانون اور کسی بات کے صحیح اور غلط کی پروا نہیں کرتے تھے، (ص ۲۱، ۲۲) یہ عرب (Aristocracy) اور (Egalitarianism) کے مجموعہ تھے، ان میں مساوات تھی، لیکن جو بہتر سے بہتر ثابت ہوتا، وہی ان کا قاعد بن جاتا، (ص ۲۲) اسی طرح عربوں کی اور خوبیاں، اعلیٰ اخلاق، ان کی انسانی رشتہ داری کی روایت اور انسانی خوبیوں کا اعلیٰ معیار اس لیے دکھایا گیا کہ اسلام کی عظمت کو عربوں کی ان خوبیوں سے بڑی مدد ملی، اور جب یہودیوں اور عیسائیوں کی وحدانیت کا تصور اس میں شامل کر دیا گیا، تو اس میں اور بڑائی پیدا ہو گئی، (ص ۲۳) یہ نہ در بیان اس لیے صرف کیا گیا ہے کہ اسلام کی عظمت و جلالت میں گویا ربانی پیامات و الہامات کی تعلیمات کو کوئی دخل نہیں رہا، لیکن یہی عرب جب اسلام قبول کر لیتے ہیں، تو ان کے لیے مصنف جیسے مستشرقین کے دلوں کا نرم گوشہ ختم ہو جاتا ہے، ان عربوں میں زیادہ تر برائیاں نظر آتی ہیں،

مصنف نے عرب کے قدیم مذاہب کا مطالعہ تولد کی، ولہاؤسن، لیمنس اور پارٹن وغیرہ کی تحریروں کے ذریعہ سے کیا ہے، گو وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ ایسی معلومات جسے جسے ہیں، اس لیے قیاسات سے زیادہ کام لینے کا امکان ہے، (ص ۲۳) وہ یہ بھی تحریر کرتے ہیں کہ اس زمانہ میں دیوتاؤں اور دیویوں کی بڑی تعداد تھی، (ص ۲۴)

اور محمد کے زمانہ کے ایام جاہلیت میں مذہب کا اثر زیادہ نہ تھا، (ص ۲۳) وہ پتھروں اور درختوں کی پوجا کرتے تھے، (ص ۲۳) مگر اپنی تحریر کا رخ بدل کر یہ بھی کہتے ہیں کہ وہ ان چیزوں کو یزدانی نہیں سمجھتے، بلکہ یزدان کا مسکن تصور کرتے، ان کی پرستش غالباً بیرونی اثرات کی وجہ سے تھی، وہ ان کی یزدانیت کے قائل نہ تھے، بدویوں (Nomads) کو تو ان پر اعتقاد بھی نہ تھا، وہ ان کو محض کاشتکاروں کا دیوتا سمجھتے، (ص ۲۳) وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ عرب مکہ کے ارد گرد کے مقدس مقامات کی زیارت کو بھی جاتے، حرم یعنی مکہ کے مقدس حلقہ کا احترام بھی کرتے، اسی کے ساتھ وہ یہ بھی لکھ جاتے ہیں کہ جنگ احد میں ابوسفیان اپنے ساتھ لات اور منات بھی لے گئے تھے، مگر وہ یہ بھی لکھ جاتے ہیں کہ اس کا تعلق مذہب کے بجائے توہم پرستی پر تھا، وہ لات و منات کا تو سرسری طور پر ذکر کر گئے ہیں لیکن اس زمانہ میں جو اور دوسرے بتوں کی پرستش ہو رہی تھی، اس کو بالکل نظر انداز کر گئے ہیں، صحیح بخاری (باب مکہ) میں ہے کہ خاص خانہ کعبہ اور اس کے اطراف میں تین سوبت تھے، ان میں سے اہم بتوں مثلاً لات، عزی، منات، یفوث، یقوق، نسر، ود، صواع اور بل کا ذکر تو قرآن پاک میں ہے، اس زمانہ کی بت پرستی کی تفصیل لکھنے کے بجائے مصنف اس پر زور دیتے ہیں کہ ان کا اصل مذہب قبائلی طرز کا انسان دوستی (Humanitarianism) تھا، یعنی افراد تو فدا ہوتے رہیں گے، لیکن ان کا قبیلہ باقی رہے گا اور اس کو رہنا چاہیے، اور اسکی بقا کے لیے اس میں شریفانہ اوصاف باقی رہنا چاہیے جو شریف نسل خون ہی سے ممکن ہے، (ص ۲۵)

فاضل مولف نے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ ایام جاہلیت کے عرب خدا کے قائل رہے، طرنا سدا ہے کہ قرآن کی شروع کی آیتیں ان کو مخاطب کرتی ہیں، جو خدا پر یقین رکھتے تھے، یہ لکھنے کو تو لکھ گئے، لیکن اسی کے بعد یہ بھی کہتے ہیں، ان کا یہ یقین بہت کچھ مبہم اور گنگناک ہی، (ص ۲۶) پھر معلوم نہیں کس حوالہ سے یہ لکھ گئے ہیں، کہ قرآن میں سقر، الفارغ اور الحطمہ وغیرہ جیسے الفاظ بظاہر اس زمانہ میں سمجھے نہیں گئے، لفظ بظاہر بتا رہا ہے کہ وہ جو کچھ لکھ رہے ہیں، اس پر خود ان کو یقین نہیں، پھر لکھتے ہیں کہ سورہ قریش سے یہ گمان (Suggestion) ہوتا ہے کہ مکہ کے روشن خیال لوگ خدا ہی کی پرستش کر رہے تھے، پھر یکایک یہ کہتے ہیں کہ خدا کے لیے عربی اللہ والہ کا مخفف ہی، جس کے لیے یونانی لفظ (Atheos) کی طرح دیوتا (god) کے ہیں لیکن عام



لیکن عام طور سے اس سے خدا ہی کا مفہوم لیا جاتا ہے، یہ ممکن ہے کہ محمدؐ سے پہلے مکہ کے غیر اہل کتاب ...  
 (pagan) اللہ سے مراد کعبہ کے مخصوص دیوتا ہی کو لیتے، اسی طرح جس طرح طائف کا دیوتا ال لات  
 کہلاتا، مصنف اپنے احتمالات کو جاری رکھتے ہوئے رسم طراز میں، کہ اگر اللہ خدا کے لیے استعمال ہوا جیسا  
 کہ یہودیوں اور عیسائیوں کا بیان ہے، تو پھر اس کے گنجلک ہونیکے مواقع عظیم ہو جاتے ہیں، اس لیے اغلب یہ  
 ہے، کہ مکہ کے کچھ لوگ تو خدا کو تسلیم کرتے، لیکن ان کا یہ خیال بھی رہا کہ خدا پر یقین رکھنے کے ساتھ ان کی بت پرستی یا  
 ایسا تضاد نہیں، جس کی بنیاد پر وہ اس کو رد کر دیں، ان سطروں سے ظاہر ہے، کہ مکہ کے عربوں میں توحید کا  
 تخیل گنجلک سا تھا، لیکن ہمارے مصنف کا قلم جب آگے بڑھتا ہے، تو لکھ جاتے ہیں، کہ وحدانیت کا تخیل عیسائیوں  
 اور یہودیوں کے اثرات کی وجہ سے رہا ہوگا، ان سے مال میل کس طرح رہا، اس کی کچھ تفصیل بتانے کے بعد  
 یہ بھی تحریر کرتے ہیں، کہ مکہ میں عیسائی تھے، ان میں تاجر اور غلام بھی تھے، لیکن ان کے اثرات اہم نہ تھے،  
 (ص ۲۷) پھر وہ یہ بھی کہہ جاتے ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے اثرات میں بہت سے عجیب و غریب خیالات  
 بھی تھے، جن میں وہ غیر معمولی تخیلات بھی تھے، جو جعلی عیسوی عقائد (gospel) سے حاصل کر کے عرب  
 عرب میں رائج کر دیے گئے تھے، قرآن میں تثلیث یعنی باپ بیٹے اور کنواری مریم کے تصور پر تنقید، یقیناً  
 ان عیسائی عربوں پر تنقید ہے، جو یہ خیال رکھتے تھے، پھر مصنف اپنے احتمال سے کام لیتے ہوئے یہ بھی کہتے  
 ہیں، کہ جہاں تک یہودیوں کے اثرات کا تعلق ہے، یہ ان کے مقدس صحیفہ کے ذریعہ سے نہیں ہوتے، بلکہ مختلف  
 قسم کے ثانوی ذریعہ سے پہنچے، مصنف کا یہ بھی احتمال کہ وحدانیت کے سلسلہ میں یہودیت اور عیسائیت کے اثرات  
 کے علاوہ اور ذرائع سے بھی یہ اثر ہوا، گویا بہت قلیل رہا ہوگا، وہاں ایسے جھوٹے فرقے بھی رہے ہوں گے جن  
 پر وحدانیت کے معاملہ میں یونانی فلسفہ کا اثر رہا ہوگا، ایسے فرقے صابین کے تھے، اس زمانہ میں لفظ خلیفہ کا  
 کچھ استعمال ہوا، تو اس کی ایسی ہی ممکن تعبیر ہے، لیکن ان تمام احتمالات کا اٹھب دوڑانے کے بعد مصنف  
 یکایک یہ لکھ جاتے ہیں:

میں سادہ طریقہ پر یہ کہوں گا کہ وحدانیت کے سلسلہ میں کسی باضابطہ تحریک کی کوئی  
 اچھی شہادت نہیں ملتی، اور اگر کوئی ایسی تحریک تھی، تو اس کے پیچھے سیاسی مقاصد تھے،

مثلاً عثمان بن اکویرث نے عیسائیت اس لیے قبول کی کہ وہ بازنطینیوں کی مدد سے

مکہ کا تہنا فرماں روا ہو جاتے، (ص ۲۸)

یہ لکھ کر مصنف یہ کہہ جاتے ہیں، کہ حنیفیوں کے اس روایتی بیان میں سچائی ہے کہ وہ ایک نئے مذہب کی تلاش میں تھے، عرب اور خصوصاً مکہ میں چھٹی صدی عیسوی کے آخر میں جو مذہب ماحول تھا، اس میں بہت سے ایسے سنجیدہ لوگ رہے ہوں گے، جو ایک خلا محسوس کر رہے ہوں گے، اور اپنی گہری ضروریات کو پورا کر کے اپنے کو مطمئن کرنے کے خواہشمند تھے، اسی کے ساتھ اپنے احتمال سے کام لیتے ہوئے لکھتے ہیں، کہ آخر میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ عربوں نے یہودی و عیسائی خیالات کو کچھ ترمیم کے ساتھ قبول کیا، اس ترمیم کی وضاحت یہ کی ہے کہ انھوں نے تقدیر یاد ہر کے پرانے خیالات کو خدا سے وابستہ کر رکھا تھا، عربوں میں خدا کا خیال اس حد تک جاگزیں تھا، کہ وہ اپنے توہمی مراسم کو بھی خدا کے احکام ہی سے منسوب کر دیتے تھے، مصنف کا احتمال آگے بڑھتا ہے، اور وہ لکھتے ہیں، کہ مکہ سے ابراہیم کی مراجعت کی پرانی تعبیر قرآن سے پہلے کی ہو سکتی ہے، اور یہ خیال کہ عاد اور ثمود کے پیغمبر ہو اور صالح تھے، غالباً قرآن سے پہلے کا تھا، اور یہودیت اور عیسائیت کے قبل نبوت سے لیا گیا ہے، یہ احتمال ان کی اس تحریر سے بھی ظاہر ہے کہ محمد سے پہلے مسلمانوں نے پیغمبری کا جو دعویٰ کیا وہاں ظاہر ہے کہ نبوت کا خیال وہاں جڑ پکڑ چکا تھا، (ص ۹۳) معلوم نہیں مصنف نے یہ کیسے لکھ دیا کہ مسلمانوں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے اپنی نبوت کا اعلان کیا تھا، یہ تو اسلام کی معمولی تاریخ سے معلوم ہو سکے گا کہ مسلمانوں نے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نبوت کا دعویٰ کیا تھا، لیکن آپ کی زندگی میں اس کی آواز نہیں سنی گئی، حضرت ابو بکر کے عہد میں اس کی آواز ابھری تو اس کے خلاف فوج کشی کی گئی، اور وہ وحشی بن حرب کے ہاتھوں قتل ہوا،

اس قسم کی غلط بیانی اور احتمال کی عامہ فرسائی کے بعد مصنف آخر میں لکھتے ہیں، کہ محمد کی سید کے مطالعہ میں یہودیوں اور عیسائیوں کے اثرات کو اہمیت دینا ضروری نہیں، کیونکہ اس سلسلہ کی سب سے تفصیلات متنازعہ فیہ ہیں، لیکن اس کا احساس رکھنا ضروری ہے کہ ایسی خبریں ہوا میں محمد کے پاس تو آنے سے پہلے تھیں، اور یہ آپ کی ذات کی تیاری اور آپ کے مشن کے ماحول کا جز بن گیا، (ص ۲۹) یہ لکھ کر

کی چابکدستی ظاہر کی ہے،

اس کے بعد مصنف نے اپنا ابتدائی باب ختم کر دیا ہے، لیکن اس میں ان کے یقینات کے بجائے قیاسات، احتمالات، ظنیات، تاویلات اور بے جا معلومات کو زیادہ دخل ہے، وہ بظاہر غالباً اندازہ کیا جاتا ہے، ہوگا، رہا ہوگا، شاید اور خیال ہے، احتمال ہے، وغیرہ جیسے الفاظ کا سہارا زیادہ لیتے ہیں، وہ کیا کہنا چاہتے ہیں، اس کا سمجھنا آسان نہیں، وہ یہ بھی کہنا چاہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت سے پہلے عرب کچھ نہ کچھ وحدانیت سے متاثر تھے، ان پر یہودیت اور عیسائیت کے تخیل و حدانیت کا بھی کچھ اثر پڑا مگر وہ یہ بھی یہ کہتے ہیں محمد کی سیرت میں یہودیوں اور عیسائیوں کے اثرات کو اہمیت دینا ضروری نہیں،

جب مصنف یہ بھی لکھتے ہیں کہ اس زمانہ میں وحدانیت کی کوئی باضابطہ تحریک ہونے کی کوئی اچھی شہادت نہیں، تو پھر قیاسات اور تاویلات کی گھنی جھاڑیوں میں قلم کا گھوڑا دوڑانا کہاں تک صحیح ہے اصل یہودیت اور اصلی عیسائیت میں توحید کا تصور تھا، وہ ضرور اسلام میں آیا، اصل تورات اور اصل انجیل میں توحید کی وہی تعلیمات تھیں، جو اللہ تعالیٰ نے اپنے خاتم النبیین کے ذریعہ سے کلام پاک میں پیش کیں، اگر ان تینوں ربانی صحیفوں میں توحید سے متعلق ایک ہی بات نظر آئے، تو اس میں تعجب کی کوئی بات نہیں، خود اللہ تعالیٰ نے ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ اہل کتاب یعنی یہودیوں اور عیسائیوں سے کہہ دو کہ ایک بات مان لو، جو تمہارے یہاں بھی وہی ہے، اور وہ یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی اور کو نہ پوجو،

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ  
سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ  
إِلَّا اللَّهَ .

کہہ اے اہل کتاب آؤ ایک ایسی بات  
کی طرف جو کہ تمہارے اور تمہارے درمیان  
برابر ہے، یہ کہ بجز اللہ کے ہم کسی اور کی عبادت

نہ کریں،

(آل عمران: ۶۴)

البتہ کلام پاک میں توحید کی وہ تعلیم نہیں جو تحریف شدہ تورت اور انجیل میں ہے، مثلاً یہود کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں، مسیحیوں نے بھی دعویٰ کیا کہ یسوع مسیح اللہ کے بیٹے ہیں، اصل انجیل میں ایسی کوئی تعلیم نہیں، اور



نہ اس میں یہ کہا گیا کہ اللہ یسوع مسیح اور مریم بیٹوں ایک ہیں، اسے تین مت کہو، ایک کہو، اصل انجیل میں حضرت عیسیٰ نے کبھی یہ تعلیم نہیں دی، کہ میری ماں کو معبود مانو، یہود و نصاریٰ نے تو اللہ کو چھوڑ کر اجبار و رہبان کو بھی اپنا رب بنا رکھا تھا، قرآن مجید نے ایسے تمام عقائد کی تردید کی،

قرآن میں ہے:

یہودی کہتے ہیں کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے، عیسیٰ کہتے ہیں کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے، یہ بے حقیقت باتیں ہیں، جو وہ اپنی زبانوں سے نکالتے ہیں، ان لوگوں کی دیکھا دکھی، جو ان سے پہلے کفر میں مبتلا ہوئے تھے، خدا کی امان پر یہ کہاں سے دھوکا کھا رہے ہیں، انھوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو اللہ کے سوا اپنا رب بنا لیا ہے، اور اسی طرح مسیح بن مریم کو بھی، حالانکہ ان کو ایک معبود کے سوا کسی کی بندگی کرنے کا حکم نہیں دیا گیا تھا، وہ جس کے سوا کوئی معبود تھی عبادت نہیں، پاک ہے وہ ان مشرکانہ باتوں سے جو یہ لوگ کرتے ہیں، یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنی پھونکوں سے بجھا دیں، مگر اللہ اپنی روشنی

وَقَالَتِ الْيَهُودُ مَرْيَمُ ابْنُ اللَّهِ وَ  
قَالَتِ النَّصَارَى الْمَسِيحُ ابْنُ اللَّهِ ذَلِكَ  
قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ يُضَاهِئُونَ  
قَوْلَ الَّذِينَ كَفَرُوا مِن قَبْلِهِمْ  
اللَّهُ أَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَشَدُّ حِيلًا  
وَرَهْبَانُهُمُ ابْدِيَٰنٌ مِّنَ اللَّهِ  
وَأَنبِيَاؤُهُم مِّمَّنْ أَلَّا  
لِيُعْبَدُوا إِلَّا هُوَ يُشَٰهَدُ  
بِهِ عَمَّا يُشْرِكُونَ وَيُؤْتِي  
أَن يُّطْفِقُوا تَوْرًا مِّنَ اللَّهِ  
بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللَّهُ  
إِلَّا أَن يَتْلُمُ تَوْرَةً وَكُوفَةً  
كَثِيرَةً الْكَافِرُونَ

(سورۃ التوبہ: ۳۰ تا ۳۲)

کو مکمل کیے بغیر ماننے والا نہیں، خواہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو،

یہودیوں اور عیسائیوں نے توحید کی جس اصل تعلیم کو بھلا دیا تھا، اللہ تعالیٰ نے اپنے قائم بنیائوں کے

دریہ سے اپنے آخری صحیفہ آسمانی میں یاد دلادیا، اس سے یہ کہاں ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تعلیم میں یہودیت اور عیسائیت کا اثر ہے، یا یہودیوں اور عیسائیوں سے سنی سنائی یا ان سے حاصل کی ہوئی باتوں کو قرآن مجید میں جمع کر دیا گیا ہے، قرآن مجید نے تو ان کے یہاں جو بگڑی ہوئی تعلیم تھی، اسکو رد کر کے اس کو سنوارنے کی کوشش کی ہے،

قرآن میں وہی سب کچھ ہے جو توراہ اور انجیل میں ہے، انجیل میں بھی سب کچھ تھا، جو تورات میں تھا، قرآن مجید میں ہے:

”پھر ہم نے ان پیغمبروں کے بعد مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا، توراہ میں سے جو کچھ اس کے سامنے موجود تھا، وہ اسکی تصدیق کرنے والا تھا، خود ہم نے اس کو انجیل عطا کی، جس میں رہنمائی اور روشنی تھی، اور وہ بھی توراہ میں سے جو کچھ اس وقت موجود تھا، اس کی تصدیق کرنے والی تھی، خدا ترس لوگوں کے لیے سراسر ہدایت اور نصیحت تھی، ہمارا حکم تھا کہ اہل انجیل اس قانون کے مطابق فیصلہ کریں، جو اللہ نے اس میں نازل کیا ہے، اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں، پھر اے نبی ہم نے تمہاری طرف یہ کتاب بھیجی، جو حق لے کر آئی ہے، اور الکتاب میں جو اس کے موجود ہے، اس کی تصدیق کرتے والی اور اسکی محافظ و نگہبان ہے، (المائدہ۔ ۵۱ رکوع)

کھپر بہت صاف صاف قرآن مجید ہی میں ہے:

”جو کچھ قرآن میں بیان کیا جا رہا ہے، یہ بناوٹی باتیں نہیں ہیں، بلکہ جو کتابیں اس سے پہلے آئی ہیں، ان ہی کی تصدیق ہے، (سورۃ الرعد۔ رکوع ۱۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں آج کل کے مستشرقین کی طرح یہ بھی اعتراض ہوا کہ قرآن مجید

میں اگلے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں، قرآن مجید میں ہے:

اور جب کوئی ان سے پوچھتا ہے کہ تمہارے رب نے یہ کیا چیز نازل کی ہے تو کہتے ہیں کہ اہی

یہ تو اگلے وقتوں کی فرسودہ کہانیاں ہیں، یہ باتیں وہ اس لیے کرتے ہیں کہ قیامت کے روز اپنے

بوجھ ہی پورے اٹھائیں، اور ساتھ ساتھ کچھ ان لوگوں کے بوجھ بھی سمجھیں، جنہیں بر بنائے جات  
گمراہ کہہ ہے، دیکھو! کیسی سخت ذمہ داری کا ہے جو یہ اپنے سر پر لے رہے ہیں، (انجیل ص ۱۰)  
قرآن مجید تیار ہی ہے کہ:

دوسرے طرف خدا ترس لوگوں سے پوچھا جاتا ہے کہ یہ کیا چیز ہے جو تمہارے رب کی طرف  
سے نازل ہوئی ہے، تو وہ جواب دیتے ہیں کہ بہترین چیز اتنی ہی ہے، اس طرح کنیکو کاروں  
کے لیے اس دنیا میں بھی بھلائی ہے، اور آخرت کا گھر تو حضور ہی ان کے حق میں بہتر ہے،  
(انجیل ص ۱۶ رکوع ۴)

اللہ کے لغوی اور نحوی اشتقاق کی بحث تو پرانی ہے، جس کو چھپر کر اس مفہوم کو گنجلک کر دیا گیا ہے  
چاہے اس پر متنی بحث کی جائے، مسلمان عام طور سے یہ سمجھتے ہیں، کہ یہ عربی لفظ ہے، اور عربی کے الہ سے  
مشق ہے، اور یہ تسلیم کہ یہ کلدانی اور سریانی کے الہیا یا عبرانی کے الہ سے مشتق ہے، اور یہ تسلیم کہ قرآن سے  
پہلے جاہلی شعراء کے یہاں یہ لفظ طے گا، لیکن یہ سوال یہ ہے کہ کلدانی، سریانی، عبرانی یونانی والوں اور جاہلی  
شاعروں کے یہاں اور قرآن اور اسلام میں اللہ کا تصور کیا ہے، اللہ کے استعمال سے یہ ظاہر ہے کہ ایام  
جاہلیت میں توحید تھی، تو پھر مصنف کا یہ لکھنا کیا معنی رکھتا ہے، کہ اس زمانہ میں دیوتاؤں اور دیویوں کی بڑی  
تعداد تھی، (ص ۲۳) پتھروں اور درختوں کی پوجا ہوتی تھی، (ص ۲۳) خدا پر یقین رکھنے کے ساتھ ان کو خیال  
رہا کہ ان کی بت پرستی میں ایسا تضاد نہیں جس کو وہ رد کر دیں، اسی طرح وحدانیت کے سلسلہ میں کسی باطنی  
تحریک کی کوئی اچھی شہادت نہیں ملتی، (ص ۲۸) وغیرہ وغیرہ، ایام جاہلیت میں اللہ کا ذکر ضرور ہے، اور کچھ  
تھوڑے سے لوگ توحید کے قائل رہے، لیکن اس زمانہ کے عام لوگوں کا یہ مقصد رہا، کہ اللہ کے سوا اور بھی  
معبود (الہ) ہے، اس کے کچھ شریک بھی ہیں، اس میں اور جنوں میں باہم کوئی رشتہ قائم ہے، اس کے بیٹے اور  
بیٹیاں بھی ہیں، وغیرہ۔ اسی لیے ایم، اے سپور کو بھی یہ لکھنا پڑا، کہ اس زمانہ میں بت پرستی اور بنو اسمعیل کے  
بے ہودہ اعتقادات کی لہر جوش مارتی ہوئی کعبہ سے آکر ٹکراتی تھی، (دیباچہ ص ۷۱۱) قرآن مجید نے اسے  
تمام باطل عقائد اور توہمات کی تردید کی، اور اللہ کے تصور میں اس کی وحدت، وحدانیت، مشیت، وسعت،



قدرت، رحمت، محبت کی ایسی اعلیٰ تعلیم پیش کی، جو موجودہ توہین اور انجیل میں بگاڑ دی گئی تھی جس کو قرآن مجید اور اسلام نے پھر سے استوار کر کے نکھار دیا، واضح ہے کہ جس زمانے میں وحی الہی آئی، اس نے خدا پرستی میں کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں سکھائی، پرانی ہی باتوں کی تعبیر انسان کے وجدانی عقائد و تصورات اور علم کے مطابق کر دی، اس حقیقت کو مستشرقین اپنے مخصوص طرز کے معروضی مطالعہ کے ذریعہ جس رنگ میں چاہتے ہیں، مگر حقیقت اپنی جگہ پر حقیقت ہی رہے گی،

خود قرآن مجید میں ہے:

اے نبی! تم کو جو کچھ کہا جا رہا ہے، اس میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو تم سے پہلے گزرے ہوئے رسولوں کو نہ کہی جا چکی ہو، بے شک تمہارا رب بڑا اور درگزر کرنے والا ہے، اور اس کے ساتھ بڑی

مَا يُقَالُ لَكَ إِلَّا مَا قَدَّمِلَ لِلرَّسُولِ  
مِنْ قَبْلِكَ إِنَّ رَبَّكَ لَدُوٌّ  
مَغْفِرٌ رَحِيمٌ

درد ناک سزا دینے والا بھی ہے،

(سورہ حصر سجدہ ۴ - د کو ع ۴)

اسلام کی یہ صریح تعلیم ہے کہ تمام سچے مذاہب درحقیقت ایک ہی ہیں، ایک ہی پیغام ہے، جو آدم سے لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک سنایا جاتا رہا، میرے استاد محترم مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے ایک مضمون "رسول وحدت" میں اس کی تصریح اس طرح کی ہے کہ قرآن مجید نے ہمارے سامنے دو لفظا پیش کیے ہیں، دین اور شریعت جس کو مسلک اور منہاج بھی کہتے ہیں، دین سے مراد مذہب کے وہ بنیادی امور ہیں جن پر تمام مذاہب حقہ کا اتفاق ہے، مثلاً خدا کی ہستی، اسکی توحید، اس کی صفات کاملہ، انبیاء کی بعثت، خدا کی خاص عبادت، حقوق انسانی، اچھے اخلاق اور برے اعمال کی جزا و سزا، یہ وہ اصل دین ہے جس میں تمام پیغمبروں کی تعلیم یکساں تھی، اس کو لے کر اول سے آخر تک تمام انبیاء آتے، اس میں زمان و مکان کے تغیر کو کوئی دخل نہیں، نہ قوم و ملت کے اختلاف سے اس میں کوئی اختلاف ہوا، وہ ہر زمانہ اور ہر مقام میں یکساں رہا، اور وہاں کے پیغمبروں نے اس کی یکساں تعلیم دی، اب اگر اس میں کسی جہت سے کوئی اختلاف ہوا تو یا تو طریقہ تعبیر

کی غلطی ہے، یا باہر کی چیزیں اس میں مل گئی ہیں، اور اس کی حالت میں تغیر پیدا ہو گیا ہے، دوسری چیز یعنی شریعت  
 منہاج اور منہک وہ جزئیات احکام ہیں، جو ہر قوم و مذہب کی زمانی و مکانی خصوصیات کے سبب سے  
 بدلتے رہتے ہیں، مثلاً عبادت الہی کے طریقوں میں ہر مذہب میں کھوڑا کھوڑا اختلاف ہی، عبادت کی سمتیں  
 الگ الگ ہیں، اعمال قاسد کے انسداد کی تدبیریں جدا جدا ہیں، اب قرآن کے نقطہ نظر سے مذہب کے اختلاف  
 کا یہ مطلب ہے کہ اصل دین جو ازلی سپائی اور ابدی صداقت ہے، ناقابل تبدیل اور ناقابل تغیر ہے، البتہ متفقہ  
 حصول مقصد کے راستے اور طریقے مختلف پیغمبروں کے زمانوں میں اگر اصلاح اور تبدیل کے قابل پائے  
 گئے تو بدلتے رہتے ہیں، دنیا میں انبیاء علیہم السلام کا وقتاً فوقتاً ظہور اسی مقصد کے تحت ہوتا رہا ہے کہ وہ  
 اسی ازلی اور ابدی صداقت کو دنیا کے سامنے پیش کرتے رہیں، اور دین کو اصل مرکز پر قائم رکھیں، اور  
 ساتھ ہی اپنی قوم و ملک اور زمانہ کے حالات کے مطابق خاص احکام اور جزئیات جو ان کے لیے مناسب  
 ہوں ان کو بتائیں اور سکھائیں، انبیاء علیہم السلام کے حالات پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے، کہ ایک صاحب  
 شریعت نبی کے بعد دوسرا صاحب شریعت نبی اسی وقت بھیجا گیا ہے، جب پہلا صحیفہ کھو گیا ہے، یا ذہنی  
 تحریکات اور دستی تصرفات سے ایسا بدل گیا ہے کہ اصلیت مشتبہ ہو گئی ہے، حضرت ابراہیم کے صحیفوں کے  
 گم ہو جانے کے بعد حضرت موسیٰ پر تورات تازل ہوئی، اور جب اس میں اختلافات پیدا ہوئے تو زبور وغیرہ  
 مختلف صحیفے آئے رہے، جو عہد نامہ قدیم میں موجود ہیں، پھر اس کی تکمیل کے لیے انجیل آئی، اور جب ان میں  
 انسانی احتراعات کا دخل ہو گیا تو قرآن اترا،

## باب - ۲

اس باب میں مصنف نے پہلے یہ بحث چھیڑ دی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آباء و اجداد  
 کو کہیں اہمیت حاصل تھی، کہ نہیں، ان کا جو طرز استدلال عام طور سے اس کتاب میں ہے، وہی اس باب میں بھی  
 ہے، ظاہر ہے کہ وہ اپنے ناظرین کے دلوں میں آپ کے اسلاف سے متعلق کچھ نہ کچھ شکوک ضرور پیدا کر دینا چاہتے  
 تھے، اسی لیے اپنے خاص سلسلہ معلولات سے پھر کام لیا ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خاندان کے متعلق مولانا شبلی رقم طراز ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا

خاندان اگرچہ اباعن جد معز اور ممتاز چلا آتا تھا، لیکن جس شخص نے اس خاندان کو قریش کے لقب سے ممتاز کیا، وہ نضر بن کنانہ تھے، بعض محققین کے نزدیک قریش کا لقب سب سے پہلے قر کوٹلا، اور ان ہی کی اولاد قریشی ہے، نضر کے بعد نضر اور نضر کے بعد قحسی بن کلاب نے نہایت عزت اور اقتدار حاصل کیا، اس زمانہ میں حرم کے متولی ٹھیل خزاہی تھے، قحسی نے ٹھیل کی صاحبزادی سے جن کا نام حنی تھی تھا، شادی کی تھی، اس تعلق سے ٹھیل نے مرتے وقت وصیت کی، کہ حرم کی خدمت قحسی کو سپرد کی جائے، اس طرح یہ منصب بھی ان کو حاصل ہو گیا، قحسی نے ایک دار المشورہ قائم کیا، جس کا نام دارالسدودہ رکھا، قریش جب کوئی جلسہ یا جنگ کی تیاری کرتے تو اسی عمارت میں کرتے، قافلے باہر جاتے، تو یہیں سے تیار ہو کر جاتے، اور دیگر تقریبات کے مراسم بھی یہیں ادا ہوتے..... قحسی نے بڑے بڑے نمایاں کام کیے، جو ایک مدت تک یادگار رہے، مثلاً سقایہ اور رقادہ جو خدام عرب کا سب سے بڑا منصب تھا، ان ہی نے قائم کیا، تمام قریش کو جمع کر کے تقریر کی کہ سیکڑوں ہزاروں کو اس سے لوگ حرم کی زیارت کو آتے ہیں، ان کی میربانی قریش پر فرض ہے، قریش نے ایک سالانہ رقم مقرر کی جس سے منیٰ اور مکہ معظمہ میں حجاج کو کھانا تقسیم کیا جاتا تھا، اس کے ساتھ چرمی حوض بنوائے جن میں ایام حج میں پانی بھر دیا جاتا تھا، کہ حجاج کے کام آئے، مشعر حرام بھی ان ہی کی ایجاد ہے، جس پر ایام حج میں چراغ جلائے جاتے تھے، قحسی نے اس قدر شہرت اور اعتراب حاصل کیا کہ بعض لوگوں کا بیان ہے کہ قریش کا لقب ان ہی کو ملا، علامہ ابن عبد ربہ نے عقد الفرید میں بھی لکھا ہے، اور یہ بھی تصریح کی ہے کہ قحسی نے چونکہ خاندان کو جمع کر کے کعبہ کے آس پاس بسایا، اس لیے ان کو قریش کہتے ہیں، قحسی کے بعد قریش کی ریاست ان کے منجھے بیٹے عبد مناف نے حاصل کی، اور ان ہی کا خاندان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا خاص خاندان ہے، انہی کے دوسرے بیٹے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا ہاشم کے ذمہ حرم کے زائرین کے لیے سقایہ اور رقادہ کی خدمت سپرد ہوئی، انہوں نے یہ فرض نہایت خوبی سے انجام دیا، حجاج کو سیر حنی سے کھانا کھلانے کے لیے سبیل رکھتے تھے، تجارت کو نہایت ترقی دی، روم کے قیصر اور حبش کے بادشاہ سے عرب تاجروں کے لیے ٹیکس معاف کرایا، جس سے قریش کے قافلہ تجارت کی عزت بڑھی، عرب کے مختلف قبائل میں دورہ کر کے یہ معاہدہ کیا کہ قریش کے کاروان تجارت کو مقرر نہ پہنچایا جاتے گا، ایک دفعہ قحط پڑا، تو ہاشم نے شور بہ میں روٹیاں چورا



کر کے لوگوں کو کھلائیں، اسی لیے وہ ہاشم کے نام سے مشہور ہو گئے، (سیرۃ النبیؐ ج ۱ ص ۶۶-۱۶۵) مگر ہمارے مصنف نے ان کی اہمیت یہ لکھ کر کم کر دی ہے، کہ حجاج کی دیکھ بھال کا معاملہ ایک ادنیٰ درجہ کی چیز تھی، تجارت سے بڑے منافع حاصل ہو رہے تھے، اسی لیے یہ کام ہاشم کے حوالے کر دیا گیا تھا، (ص ۱۳۰)

وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دادا عبدالمطلب کے متعلق لکھتے ہیں، کہ انھوں نے چاہ زہرم کی کھدائی کر کے یہ تو ثابت کر دیا کہ ان میں کام کے ابتدا کرنے اور سرگرم عمل ہونے کی صلاحیت ہی، اور خانہ کعبہ کی عزت برقرار رکھنے میں بھی حصہ دار تھے، لیکن اس اعتراف کے باوجود وہ یہ بھی لکھ جاتے ہیں کہ یہ نہیں معلوم ہوتا ہے کہ مکہ میں نمایاں آدمی تھے، مگر کچھ نہ معلوم ہونے کے باوجود ان کو یہ معلوم ہو سکا کہ حجاج کو پانی فراہم کرنے کا حق ان ہی کو تھا، پھر ان کی امتیازی حیثیت کو ظاہر کرنے کے لیے یہ لکھتے ہیں، کہ ان کی لڑکیوں کی شادی مکہ کے بعض بہترین اور طاقتور ترین خاندانوں میں ہوئی، یہ معلومات بھی فراہم کی ہیں کہ جب مکہ پر ابرہہ کا حملہ ہوا تو وہی صلح و صفائی کے لیے بھیجے گئے، اس کی اہمیت یہ لکھ کر کم کر دی ہے، کہ وہ مکہ کے لوگوں کی طرف سے نہیں، بلکہ ایک اقلیت کی طرف سے ملے، پھر لکھتے ہیں کہ ان کے ملنے کا جو بھی مقصد رہا ہو، لیکن جب ابرہہ کی مراجعت ہوئی تو ان کی حکمت عملی کی خود بخود نفی ہو گئی، پھر اپنی عادت کے مطابق قیاس سے کام لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ ہم نہیں بتا سکتے، کہ ابرہہ سے ملنے کے بعد عبدالمطلب کا اثر بڑھا کہ نہیں، کیونکہ اس کے بعد ہی ان کی وفات ہو گئی، لیکن یہ بہت آسانی سے بتا سکتے کہ ابرہہ سے ان کے ملنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے قبیلہ کا حال برا ہو رہا تھا، اس قسم کا اندازہ لگانے میں مصنف بہت ماہر ہیں،

مصنف نے عبدالمطلب کی اہمیت بھی کم کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن ان کے پیش رو سوانح نگاروں میں میور نے ان کی عظمت اور سطوت کی پوری تصویر اپنی کتاب دی لائف آف محمد میں پیش کی ہے، وہ لکھتے ہیں کہ چاہ زہرم کی کھدائی عبدالمطلب کی زندگی میں بڑی کامرانی تھی اور دوسرے کتوئیں چھوڑ دیئے گئے، اور سب اس کی طرف مائل ہوئے، عبدالمطلب اس سے تمام ذرائع کو پانی مہیا کرتے، اور بہت جلد کعبہ کے حصہ دار ہو گئے، ان کی شہرت بڑھتی چلی گئی، ان کے خاندان کے طاقتور بیٹوں نے ان کے رتبہ کو اور بڑھایا، اور وہ مکہ کے سردار

بن گئے، ان کی یہ سرداری ان کی وفات تک رہی، میور نے یہ بھی لکھا ہے، کہ امیہ کے قبیلہ کو عبدالمطلب کی خوشحالی اور شہرت سے رشک پیدا ہوا تو اس کے لڑکے حرب نے اپنی فوقیت دکھانے کی خاطر عبدالمطلب کو چیلنج دیا، لیکن ایک قریشی نے ثالث بن کر عبدالمطلب کی برتری کا فیصلہ دیا، جس کو حرب نے تسلیم نہیں کیا اسی وقت سے بنو ہاشم اور بنو امیہ میں رشک و حسد پیدا ہونا شروع ہو گیا، عبدالمطلب کے اقتدار اور طاقت میں اس وقت بھی اضافہ ہوا جب انھوں نے مکہ کے بنو خزاعہ سے باہمی اعتماد کا معاہدہ کیا، یہ معاہدہ کعبہ میں آویزاں کیا گیا، اور جب ابرہہ نے مکہ پر کعبہ کو منہدم کرنے کے لیے حملہ کیا، تو مکہ کے لوگوں نے عبدالمطلب کو اور سرداروں کے ساتھ ابرہہ کے پاس بھیجا، ابرہہ نے اس حملہ میں عبدالمطلب کے دو سو اونٹ بکھڑ کر ضبط کر لیے تھے، عبدالمطلب ابرہہ کے پاس پہنچے، تو اس نے ان کی بڑی عزت کی، اس لیے ان کے اونٹوں کو اس امید پر واپس کر دیا، کہ وہ کعبہ کے منہدم کرنے میں مدد دے گا، عبدالمطلب نے اس کی بات نہیں مانی، بات آگے نہیں بڑھی، عبدالمطلب مکہ واپس آئے، اپنے لوگوں کو ٹو پھاڑوں کی طرف چلے جانے کو کہا، لیکن کعبہ کے دروازے پکڑ کر دہاکی، کہ اے اللہ اپنے گھر کو بچالے، اور صلیب کو اس پر فتح نہ عطا کر، اس کے بعد ابرہہ کی فوج میں دبا پھوٹ پڑی، وہ واپس ہوئی تو سمندر میں غرقاب ہو گئی، اور ابرہہ بھی سنانی پہنچے ہی مر گیا، (زدی لائف آف محمد دیباچہ ۱۱۷۷ ص ۷۰)

میور کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدالمطلب اپنے زمانہ کے اہم ترین، معزز ترین اور متمول ترین سرداروں میں تھے، مگر منٹگمری واٹ کی تحریروں سے ان باتوں کی تردید ہوتی ہے، ان کا خیال ہے کہ حرب بن امیہ اور عبدالمطلب کے حریف ہونے کی روایت مشکوک ہے، کیونکہ یہ بات زیادہ تفصیل سے نہیں بیان کی گئی ہے، پھر وہ یہ کہتے ہیں، کہ عبدالمطلب ابرہہ سے مکہ کے تمام لوگوں کی طرف سے نہیں بلکہ ایک اقلیت کی طرف سے نمائندگی کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، اور ابرہہ سے جا کر ملنے کی پالیسی سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے قبیلہ کی حالت بدتر ہوتی جا رہی تھی، اس قسم کے اندازے لگانا ایک مورخ کے شایانِ شان نہیں، بہر حال میور اور منٹگمری میں کون صحیح ہے، اس کا اندازہ لگانے کے بجائے یہ تو آسانی سے کہا جاسکتا ہے، کہ یورپی اہل قلم اپنی مرضی کے مطابق جو چاہیں لکھیں اور اپنے زور قلم سے

لکھ کر ناظرین کو متاثر کریں، ڈی ایسی جانسن نے اپنا زور قلم یہ لکھ کر دکھایا ہے کہ زمرم کی کھدائی کے بعد  
عبدالمطلب کا رتبہ اور اقتدار اپنے باپ سے زیادہ بڑھ گیا تھا، اور جو نہایت تھی کو حاصل تھی، وہ ان  
کو حاصل ہو گئی، اور ان کی شہرت بڑی بلندی پر اس وقت پہنچی، جب ان کی وفات سے آٹھ سال پہلے  
ابرمہ نے مکہ پر حملہ کیا، لیکن وہاں سے اپنی فوج سمیت موت کے گھاٹ اتر آ، (ص ۳۰-۳۹)

حلف الفضول کی تفصیل طبقات ابن سعد ج ۱ ص ۸۲ کے حوالے سے مولانا شبلی نے یہ لکھی ہے کہ  
لڑائیوں کے متواتر سلسلہ نے سیکڑوں گھر برباد کر دیئے تھے، قتل و سفاکی موروثی اخلاق بن گئے تھے،  
یہ دیکھ کر بعض طبیعتوں میں اصلاح کی شریک پیدا ہوئی، جنگ فجار سے لوگ واپس ہوئے، تو زبیر بن  
عبدالمطلب نے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پسر اور خاندان کے سرگرم تھے، یہ تجویز پیش کی چنانچہ  
خاندان ہاشم زہرہ اور منیہ عبد اللہ بن جدعان کے گھر میں جمع ہوئے، اور معاہدہ ہوا کہ ہم میں سے ہر شخص نظام  
کی حمایت کریگا، اور گویا ان کے پاس نہ رہے پائے گا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس معاہدہ میں شریک  
تھے، اور عمد نبوت میں فرمایا کرتے کہ معاہدہ کے مقابلہ میں اگر مجھ کو سرخ رنگ کے اونٹ بھی دیئے جاتے،  
تو میں نہ بدلتا، اور آج بھی ایسے معاہدہ کے لیے بلایا جاتے تو میں حاضر ہوں، (سیرۃ ابنی ساج ص ۱۸۳)

اب اسی بات کو مصنف نے کیا سے کیا کر دیا ہے، وہ پڑھنے کے لائق ہی لکھے ہیں:

کچھ دنوں کے لیے بنو ہاشم کی قیادت زبیر بن عبدالمطلب کے سپرد کر دی گئی، یہ فجار اور حلف الفضول  
کا زمانہ تھا، زبیر کو کوئی نمایاں حیثیت حاصل نہیں ہوئی، حلف الفضول کمزور قبیلوں کے اتحاد کا معاہدہ  
تھا، اس میں نمایاں حصہ عبد اللہ بن جدعان نے لیا، کیونکہ اس کا اجتماع اس کے گھر میں ہوا تھا، وہ فجار کا  
کے موقع پر مکہ کے اہم آدمیوں میں تھا، (ص ۳۲)

ادھر کی سطروں میں تو یہ لکھ گئے ہیں کہ حلف الفضول کمزور قبیلوں کا باہمی معاہدہ تھا، لیکن  
آگے چل کر لکھتے ہیں۔

فجار کی جنگ اس وقت ہوئی جب محمد پندرہ اور بنی کی عمر کے درمیان تھے، اور کہا جاتا ہے کہ  
اس لڑائی میں اپنے چچاؤں کی طرف سے اس میں تھوڑا حصہ لیا، وہ حلف الفضول کے موقع پر شاید موجود تھے



کہا جاتا ہے کہ بعد میں اس کی تعریف بڑی کی، اس معاہدہ کا مقصد نسبتاً مضبوط تر اور معمولی تر قبیلوں کی برتریوں کے خلاف انصاف کو برقرار رکھنا تھا، اور یہ مقصد قرآن کی تعلیمات کے بعض مقصد سے بہت قریب تھا،<sup>۳۲</sup> مولانا شبلی کے بیان سے تو ظاہر ہے کہ یہ معاہدہ اس لیے ہوا کہ ہر شخص مظلوم کی حمایت کرے گا، اور کوئی ظالم مکہ میں نہ رہنے پائے گا، لیکن مصنف نے اپنی طرف سے یہ انتراع کیا، کہ یہ معاہدہ مضبوط اور معمولی قبیلوں کے خلاف کمزور قبیلوں کی طرف سے تھا، دونوں تعبیروں میں کافی فرق ہے،

ذہیر بن عبدالمطلب کی نمایاں حیثیت کو مصنف نے اس لیے کم کرنے کی کوشش کی کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے، وہ ابوطالب کی بھی اچھی تصویر نہیں کھینچتے، وہ لکھتے ہیں کہ ابوطالب اپنے قبیلہ کے سردار تھے، لیکن مولانا شبلی کی تحقیق ہے کہ عبدالمطلب کی مندریاست پر حرب متکلم ہوا، جو بنو امیہ کا نامور فرزند تھا، مناصب ریاست میں صرف سقاہ یعنی حجاج کو پانی پلانا عجم کے ہاتھ میں رہا، جو عبدالمطلب کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے، (سیرۃ النبی ج ۱ ص ۷۷-۷۶) ابوطالب برابر تجارت کرتے رہے، لیکن مصنف کا بیان ہے کہ ان کی غربت کی وجہ سے محمد ان کے گھر کے علی کو اپنے ساتھ رکھنے لگے، یہ صورت حال اس لیے پیدا ہوئی تھی کہ ابوطالب میں نمایاں خوبیاں تھیں، پھر عبدالمطلب کی وفات سے پہلے اس قبیلہ کا زوال بھی شروع ہو گیا تھا، (ص ۳۲)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد زبیر کے متعلق مصنف کا بیان ہے کہ وہ شاید محمد کی پیدائش سے پہلے وفات پا گئے تھے (ص ۳۲) اور محمد کی پیدائش شاید ان کی والد کی وفات کے بعد ہوئی، (ص ۳۳) مصنف نے اس تحریر میں "شاید" لکھ کر اپنی تحقیق کا کچھ اچھا نمونہ پیش نہیں کیا، کیونکہ اس میں کسی کو شک نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے والد کی وفات ان کی پیدائش سے پہلے ہو گئی تھی، میور نے واضح طور پر لکھا ہے کہ ان کی وفات محمد کی پیدائش سے پہلے ہی ہو گئی تھی (باب اول ص ۴) مارکو لیتھ نے تو صاف طوطا پر لکھا ہے کہ یہ یقینی ہے کہ مستقبل کے پیغمبر کے والد کی وفات بیٹے کی پیدائش سے پہلے ہو گئی (ص ۴۵) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قبیلہ کی اہمیت کو مصنف نے اپنی معروضی تحقیق سے ایک بار پھر کھٹانے کی کوشش کی، پہلے تو یہ لکھتے ہیں کہ مجموعی حیثیت سے یہ اثر پڑتا ہے کہ محمد کا قبیلہ مکہ کی زندگی میں ایک

زمانے میں آگے آگے تھا، لیکن محمد کے مشن کے آغاز سے پہلے یزوال پذیر تھا، یہ محض کمزور اور غریب قبیلوں کا ایک نمایاں رکن تھا، اس کے افراد شام کی تجارت سے دلچسپی لیتے رہے، لیکن شاید عبد شمس اور مخزوم قبیلوں کی طرح بڑی تجارت کے حصہ دار نہ تھے، (ص ۳۳) مصنف کا سخن تکبیر شاید اور غالباً ہے، اس کی آڑ لے کر وہ سب کچھ کہہ جاتے ہیں، شاید اور غالباً جیسے الفاظ سچی مورخانہ تحقیق پر دلالت نہیں کرتے،

مصنف نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کی تاریخ ۵۷۰ء لکھی ہے، اس کے لیے کوئی حوالہ نہیں دیا ہے، صرف یہ لکھ دیا ہے کہ عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے، میورتے یہی تاریخ لکھی ہے، اگر کوئی نے کوئی تاریخ نہیں لکھی ہے، اور ونگ نے ۵۶۱ء کی تاریخ لکھی ہے، (ص ۲۴) مولانا شبلی نے ولادت کی تاریخ ۵۷۰ء بے اول روز دو شنبہ مطابق ۲۱ اپریل ۵۷۰ء لکھی ہے، اس کی سند میں رقم طراز ہیں کہ مصر کے مشہور ہستی دان عالم محمود پاشا فلکی نے ایک رسالہ میں دلائل ریاضی سے یہی تاریخ ثابت کی ہے، (دعوتِ انبی ص ۱۷۱)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ابتدائی زندگی کے جو واقعات قصے کے طور پر درج ہیں، ان کے متعلق مصنف کا طرز استدلال وہی ہے، جو عام طور سے ان کی اس کتاب میں ہے، وہ کہتے ہیں کہ آپ کی شادی سے پہلے کے بہت سے قصے ہیں، جو دینی انداز کے ہیں، مگر ایک سیکولر مورخ کے نزدیک صحیح نہیں ہیں، یہ اس لیے بھی کہ ان واقعات کا ذکر محمد کی آئندہ زندگی میں نہیں کیا جاتا، اور نہ ان کی کوئی سند ہے، اس کے بعد اپنی تحریر کا رخ بدل کر کہتے ہیں کہ راسخ العقیدہ مسلمان ان کو اہمیت دیتے ہیں، اس لحاظ سے وہ ان کے لیے سچے ہیں، اور ان کے پیغمبر کی زندگی کے آغاز کا ایک مناسب دیا جا چکا ہے، اور پھر وہ اپنے شاید سے کام لے کر کہتے ہیں، کہ شاید ان کے بیان کرنے کا طریقہ ایسا ہے کہ جیسے یہ آنکھوں دیکھا حال ہے، اور مثال میں ابن اسحاق کی کتاب سے وہ سارے قصے پارہ صغی میں نقل کر دیے گئے ہیں، جو آپ کے ایامِ نبوت سے سفر شام تک بیان کیے گئے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ:

حضرت حلیمہ سعدیہ آپ کی رضاعت کے لیے تیار ہو گئیں، تو ان کو اتنا دودھ ہونے لگا، کہ آپ کے ساتھ آپ کا رضاعی بھائی بھی خوب سیر ہو کر دودھ پینے لگا، اور جب وہ مکہ سے اپنے گھر واپس جانے لگیں

توان کی اونٹنی نے راستہ میں خوب دودھ دیا، اور اسی طرح برابر دیتی رہی، اور جس گدھی پر سوار ہوئیں وہ بہت تیز چلنے لگی، اور جس چراگاہ میں ان کی اونٹنی چرنے جاتی، وہ بہت شاداب رہنے لگی، پھر اس میں آپ کے شوقِ صدر کی تفصیل بھی ہے، اور یہ بھی ہے کہ خود حضرت آمنہ نے بیان کیا کہ آپ جب پیٹ میں تھے، توان کے اندر سے ایک نور نکلا، جس نے پھرہ کے محل کو منور کر دیا، پھر اس میں حضرت ابو طالب کے ساتھ آپ کے سفرِ شام کا ذکر ہے، جہاں عیسائی راہب سے ملاقات ہوئی، اس نے آپ کی نبوت کی بشارت دی، اور بہت سی نصیحتیں کیں،

ابن اسحاق کی یہ تمام روایتیں غیر مستند سمجھی گئی ہیں، حضرت حلیمہ سعدیہ کی رقصاعت کے سلسلہ میں جو قصے بیان کیے گئے ہیں، ان کو غیر معتبر سمجھ کر مولانا شبلی نے ہیکل رد کر دیا ہے، اور اپنی کتاب میں اس کا ذکر کرنا بھی پسند نہیں کیا ہے، انھوں نے شوقِ صدر کے واقعہ کا بھی حوالہ نہیں دیا، سر سید احمد خاں نے اپنے خطباتِ احمدیہ میں اس کی پرزور تردید کی، اور لکھا کہ عیسائی مصنف ایک بڑی غلطی میں پڑے ہیں، وہ اپنے یہاں کی مقدس کتابوں کو جن میں کتبِ تواریخ اور طوک اور قضاة وغیرہ داخل ہیں، اور تورات و انجیل کے ان تمام مقاموں کو جن میں تاریخی واقعات بیان ہوئے ہیں، بمنزلہ وحی یعنی کلامِ الہی کے برابر سمجھتے ہیں، اور ان سب کو ہر طرح کی غلطی اور خطا سے پاک جانتے ہیں، حالانکہ ان میں بہت سی غلطیاں پائی جاتی ہیں، اس طرح انھوں نے خیال کر لیا ہے کہ مسلمان بھی اپنی حدیثوں اور روایتوں کو ایسا ہی بے نقص سمجھتے ہوں گے، اور اس خیالِ خام سے انھوں نے مسلمانوں کی تمام حدیثوں کو ناقابلِ خطا تصور کر کے اسلام پر نہایت سخت طعن و تشنیع کی ہے، حالانکہ وہ خود بڑی غلطی میں پڑے ہیں، کیونکہ مسلمان اپنے یہاں کی روایات و احادیث کو اسی نظر سے دیکھتے ہیں، جیسے کہ اور تواریخ کے واقعات کو دیکھتے ہیں، اور ان کو یونہی ممکن الخطا خیال کرتے ہیں، مسلمان اپنے یہاں کی حدیثوں اور روایتوں کو اس وقت صحیح سمجھتے ہیں، جب ان کے لیے کافی ثبوت اور معتد سند پاتے ہیں، ورنہ ان کی کچھ بھی حقیقت نہیں سمجھتے، یہ روایتیں جو شرح السنہ اور دارمی میں مذکور ہیں، صحت سے بہت دور ہیں، بعض علمائے اسلام ان کو محض ناقابلِ اعتبار سمجھتے ہیں، اور یہود و مسلمانوں نے خیال کرتے ہیں، جو محض جہلاء کو خوش کرنے کیلئے گڑھے کیے ہیں، پس عیسائی مورخوں نے اس بات میں



بڑی غلطی کی ہے کہ ان معتبر روایتوں کی بنیاد پر اسلام پر اعتراض کیا ہے، دستخطات احمدیہ ۶۶۲-۶۶۵  
 سرسید نے یہ بات آج سے ۱۱۲ برس پہلے لکھی تھی، مگر یہ مستشرقین جن میں منٹگری واٹ بھی شامل  
 ہیں، دوسروں کی کتب میں بھی وہ تو اپنی سی کہنا جانتے ہیں، اسی طرح بھیر کی ملاقات کی روایت کو مولانا  
 شبلی نے بالکل ساقط الاعتبار قرار دیا، وہ مکرر فرماتے ہیں کہ:

سرولیم پیور، ڈریپر اور دیگر لوگوں وغیرہ سب اسی واقعہ کو عیسائیت کی فتح عظیم خیال کرتے ہیں،  
 اور اس بات کے مدعی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مذہب کے حقائق و اسرار اسی راہب سے سیکھے  
 اور چونکہ اس نے بتا دیئے تھے، اسی پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے عقائد اسلام کی بنیاد رکھی، اسلام  
 کے تمام عمدہ اصول ان ہی نکتوں کے شروع اور حواشی ہیں،

مولانا شبلی لکھتے ہیں، کہ بھیر کی ملاقات میں اس کی تعلیم کا کہیں ذکر نہیں ملتا، حقیقت یہ ہے کہ  
 اس ملاقات کی روایت ہی بالکل ناقابل اعتبار ہے، اس کے جس قدر طریقے ہیں، سب مرسل ہیں، راوی  
 اول واقعہ کے وقت خود موجود نہ تھا، اور اس راوی کا نام نہیں بیان کرتا، جو شریک واقعہ  
 تھا، (سیرۃ النبی ج ۱ ص ۸۰)

منٹگری واٹ نے ابن اسحاق کی ان روایتوں کو یکجا کر کے اپنی علمی تحقیق کا ثبوت دیا ہے، تو ان  
 کی یہ تحقیق سعی نامشکور ہے، اور ان کو نقل کر کے ان کی تضحیک کرنا مقصود ہے، تو مسلمان محققین کب  
 ان کو قابل اعتبار سمجھتے ہیں، جو ان کی تضحیک سے وہ متاثر ہو جائیں گے، یا اگر وہ واقعی ان کو اس لیے  
 مستند اور صحیح سمجھتے ہیں، کہ یہ ابن اسحاق کی روایتیں ہیں، تو پھر ابن اسحاق کی اگر ہر روایت اور ہر راوی  
 صحیح ہے تو ابن ہشام اور واقدی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور قرآن مجید کے کلام الہی ہونے  
 کے بھی قائل اور دعویٰ دار ہیں، پھر منٹگری واٹ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور قرآن مجید  
 کے الہامی کتاب ہونے کا قائل اسی طرح ہونا چاہیے، جس طرح ابن اسحاق، ابن ہشام اور واقدی  
 ہیں، یہ دیانت دارانہ تحقیق نہیں کہ ان کی جو رائے مصنف کی مطلب برآری کے لیے ہو، تو وہ نہ  
 اچھالی جائے اور جو ان کے لیے قابل قبول نہ ہو اس سے انکار کیا جائے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شادی کے وقت حضرت خدیجہؓ کی عمر چالیس برس کی تھی جب کہ آپ ۲۵ برس کے تھے، مصنف نے یہ لکھ کر نیش زنی کی ہے، کہ حضرت خدیجہؓ کی عمر بتانے میں شاید مبالغہ کیا گیا ہے، شاید یہ لکھ کر اپنے ظنیات کا ثبوت تو ضرور دے دیا ہے، اور اس طرح وہ اپنی ذمہ داری سے بھی ماہرانہ طور پر برأت کر سکتے ہیں، لیکن اگر یہ عمر بتانے میں مبالغہ سے کام لیا گیا ہے تو اس کی کوئی سند نہیں پیش کرتے، بلکہ یہ لکھتے ہیں کہ حضرت خدیجہؓ کے آٹھ اولاد ہوئی، اور اگر ہر سال ہوتی رہی تو آخری اولاد ان کے ۲۸ دین سن میں ہوتی، کھتے ہیں کہ یہ ناممکن بات نہیں، لیکن اس پر کافی رائے زنی ہو سکتی ہے ممکن ہے کہ اس کو اعجاز پر محمول کیا گیا ہو، لیکن ابن ہشام، ابن سعد اور طبری میں اس پر کوئی رائے زنی نہیں، پھر ہمارے مصنف کو رائے زنی کر کے چھڑ خانی کی کیا ضرورت تھی، اسی طرح محض قیاس کر کے یہ لکھنے کی کیا ضرورت تھی، کہ خدیجہؓ اتنی دولت مند نہیں رہی ہوں گی، جتنی کہ کہا جاتا ہے، اور پھر ان کے قیاسات پر مبنی ان کے استدلال کا یہ رنگ ہی کہ خیال ہے کہ محمدؐ کے پاس بڑی کافی سرمایہ ہو گیا ہوگا کیونکہ وہ تجارت میں معتدلانہ انداز میں چھوڑ لیتے رہے، اس کی کوئی سند نہیں ہے، کہ وہ شام پھر نہیں گئے، لیکن اس کے یہ معنی بھی نہیں کہ وہ شام نہیں گئے یا یہ ممکن ہے کہ اپنی تجارت کی نگرانی دوسروں کے ذمہ کر دی ہوگی، اس امکان کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے، کہ وہ تاجروں کے اندرونی حلقہ اور اس سود مند کاروبار سے بدر کر دیے گئے، لیکن یہ بھی سمجھنا صحیح نہیں کہ وہ بالکل بدر کر دیے گئے تھے کیونکہ انہوں نے اپنی لڑکی زینب کی شادی عبد شمس کے قبیلہ کے ایک رکن سے کی، جو خدیجہ کے بھتیجے تھے، ان کی دو لڑکیاں ابولہب کے لڑکوں سے منسوب تھیں، یہ اس لیے کہ ابولہب کے بارے میں خیال کیا جاتا تھا کہ شاید وہ بنو ہاشم کے مستقبل کا آدمی ہو، اس سے یہ بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ محمدؐ کو بھی قبیلہ کے ہونہار نوجوانوں میں تصور کیا جانے لگا تھا، ان قیاسات اور ظنیات کے مجموعے سے مصنف کے تحقیقی رنگ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی نازل ہوئی، اس کے متعلق آپ مصنف نے عجیب و غریب بحث چھیڑ دی ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی سے متعلق مسلمانوں کا جو عقیدہ ہے وہ بخاری شریف

کی اس حدیث سے ظاہر ہوگا کہ عبداللہ بن یوسف، مالک، ہشام بن عروہ کی ام المؤمنین سے روایت ہے، کہ  
 حارث بن ہشام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا، کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے  
 پاس وحی کس طرح آتی ہے، تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کبھی میرے پاس گھٹے کی آواز کی  
 طرح آتی ہے، اور وہ مجھ پر بہت سخت ہوتی ہے، اور جب یہ اسے یاد کر لیتا ہوں جو اس نے کہا تو وہ  
 حالت مجھ سے دور ہو جاتی ہے، اور کبھی فرشتہ آدمی کی صورت میں میرے پاس آتا ہے، اور مجھ سے  
 کلام کرتا ہے، اور جو وہ کہتا ہے، اسے میں یاد کر لیتا ہوں، پھر عاتشہ نے بیان کیا کہ میں نے سمت سر  
 کے دنوں میں آپ پر وحی نازل ہوتے ہوئے دیکھا، پھر جب اسے قوف ہو جاتی تو آپ کی پیشانی سے  
 پسینہ بہنے لگتا، کتاب الوحی باب ۱۰

اسی کے بعد اس پہلی وحی آئی کہ ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی، اس  
 پوری حدیث کا اردو ترجمہ یہ ہے:

”یحییٰ بن بکر، لیث بن عقیل، ابن شہاب، عروہ بن زبیر، ام المؤمنین حضرت عاتشہ سے روایت  
 کرتے ہیں، حضرت عاتشہ نے فرمایا کہ رب سے پہلے وحی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اتنا شروع ہوئی  
 وہ اچھے خواب تھے، جو بحالت خواب آپ دیکھتے تھے، چنانچہ جب طبی آپ خواب دیکھتے تو وہ صبح کی روشنی کی  
 طرح ظاہر ہو جاتا، پھر تنہائی سے آپ کو محبت ہونے لگی، اور غار حرا میں تنہا رہنے لگے، اور قبل اس کے کہ  
 گھر والوں کے یہاں آنے کا شوق ہو، وہاں تمننت کیا کرتے، تمننت سے مراد کئی رات عبادت کرنی ہے،  
 اور اس کے لیے توشہ لیتے، یہاں تک کہ جب وہ غار حرا میں تھے حق آیا، چنانچہ ان کے پاس فرشتہ آیا،  
 اور کہا پڑھ، آپ نے فرمایا کہ میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، آپ بیان کرتے ہیں کہ مجھے فرشتہ نے پکڑا، اور  
 مجھے زور سے دبا، یہاں تک کہ مجھے تکلیف محسوس ہوئی، پھر مجھ کو چھوڑ دیا، اور کہا پڑھ، میں نے کہا کہ  
 میں پڑھا ہوا نہیں ہوں، آپ فرماتے ہیں کہ پھر تیسری بار پکڑ کر مجھے زور سے دبا، پھر چھوڑ دیا، اور کہا  
 پڑھ، اس آیت ”بِسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ“ اور ”وَرَبُّكَ أَكْبَرُ“  
 رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو دہرایا، اس حال میں کہ آپ کا دل کانپ رہا تھا، چنانچہ حضرت



بنت خویلد کے پاس آئے، اور دوبار فرمایا کہ مجھے کہیں اور ہادو، تو لوگوں نے اور ہادو، یہاں تک کہ آپ کا ڈر جاتا رہا، حضرت خدیجہؓ سے سارا واقعہ بیان کر کے فرمایا کہ مجھے اپنی جان کا ڈر ہے، حضرت خدیجہؓ نے کہا کہ ہرگز نہیں، خدا کی قسم اللہ تعالیٰ آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا، آپ تو صلہ رحمی کرتے ہیں، ناتوانوں کا بوجھ اپنے اوپر لیتے ہیں، محتاجوں کے لیے کھاتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، اور حق کی راہ میں مہیبتیں اٹھاتے ہیں، پھر حضرت خدیجہؓ آپ کو لے کر ورقہ بن نوفل بن اسد بن عبدالغزی کے پاس گئیں، جو حضرت خدیجہؓ کے چچا زاد بھائی تھے، ایام جاہلیت میں نصرانی ہو گئے تھے، اور عبرانی کتاب لکھا کرتے تھے، چنانچہ انجیل کو عبرانی زبان میں لکھا کرتے تھے، جس قدر اللہ چاہتا، وہ نابینا اور بوٹھے ہو گئے تھے، ان سے حضرت خدیجہؓ نے کہا، اے میرے چچا زاد بھائی، اپنے بھتیجے کی بات سنو، آپ سے ورقہ نے کہا، اے میرے بھتیجے تم کیا دیکھتے ہو، تو جو کچھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا تھا، بیان کر دیا، ورقہ نے آپ سے کہا کہ یہی وہ نابینا ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰؑ پر نازل فرمایا تھا، کاش میں جوان ہوتا، کاش میں اس وقت تک زندہ رہتا، جب تمہاری قوم تمہیں نکال دیتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا وہ مجھے نکال دیں گے، ورقہ نے فرمایا ہاں جو چیز تو لے کر آیا ہے، اس طرح کی چیز جو بھی لے کر آیا، اس سے دشمنی کی گئی، اگر میں تیرا زمانہ پاؤں تو میں تیری پوری مدد کروں گا، پھر زیادہ زمانہ نہیں گذرا کہ ورقہ کا انتقال ہو گیا، اور وحی کا آنا کچھ دنوں کے لیے بند ہو گیا۔

ابن شہاب نے کہا مجھ سے ابو سلمہ بن عبدالرحمن نے بیان کیا کہ جابر بن عبد اللہ انصاری وحی کے رکنے کی حدیث بیان کر رہے تھے، تو اس حدیث میں بیان کیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بیان فرما رہے تھے، کہ ایک بار میں جا رہا تھا، تو آسمان سے ایک آواز سنی، نظر اٹھا کر دیکھا، تو وہی فرشتہ تھا جو میرے پاس حرام میں آیا تھا، آسمان و زمین کے درمیان کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، مجھ پر رعب طاری ہوا، اور واپس لوٹ کر میں نے کہا، مجھے کہیں اور ہادو، مجھے کہیں اور ہادو، تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی:

اے محمد!، جو کچھ اپنے پیڑھے ہو، اٹھو اور

يَا أَيُّهَا الْمَدَائِرُ قُمْ فَاذْرُوهُنَّ

فَكَرُّوا شَيْبًا بَكَ فَطَمِرُوا الرَّجْمَاءُ

فَاَهْجُرُوهُ (مشترکات ۵۵)

ہدایت کرو، اور اپنے پروردگار کی بڑائی

کرو اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو اور ناپاکی سے دور رہو

بھرو جی کا سلسلہ گرم ہو گیا، اور لگا آتار آنے لگی (بخاری شریف باب اقل)

بخاری شریف کے اس باب میں یہ حدیث یہاں پر ختم ہو جاتی ہے، دوسری جگہ کتاب التبعیر

میں بھی یہی حدیث نقل کی ہے، جس کے آخر میں کچھ فرق ملاحظہ ہے، اس کا اردو ترجمہ ملاحظہ ہو،

”بھر زیادہ زمانہ نہیں گذرا کہ ورقہ کا انتقال ہو گیا، اور وحی کا سلسلہ کچھ دنوں

کے لیے منقطع ہو گیا، (امام زہری فرماتے ہیں) جیسا کہ حدیثوں سے ہم کو معلوم ہوا ہے

وحی کا سلسلہ رک جانے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر غمگین اور رنجیدہ

ہوئے، کہ کئی مرتبہ آپ صبح کو اس ارادہ سے پہناڑوں پر گئے کہ اپنے آپ کو ان کی

چوٹی سے گرا دیں، جب آپ کسی چوٹی پر پہنچتے کہ اپنے آپ کو نیچے گرا دیں، تو حضرت

جبریل ظاہر ہوتے، اور فرماتے، اے محمد! بلاشبہ آپ خدا کے برحق رسول ہیں

یہ سن کر آپ کا قلق و اضطراب ختم ہو جاتا، اور دل مطمئن ہو جاتا، اور آپ واپس

تشریف لاتے، (بخاری کتاب التبعیر جلد دوم ص ۱۰۳۲ مطبوعہ کرزن پریس دہلی)

اس حدیث میں کوئی ایسی بات نہیں، جو اس لیے سمجھ میں نہ آئے کہ یہ گنجلک ہی، منگلی واٹ

نے اس حدیث کا سہارا لے کر بڑی گنجلک بحث چھیڑ دی ہے، مگر یہ حدیث بخاری شریف سے نہیں لی

بلکہ طبری سے لی ہے، یہ اس لیے طبری میں ان کی مطلب برآرمی اور چھیڑ چھاڑ کے لیے کچھ باتیں مل گئی ہیں

طبری نے ابن زہری ہی کے حوالہ سے یہ حدیث لکھی ہے، مگر اس کے لکھنے میں بخاری شریف کی حدیث

سے جو اختلاف پیدا ہو گیا ہے، وہ پڑھنے کے بعد ہی ظاہر ہوگا، مصنف نے اس کا جو انگریزی ترجمہ

دیا ہے، اس کا اردو ترجمہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے، مصنف نے اپنی بحث کی خاطر اس کو علیحدہ

علحدہ خانوں میں لکھا ہے،

۱۱، نعمان بن راشد زہری سے روایت کرتے ہیں، وہ عروہ سے اور عروہ حضرت عائشہ

سے روایت کرتے ہیں کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ وحی سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر روپائے صادقہ سے شروع ہوئی، جو صبح صادق کے مانند ہو کرتے تھے،

(ب) اس کے بعد آپ کو تنہائی محبوب ہو گئی، آپ غار حرا میں چلے جاتے، اور وہاں تخت میں کئی راتوں تک مشغول ہو جاتے، قبل اس کے کہ اپنے گھر والوں کے پاس واپس آتے، وہ ان کے پاس آتے اور سامان لے کر اسی طرح واپس ہو جاتے، یہاں تک کہ خلاف امید آپ کے پاس حق آیا، اور کہا کہ اے محمد آپ اللہ کے رسول ہیں، رج، انھوں نے یعنی محمد نے فرمایا کہ میں سوچ رہا تھا کہ میں اپنے کو پہاڑ کی چوٹی سے گر لوں، جب ایسا سوچ رہا تھا، تو وہ میرے سامنے نمودار ہوا، اور کہا اے محمد! میں جبریل ہوں، اور آپ اللہ کے رسول ہیں،

(د) تب اس نے کہا پڑھ، میں نے کہا میں پڑھ نہیں سکتا ہوں، محمد نے کہا تب اس نے مجھے پکڑا، اور تین بار بڑے زور سے دبوچا، یہاں تک کہ میں بے جان ہو گیا، تب اس نے کہا کہ پڑھ، اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ..... اور میں نے پڑھا،

(س) پھر میں خدیجہ کے پاس آیا، اور کہا مجھے اندیشہ ہے، اور پھر اپنا واقعہ بیان کیا، تب انھوں نے کہا، خوشخبری ہی ہو، خدا کی قسم، اللہ آپ کو پریشانی میں نہ ڈالے گا، آپ رشتہ داروں کے لیے بھلائی کرتے ہیں، آپ سچ بولتے ہیں، آپ امانت کو واپس کرتے ہیں، آپ تلکان برداشت کرتے ہیں، آپ مہمان نواز ہیں، اور حق کے حامیوں کی مدد کرتے ہیں،

(ص) پھر وہ مجھے ورقہ بن نوفل بن اسد کے پاس لے گئیں، اور ان سے کہا کہ اپنے بھائی کے لڑکے... کی سنیے، انھوں نے پوچھا تو میں نے اپنا واقعہ بیان کیا، تب انھوں نے کہا کہ یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰ بن عمران پر نازل ہوا، کاش میں جو ان ہوا



اور اس وقت تک زندہ رہتا، جب آپ کا قبیلہ آپ کو نکالے گا، میں نے کہا کہ کیا وہ مجھے نکال دے گا، انھوں نے کہا، جب کوئی آدمی ایسا پیام لایا جیسا آپ لائے ہیں، تو وہ اپنے دشمنوں سے ستائے بغیر نہیں رہا، اگر آپ کا وہ دن میرے سامنے آیا، تو میں آپ کی مدد پورے طور پر پورے زور سے کروں گا،

ع، اقر کے بعد قرآن کا جو پہلا حصہ میرے اوپر نازل ہوا، وہ یہ تھا،

وَالْقَلْبَ وَمَا يُنطَرُونَ

ن، قلم کی اور جو (اہل قلم) لکھتے ہیں

مَا أَنْتَ بِنِعْمَةِ رَبِّكَ بِمُنشِرُونَ

اس کی قسم، یا کہ داے محمد، تم اپنے

وَأِنَّ لَكَ لَأَجْرًا غَيْرَ مَمْنُونٍ

پروردگار کے فضل سے دیوانے نہیں

وَأَنْتَ لَعَلَىٰ خَلْقٍ عَظِيمٍ

ہو، اور تمہارے لیے اتنا اجر ہے

فَسَتُبْصِرُ وَيُبْصِرُونَ

اور اخلاق تمہارے بہت (عالی) ہیں

سو عنقریب تم بھی دیکھ لو گے، اور یہ

(قلم-اتا ۵)

کافر، بھی دیکھیں گے،

دغ، زہری بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آنا کچھ عرصہ

کے لیے بند ہو گیا، آپ بہت غمگین تھے، آپ پہاڑ کی بند چوٹیوں پر چڑھنے لگے تاکہ

وہاں سے گرائیں، لیکن جب وہ پہاڑ کی چوٹی پر پہنچے، تو جبریلؑ نمودار ہوئے، ادا

کہا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں، اس سے آپ کی بے حسنی دور ہو جاتی اور اپنے آپ

میں ہو جاتے،

دف، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بارے میں بیان کرتے اور کہا کہ میں

ایک روز ٹہل رہا تھا کہ میں نے اس فرشتہ کو دیکھا، جو میرے پاس حرام میں آتا تھا

وہ ایک کرسی پر تھا، جو آسمان اور زمین کے بیچ میں تھی، میں خوف زدہ ہوا، اور

کے پاس آیا، اور کہا مجھ کو ڈھانک دو،

دق، ہم نے آپ کو ڈھانک دیا، یعنی آپ کے اوپر دثر ڈال دیا، خدا نے اس پر یہ آیت اتاری۔ **يَا أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَأَنْذِرْ قَدْ كُنَّا بِنَبَأِك فَكَبَّرُوا بِكَ فَطَهَّرْنَا رَأْسَهُ** اور ڈھانک کر لپٹے والے اٹھ، نیردار کر، اپنے رب کی بڑائی کا اعلان کر، اور اپنے کپڑے پاک رکھ، رک، الزہری کا بیان ہے، آپ پر جو آیتیں پہلے اتریں، وہ **اقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ، خَلَقَ الْإِنْسَانَ مِنْ عَلَقٍ، اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ، الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ، عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَكْتُمُهُ**

منشگرمی واٹ اتنا لکھنے کے بعد یہ بھی تحریر کرتے ہیں، الزہری نے جو ابن شہاب کے نام سے بھی جانے جاتے تھے، یہ روایت بھی بیان کی ہے، کہ جابر بن عبد اللہ انصاری نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی کے رک جانے کے سلسلہ میں فرمایا کہ جب میں ٹہل رہا تھا، ..... یہاں تک لکھنے کے بعد مصنف لکھتے ہیں کہ اس روایت میں راوی کے بدلے ہوتے نام کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، اور یہ کہا گیا ہے کہ مجھے ڈھانکو، اور دثار اڑھا دیا گیا، یہاں پر مصنف نے پوری روایت نقل نہیں کی، پوری روایت یہ ہے،

”میں چیل قدمی کر رہا تھا، میں نے آسمان سے ایک آواز سنی، میں نے اپنا سر اٹھایا، تو وہی فرشتہ تھا، جو میرے پاس حرام آیا تھا، وہ ایک کرسی پر بیٹھا تھا، جو زمین اور آسمان کے درمیان تھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں، میں اس سے ڈرا، میں گھر آیا، اور کہا مجھے ڈھانکو، مجھے ڈھانکو، تو لوگوں نے مجھے چادر اڑھائی، پھر اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی:

یا ایُّھا المدثرُ قُمْ فَأَنْذِرْ  
دَبَّكَ فَكَبَّرْ وَتِيَابِكَ فَطَهِّرْ  
(مدثر - ۱ تا ۴)

اے (محمدؐ) جو کپڑے پہنے ہو اٹھو  
اور ہدایت کرو، اور اپنے پروردگار  
کی بڑائی کرو، اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھو

آپ فرماتے ہیں، کہ پھر وحی مسلسل آنے لگی،

اتنا کچھ حذف کرنے کے بعد مصنف کا بیان ہے، کہ جابر کے بیان سے تو معلوم ہوتا ہے، سورہ المدثر

پہلی وحی ہے، (پہلی ۱۴۰ - ۱۴۱)

اب سوال ہے کہ مصنف نے بخاری شریف کی روایت کے جو اسے طبری کا شمار کیوں کیا، بخاری شریف کے مصنف طبری کی متداولہ حدیثوں سے زیادہ مقبر اور مستند ہیں، بخاری شریف اور طبری دونوں کی روایت سے لے کر پہلے قرآنی آیتیں نازل ہوئیں، پھر کچھ دنوں وحی کا آغاز کیا پھر جب آئی تو پہلے اللہ تعالیٰ کی آیتیں نازل ہوئیں،

اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خواب کی بحث چھیڑ دیتے ہیں، کہتے ہیں کہ محمد کی نبوت کا آثار وہ پائے صادق سے ہوا، اور یہ بتاتے ہیں کہ خواب اور رویائے صادقہ میں فرق ہے اور وہ سورۃ والنجم کا ہمارا ایسے ہیں، جس کے انگریزی ترجمہ سے وہ خود گمراہ ہوئے ہیں، اور دوسروں کو بھی گمراہ کر دیا، اس سورہ میں رویائے صادقہ کا مطلق ذکر نہیں، بلکہ وحی کا لفظ آیا ہے، اس سورہ کی من آیاتوں کا انگریزی ترجمہ ہے ان کو ذیل میں نقل کر کے ہم اپنے ناظرین کے لیے اردو ترجمہ بھی دے رہے ہیں، جو مولانا مودودی کا کیا ہوا ہے،

قسم ہے آرزے کی جب کہ وہ غروب ہوا،  
تمہارا رفیق نہ بھٹکا ہے، نہ ہٹکا ہے، وہ  
اپنی خواہش نفس سے نہیں بولتا، یہ تو  
ایک وحی ہے، جو اس پر نازل کی جاتی  
ہے، زبردست قوت والے نے تعلیم  
دی ہے، جو بڑا صاحب حکمت ہے، وہ  
سامنے آکھڑا ہوا، جب کہ وہ بالائی افق  
پر تھا، پھر قریب آیا، اور اوپر معلق ہو گیا،  
یہاں تک کہ دو کمانوں کے برابر یا اس  
کچھ کم فاصلہ رہ گیا، تب اس نے اللہ کے

وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ مَا ضَلَّ  
صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ وَمَا يَنْطُوقُ  
عَبْرَ الْهَوَىٰ، إِنَّ هُوَ إِلَّا وُحْيٌ  
يُوحَىٰ عَلَيْهِ شَدِيدُ الْقُوَىٰ،  
ذُو مِرَّةٍ فَاسْتَوَىٰ وَهُوَ  
بِالْأُنْقُوبِ الْإِصْبَعُ، ثُمَّ دَنَا  
فَتَدَلَّىٰ ذَكَانَ قَابِ قَوْسَيْنِ  
أَوْ أَدْنَىٰ فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِكَ  
مَا أَوْحَىٰ، مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا  
رَأَىٰ، أَفَتَأْمُرُونَهُ عَلَىٰ مَا يَرَىٰ



بندے کو وحی پہنچائی تھی، نظر نے جو کچھ  
 دیکھا، دل نے اس میں جھوٹ نہیں مانتا  
 اب کیا تم اس چیز پر اس سے جھگڑتے ہو  
 جسے وہ آنکھوں سے دیکھتا ہے، اور  
 ایک مرتبہ پھر اس نے سجدہ المنتہی کے  
 پاس اس کو اترنے دیکھا، جہاں پاس  
 ہی جنت المادوی ہے، اس وقت سجدہ  
 پر چھارہ پاؤں، جو کچھ چھارہ پاؤں کا  
 چندھیائی، تہہ سے متجاوز ہوئی،  
 اور اس نے اپنے رب کی بڑی شانیں  
 دیکھیں،

وَلَقَدْ سَأَاهُ تَرْتِلاَ اَحْسَى  
 عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهَى، عِنْدَهَا  
 جَنَّةُ الْمَادَى، اِذْ يَنْشَى السِّدْرَةَ  
 مَا يَنْشَى مَا ذَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَعَى  
 لَقَدْ رَأَى مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ  
 الْكُبْرَى ۝

(النجم: دعوے ۱)

منٹگری نے جو انگریزی ترجمہ کیا ہے، اس میں مَا يَنْشَى عَنْ الْهَوَىٰ اِنْ هُوَ الْاَدْوَىٰ  
 یوحی کا کس قدر تعجب انگیز ترجمہ دیا ہے:

"It is nothing but a suggestion suggested"

لیکن جارج سیل نے اس کا یہ ترجمہ کیا ہے:

"Neither doth he speak of his own Will.

It is no other than a revelation whi-

-ch has been revealed unto him"

دونوں ترجموں میں کتنا فرق ہے، منٹگری کے ترجمے میں اور بائیں حذف کر دی گئی ہیں،

ترجمے کی آخری سطریں یہ ہیں:

He saw him too at a second descent.

by the sidra tree at the boundary,  
near which is the garden of abode.

When the sidra tree was strangely  
enveloped, the eye turned not aside,

nor passed its limits. verily he saw

one of the greatest signs of his lord.

ہمارے ناظرین کے سامنے اور پر قرآن مجید کی آیتیں ہیں، وہ دیکھ لیں کہ اوپر کا انگریزی  
ترجمہ کہاں تک صحیح ہے، چارج سٹی کا ترجمہ یہ ہے:

one mighty in power, Enveloped with  
understanding Taught it him and  
he appeared in the highest parts

of the horizon. After wards he appre-  
-ached the prophet, until he was

at a distance of two length or got  
nearer and he revealed unto his

servant that which he revealed. The

heart of Mohammad did not falsely

represent that which he saw. Will

ye therefore disputa with him

concerning that which he saw? He

also saw him another time by the

late tree beyond which there is no passing near it is the garden of eternal abode. When the late tree covered that which it covered, his eyesight turned not aside, neither did it wander, and he really beheld some of the greatest signs of the Lord.

منشگرمی نے بیچ کا وہ حصہ حذف کر دیا ہے، جس میں یہ ہے کہ اس نے اللہ کے بندے کو وحی پہنچائی جو وحی بھی اسے پہنچانی تھی، وہ وحی کے لفظ کو اس لیے نظر انداز کرنا چاہتے تھے کہ پھر یہ تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، کہ کلام پاک وحی کے ذریعہ نازل ہوا، اس کے بعد *or true vision, vision* کی بحث نہیں چل سکتی تھی، وہ اپنی بحث میں جو کچھ کہتے، ان کو کہنے کا حق تھا، مگر قرآن کی آیتوں کا سہارا لے کر اپنے دعویٰ کو مستحکم کرنے کی فکریں انھوں نے فریب اور تدلیس سے کام لیا، اور ایک ایسا ترجمہ پیش کیا، جس میں "وحی" کا ترجمہ ہی نہیں آنے پایا ہے، اگر انھوں نے نیک نیتی سے ترجمہ پر بھروسہ کیا ہے، تو ترجمہ کی نوعیت زیر بحث آجانی، جارج سیل نے کلام پاک کا ترجمہ کرتے وقت اپنے ترجمہ کے دیباچہ میں لکھا ہے، کہ یورپ کے زیادہ تر ترجمے قابلِ اعتبار نہیں ہیں،

منشگرمی واسطے قرآن مجید کا ایک غلط ترجمہ پیش کر کے یہ بحث بھی چھیڑ دی ہے کہ پیغمبر اسلام نے اس وقت اللہ کو یا جبریل کو دیکھا، وہ اس کو تسلیم کرتے ہیں کہ اس کے مفسرین ہی کہتے ہیں کہ اس وقت جبریل نمودار ہوئے تھے، جارج سیل نے بھی اپنے ترجمہ کے فٹ نوٹ میں لکھا ہے، لیکن منشگرمی واسطے کہتے ہیں، کہ یہ خیال کرنے کے وجوہ ہیں، خود محمد نے شروع میں ہی خیال کیا کہ وہ خدا کو دیکھ رہے ہیں، کیونکہ جبریل کا ذکر مدنی سورتوں سے پہلے نہیں آیا ہے، الیٰ عبیدہ کے معنی تو اللہ کا بندہ ہونا چاہیے، لیکن یہ ترکیب بھری (*awkward*) سی ہو جاتی ہے، جب تک فعل کے فاعل میں خدا لکھا



جائے، پھر حدیث میں جو ذکر ہے کہ حق آیا، اور کہا کہ اے محمد! آپ اللہ کے رسول ہیں، تو یہ حق سے  
خدا ہی مراد ہے، منگرمی واٹ یہ لکھنے کو تو لکھ گئے، لیکن انھوں نے جو عبارت نقل کی ہے، اس کا پورا  
جملہ یہ ہے کہ حق آیا اور کہا کہ اے محمد! آپ اللہ کے رسول ہیں، اگر حق سے مراد خدا ہے تو پھر یہ  
ہونا چاہیے کہ حق آیا اور کہا اے محمد! آپ ہمارے رسول ہیں، اور پھر جاہل کی تفسیر کا سہارا لے کر آگے  
جو کچھ کہتے ہیں، وہ اس قدر گنگناک ہو گیا ہے کہ اس کا سمجھنا آسان نہیں، کہ آخر وہ کہنا کیا چاہتے ہیں  
انہوں نے سورہ والنجم کی ایک آیت کے معنی بھی بدلنے کی کوشش کی ہے، مَا ذَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَفَا  
لَقَد دَايَ مِنْ آيَاتِ رَبِّهِ الْكُبْرَى کے معنی تو یہ ہیں کہ اس نے اپنے رب کی بڑی نشانیاں دکھیں  
مگر ان کا خیال ہے کہ اس کے معنی یہ بھی لے جاسکتے ہیں کہ محمد نے جو کچھ دیکھا، وہ خدا کے جمال اور عظمت  
کی نشانی دیکھی، ان کے مذکورہ بالا ترجمہ میں اس آیت مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَى کا ترجمہ نہیں ہے  
جس کے یہ معنی ہیں کہ نظر نے جو کچھ دیکھا، دل نے اس میں جھوٹ نہیں ملایا، مگر وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت  
شاید بعد میں بڑھا دی گئی، وہ شاید لکھنے میں بڑے ماہر ہیں، یہاں بھی اس عبارت سے فائدہ اٹھا  
ہے، یہ لکھ کر وہ یہ کہتے ہیں کہ اس سے اس بات کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے، کہ انھوں نے اپنی آنکھوں  
سے جو کچھ دیکھا تھا، اس کو ان کے دل نے اشاری صورت (Symbolic) میں دیکھا، مصنف نے  
معلوم نہیں یہ کہاں سے معلوم کر لیا، کہ محمد کا یہ خیال تھا، کہ انھوں نے شروع میں خدا کو دیکھا، اس  
پر وہ تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان کا یہ خیال بالکل صحیح تو نہ تھا، لیکن ایسا خیال کرنے میں انھوں نے  
غلطی بھی نہیں کی اس لیے ان کا خیال ہے کہ آیت کا یہ ترجمہ ہونا چاہیے، ان کے دل نے اس کو سمجھنے  
میں غلطی نہیں کی جو انھوں نے دیکھا، ان کو اصرار ہے کہ محمد نے جبریل کو نہیں دیکھا تھا، بلکہ خدا ہی کو  
دیکھا تھا، اگرچہ حضرت عائشہ کی اس روایت کا بھی حوالہ دیتے ہیں، کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا  
کو نہیں دیکھا تھا، اس روایت کے بعد مصنف کا یہ ثابت کرنا کہ محمد نے خدا کو دیکھا، کہاں تک صحیح ہے  
بات یہ ہے کہ مصنف شروع سے آخر تک اپنی تحریروں کے ذریعہ سے پُر فریب انداز میں دکھانا  
چاہتے ہیں، کہ کلام پاک، کلام الہی نہیں ہے، نہ یہ الہامی ہے، نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی

نازل ہوتی رہی، اس لیے سورہہ وانجم کی مذکورہ بالا آیتوں میں وحی کا لفظ جو دو بار آیا ہے، اس کو نظر انداز کر کے مصنف نے ایسے ترجمہ کو ترجیح دیا، جس میں وحی کا ترجمہ کرنے سے انحراف کیا گیا، اس لیے - *vision* *dream* *l'rise vision* اور آگے چل کر *Divine eruption* وغیرہ کی اصطلاحات کی گنجشک بحث کر کے اپنے ناظرین کے ذہن کو گنجشک بنانے کی کوشش کی، مورخانہ اور دیانت دارانہ تجزیہ تو تھا کہ وہ صاف صاف لکھتے کہ محمدؐ کے پیروں کا خیال ہے، کہ قرآن مجید کلام الہی ہے، جو وحی کے ذریعہ سے محمدؐ پر نازل ہوا، مگر اس کو یہودی اور عیسائی تسلیم نہیں کرتے، بات یہاں پر ختم ہو جاتی، پھر ان کو اسلام کا مورخانہ، ناقدانہ اور عاقلانہ مطالعہ کر کے اپنی تحریروں کا پشتا رہ نگارنے کا ضرورت نہ ہوتی، گذشتہ ۴۱ سو سال سے عیسائی مصنفین نے اسلام اور اس کے پیغمبر کے خلاف کتابوں پر کتابیں لکھ کر انبار لگا دیا ہے، مگر ان کے منشا کے مطابق مسلمان ان تحریروں سے متاثر ہو کر جو درجہ جو اسلام سے منحرف تو نہیں ہو رہے ہیں، بلکہ دنیا میں ان کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے، اور کہا عجیب کہ کسی زمانہ میں عیسائیوں سے زیادہ ان کی تعداد بڑھ جائے، اور اگر یہ کتابیں عیسائیوں کیلئے لکھی گئی ہیں، تو ان کے لیے ایسی کتابیں لکھی جائیں یا نہیں، وہ اپنے مذہبی عقیدہ کی بنا پر اسلام کے منکر اور مخالف بہر حال رہیں گے،

غابرا اور تخت کی بحث آتی ہے، تو مصنف ایک بار اپنے قیاسات بروئے کار لاتے ہیں، ایک

صفحہ کی بحث میں *Might be, must have been, hypothe*  
*tically, probably, evidently, may have, appa-*  
*rently, presumably, seem to have been.*

جیسے الفاظ کے سہارے اپنی مورخانہ تحقیق کا نمونہ پیش کیا ہے، پوری کتاب میں ایسے الفاظ کی بھرمار ہے، اور جتنی بار ان کا استعمال ہوا ہے، ان کو ایک ساتھ جمع کر دیا جائے، تو معلوم نہیں کتنے اوراق سیاہ کرنے پڑیں، وہ اسی قیاس آرائیوں کے ساتھ لکھتے ہیں، کہ محمدؐ غابرا میں مکہ کی گرمی سے بچنے کے لیے جاتے ہوں، یا یہودیوں اور عیسائیوں کے راہبوں سے متاثر ہو کر تنہائی کی تلاش

میں گئے ہوں، یاد ہاں عبادت کر کے اپنے گناہوں کی تلافی کرتے ہوں، پھر کھتے ہیں کہ وہ اپنی طور پر اس طرف ذہن کو منتقل کر لیا جاتا ہے کہ اس عزت نشینی میں *vision* ظاہر ہوا، لیکن محمد کی پکار کی تاریخیں غیر متعین ہیں، کبھی یہ خلاف امید ظاہر ہوتی، کبھی حدیجہ اس موقع پر زیادہ دور نہ ہوتی، اب اس تحریر سے اندازہ ہوگا کہ مصنف نے غائر حرکت کے تحت کی اہمیت کس طرح کم کرنے کی کوشش کی ہے۔

اس کے بعد آپ خدا کے رسول ہیں کے عنوان پر ڈیڑھ صفحہ کی بحث ہے، جس میں حسب معمول *perhaps* کا استعمال تین بار اور *probable* کا دو بار اور پھر *Must have, it would be natural to suppose, might be taken, presumably.*

دیگرہ کے الفاظ اور فقروں کا سہارا لیا گیا ہے، لکھتے ہیں کہ:

”یہ اغلب ہے کہ یہ الفاظ ”آپ خدا کے رسول ہیں“ ظاہری دیکھتے، ممکن ہے کہ یہ

خیالی بھی نہ رہے ہوں، بلکہ ذہنی رہے ہوں، یعنی یہ الفاظ انہوں نے کانوں سے

نہیں سنے، اور نہ یہ خیال کیا، کہ وہ سن رہے ہیں، بلکہ یہ الفاظ ابلاغ کا ذریعہ تھے،

جو ان کے پاس الفاظ کے بغیر بننے، الفاظ کی شکل دیا کے بعد دیدی گئی ہو، (ص ۴۶)

یہ قیاس صرف اس لیے ہے، کہ یہ ثابت کیا جائے کہ یہ سب کچھ وحی کے ذریعہ سے نازل نہیں

ہوا، قرآن کے الفاظ کو *exterior locution* اور *imaginative*

*locution* بلکہ *intellectual locution* یا *vision* یا *dream*

*divine irruption, intuition of creative imagin-*

*ation, irruption, divine imagination.*

دیگرہ جیسے الفاظ اور اصطلاحات کا سہارا لے کر ناظرین کو گمراہ کیا گیا ہے، نئے نئے الفاظ اور اصطلاحات

کے ذریعہ سے مصنف چاہے جس قسم کی بحث کریں، لیکن یہ کوئی نئی بحث نہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم



کے زمانے میں بھی اس قسم کی بحث چھڑی گئی تھی، قرآن مجید میں ہے:

”کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اسے خود تصنیف کر لیا ہے، کہو اگر تم اپنے اس الزام میں سچے ہو تو خود ایک سورہ اس جیسی تصنیف کر لاؤ، اور ایک خدا کو چھوڑ کر جس میں کو بلا سکتے ہو، مدد کے لیے بلا لو، اصل یہ ہے کہ جو چیز ان کے علم کی گرفت میں نہیں آتی، اور جس کا آل بھی ان کے سامنے نہیں آیا، اس کو انہوں نے (خواہ مخواہ اٹکل چو جھٹلایا) اسی طرح تو ان سے پہلے لوگ بھی جھٹلا چکے ہیں، پھر دیکھ لو ان ظالموں کا کیا انجام ہوا، ان میں کچھ لوگ ایمان لائیں گے، اور تیرا رب ان مفسدوں کو خوب جانتا ہے“

(یعنڈرون۔ یونس ص ۳)

یہی بات تکرار کے ساتھ کہی گئی، سورہ ہود میں ہے:

”کیا یہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے یہ کتاب خود گھڑ لی ہے، کہو اچھا یہ بات ہے تو اس جیسی گڑھی ہوئی دش سورتیں تم بنا لاؤ، اور اللہ کے سوا اور جو جو تمہارے معبود ہیں ان کو مدد کے لیے بلا سکتے ہو تو بلا لو، اگر تم انہیں معبود سمجھتے ہیں سچے ہو، اب اگر وہ (تمہارے معبود) تمہاری مدد کو نہیں پہنچتے، تو جان لو کہ یہ اللہ کے علم سے نازل ہوئی ہے، اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی حقیقی معبود نہیں ہے، پھر کیا تم اس امر حق کے آگے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہوئے (وما من دابة الا ہود۱۱ ص ۱)

خود قرآن مجید میں ہے، جب کہ حضرت موسیٰؑ کو کتاب دی گئی، تو اس پر بھی اسی قسم کا اعتراض ہوا

”تم اس سے پہلے موسیٰؑ کو بھی کتاب دے چکے ہیں، اور اس کے بارے میں بھی اختلاف کیا گیا تھا، جس طرح آج اس کتاب کے بارے میں کیا جا رہا ہے، جو تمہیں دی گئی ہے، اگر تیرے رب کی طرف سے ایک بات پہلے ہی طے نہ کر دی گئی ہوتی تو ان اختلاف کرنے والوں کے درمیان کبھی کا فیصلہ چکا دیا گیا ہوتا یہ واقعہ ہے کہ یہ لوگ اس کی طرف سے شک اور خلیجان میں پڑے ہوتے ہیں، اور یہ بھی

ہے کہ تیرا رب انھیں ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے گا اور یہ گناہ ان کی سب جہنم کی بات ہے، بس اسے پتہ تھا اور تمہارا ہے وہ ساتھی جو کہ کفر پناہ سے ایمان و طاعت کی طرف پلٹ آتے ہیں اٹھیک ٹھیک راہ راست

پیشانی پر اللہ عزوجل (مورد - ۱۱ - رکوع ۱۲)

مصنف نے وحی کی قسم کی بحث چھیڑ کر یہ سمجھنے پر مجبور کیا ہے، کہ دنیا میں کسی ایسی کتاب کا وجود نہیں جو وحی کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی، مسلمان کا عقیدہ یہ ہے کہ فرشتہ خدا کا پیغام لے کر سامنے آتا ہے، اور اس کے منہ سے وہ الفاظ ادا ہوتے ہیں، جن کو سن کر نبی محفوظ کر لیتا ہے اس کو وحی کہتے ہیں، قرآن پاک کا نزول اسی طریقہ سے ہوا ہے، وحی کی اور قسمیں بھی ہیں، جیسا کہ سورہ ہمشوری میں ہے کہ کسی آدمی کی یہ تاب نہیں کہ اللہ اس سے بات کرے، لیکن وحی سے یا پردہ کے پیچھے سے یا کسی قاصد کو بھیجے، تو وہ خدا کے حکم سے خدا جو چاہے، اس کو وحی کر دیتا ہے۔ (سیرۃ النبیؐ جلد چہارم ص ۶۴)

یہ مسلمانوں کا کھلا ہوا عقیدہ ہے، جس میں شاید، اغلب ہی، خیال ہے، ایسا ہو رہا ہوگا، وغیرہ جیسے الفاظ کا سہارا لینے کی ضرورت نہیں، اور مشکلمی واٹ جیسے مصنف کو حق نہیں ہے، کہ مسلمانوں کو مجبور کریں کہ وہ ایسے عقیدے کے قائل نہ ہوں، وہ ایک عیسائی یا عیسائیت کے ایک مبلغ ہونے کی حیثیت سے اسلام یا اور دوسرے مذاہب کے خلاف جتنا بھی چاہیں نہ ہرا گلیں، ان کو کوئی روک نہیں سکتا، لیکن اپنی تحریر کو عورت یا معروضی کہہ کر گمراہ نہ کریں، ورنہ ان کی طرف سے کھلی ہوئی دعوت ہوگی، کہ مسلمان ان ہی دلائل اور انہی الفاظ کے ساتھ عیسائیت کو بھی اسی طرح داغدار کریں، جس طرح وہ اسلام کو کرنا چاہتے ہیں،

بات یہ ہے کہ موجودہ انجیل کے الفاظ اللہ تعالیٰ کے نہیں سمجھے جاتے، تو پھر وہ قرآن کی برتری کو کیسے تسلیم کر سکتے ہیں کہ یہ کلام اللہ ہے، اسی لیے اپنی پرفریب تحریروں کے ذریعہ سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کے الفاظ نہیں ہیں، بلکہ خود رسول کے ہیں، مسلمانوں کا تو یہ عقیدہ ہے کہ توہرت، زبور اور انجیل سب وحی کے ذریعہ سے نازل کی گئیں، اسکی تصدیق قرآن مجید سے بھی ہوتی ہے، قرآن میں ہے - ہم نے اس سے پہلے موسیٰ کو کتاب دی تھی اور اسے بنی اسرائیل کا ذریعہ ہدایت بنایا تھا،

ہم چلنے داؤد کو زبور دی تھی،

ہم نے اس کو یعنی حضرت عیسیٰ کو انجیل عطا کی جس میں رہ نمائی اور دوستی تھی، (المائدہ - ۵)

پھر ایک عمومی بات اس طرح کی گئی ہے، کہ

”اے نبی تم سے پہلے بھی ہم نے انسانوں ہی کو رسول بنا کر بھیجا تھا، جن پر ہم وحی کیا کرتے

تھے، تم لوگ اگر علم نہیں رکھتے تو اہل کتاب سے پوچھ لو، (الانبیاء - ۲۱)

مستشرقین آج قرآن مجید کے متعلق جو کچھ کہہ رہے ہیں، وہ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے

زمانے میں بھی کہا گیا، قرآن مجید میں ہے:

رسولوں کو ہم نے اس کام کے سوا اور کسی غرض کے لیے نہیں بھیجا کہ وہ بشارت اور تنبیہ

کی خدمت انجام دیں، مگر کافروں کا یہ حال ہے کہ وہ باطل کے ہتھیار لے کر حق کو نیچا

دکھانے کی کوشش کرتے ہیں، اور انھوں نے میری آیات کو اور ان شبیہات کو جو انہیں

کی گئیں، مذاق بنالیا ہے، اور اس شخص سے پڑھ کر ظالم اور کون ہے جسے اس کے رب

کی آیات سنا کر نصیحت کی جائے، اور وہ ان سے منہ پھیرے، اور اس پر بڑے انجام

کو کھول جائے، جس کا سرد سامان اس نے اپنے لیے خود اپنے ہاتھوں کیلئے ہے، (جن

لوگوں نے یہ روش اختیار کی ہے) ان کے دلوں پر ہم نے غلاق چڑھا دی ہے، یہاں جو

انھیں قرآن کی بات سمجھنے نہیں دیتے، اور ان کے کانوں میں ہم نے گرانی پیدا کر دی

ہے، تم انھیں ہدایت کی طرف کتنا ہی بلاؤ، وہ اس حالت میں کبھی ہدایت نہ پائیں گے،

(سجاء الذی - ۱۵)

— (۱۵) (سجاء الذی) —



# علم حدیث اور مستشرقین

ڈاکٹر تاج الدین ندوی منظم، جامعہ العین، (راولپنڈی)

علم حدیث کے بارے میں مستشرقین اور مغربی تہذیب زدہ علماء کا موقف اس حقیقت پر امت مسلمہ کا اجماع ہے کہ اسلامی تاریخ کے اعتراضات، اعدائے کافرانہ کی تنقیدی جائزہ کے بنیادی پاراڈیگم میں قرآن کے بعد حدیث و سنت کو دوسرا مقام حاصل ہے، لیکن پاپی ہرمنیٹکس اور فریڈرک مینر کے فرقہ خدانے ہمیشہ اس مسئلہ حقیقت کے خلاف حدیث کو اس کے بلند مقام سے گرانے کی کوشش کی ہے، اور اس کے پس پشت اسلامی معاشرہ کے پورے ڈھانچہ کو تباہ کرنا اور اس میں انتشار اور اتار کی پیدا کرنے کا جذبہ کار فرما رہا ہے، اسلامی تہذیب و تمدن کے عمدہ روشن (جسے ہم عمدہ بنی عباس بھی کہہ سکتے ہیں) میں زنا دقتہ وغیرہ دشمنان اسلام نے اسلام کے خلاف جس طرح کی منظم سازشیں کیں، اسی طرح مستشرقین اور جدید مغربی تہذیب کے پروردہ ان کے ہم نوا آج بھی سرگرم عمل ہیں، اس لیے کہ آفتاب اسلام کی درخشاں کرنوں سے اعدائے اسلام کی نگاہیں جب خیرہ ہوتی ہیں، تو وہ فرط غیظ و غضب سے دیوانہ ہو کر قرآن، حدیث، اجتہاد اور اسلامی تاریخ و تمدن کا روشن چہرہ مسخ کرنے کے لیے کمر بستہ ہو جاتے ہیں، لیکن تاریخ شاہد ہے کہ فوراً ہمیشہ کفر کی حرکات پر خندہ زن رہا ہے، اور قانونِ فطرت کے مطابق حق و باطل کے معرکوں میں فتح ہمیشہ حق ہی کا مقدر رہی ہے،

اس افسوس ناک حقیقت کا ذکر کرنا ناگزیر ہے، کہ ہمارے بعض مسلمان تعلیم یافتہ حضرات بھی مستشرقین کی نام نہاد علمی تحقیقات اور دیسہ کاریوں کے فریب میں مبتلا ہو گئے ہیں، اس کا سبب یا تو اسلام کے سرچشمہ صحافی سے ان کی عدم واقفیت ہے، یا پھر ان کی فکر کی کج روی ہے جسے انہوں نے مستشرق اہل قلم کی آڑ میں پیش کیا ہے،

در اصل مستشرقین کو مغربی حکومتوں نے تحقیق و تالیف کے لیے کیسوا اور فارغ کر دیا ہے، اور انہیں ہر طرح کی سہولیات نیز تمام ممکن اہصول مراجع و مصادر فراہم کیے ہیں، ہر مستشرق کسی خاص فن کو اپنی خصوصی جولانگاہ قرار دے کر تاحیات اس میں مشغول و منہمک رہتا ہے، اس لیے مستشرقین جو کچھ بھی لکھتے ہیں، اسے علمی رنگ میں پیش کرتے ہیں، اور وہ اپنی تحقیقات کو بکثرت مطبوعہ اور مخطوطہ مراجع کے حوالوں سے مزین کرتے ہیں، اسی باعث انکی علمی تحقیقات مغربی تہذیب کے دلدادہ ہمارے تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے وجہ کشش بن جاتی ہیں، اور وہ اس کے کروڑوں میں آکر مستشرقین کے فنی کمالات اور علمی خلوص و دیانت پر صدائے تحسین و آفرین بلند کرنے لگتے ہیں، بالآخر وہ اس سے متاثر ہو کر اپنی علمی تالیفات میں ان گراہ کن آراء و نظریات کو بعینہ نقل کرنے میں فخر محسوس کرتے ہیں، اسلامی اور عربی فکر کے متعدد ممتاز مفکرین نے اپنے ملکوں سے باہر جا کر مستشرقین سے استفادہ کیا، یا انہیں، اپنے علمی و تعلیمی اداروں میں مدعو کر کے ان کے سامنے زانوئے تلمذتہ کیا ہے، یہاں وہ ہے کہ مستشرقین کی بکثرت تالیفات کے ترجموں سے اسلامی کتب خانے بھرے پڑے ہیں،

علوم اسلامیہ کے سلسلہ میں مستشرقین نے جو فکری کارنامے انجام دیئے ہیں، ان پر سبھی اور ایجابی دونوں طرح کی چھاپ ملتی ہے، اول الذکر نوعیت کے کارناموں میں انتہا پسندانہ دعوتی رنگ غالب ہی اور اسی سے بیمار نفوس میں اسلام اور اس کی تعلیمات کے خلاف عداوت کے جذبات کی تخم ریزی ہوتی ہے، ثانی الذکر نوعیت کے علمی کام معروضی انداز کے حامل اور بحث و تحقیق تک محدود رہتے ہیں، چنانچہ ہمارے علمائے اسلام کا معروف و معروف اس سلسلہ میں یہ ہے کہ جو امور اسلام کے عین مطابق ہوں، انہیں بعینہ برقرار رکھا جائے، اور ان کی قدر دانی کی جائے، اور جو چیزیں سلسلہ اسلامی حقایق کے خلاف ہیں، ان کی غلطیوں کی نشاندہی اور نتائج پر متنبہ کر دیا جائے چنانچہ جب ہم علم حدیث کی شہرہ آفاق تصنیف "مفتاح کنوز السنہ" پر احمد محمود شاہ کا مقدمہ پڑھتے ہیں تو اس میں معروف مستشرق (فنک) کے اس اہم علمی کارنامے کے لیے اس کی غیر معمولی محنت و جدوجہد کا پورا اعتراف ملتا ہے، مگر عین اسی مستشرق کے بارے میں "انسائیکلو پیڈیا آف اسلام" میں احمد محمود شاہ اپنے تعارفی مقالہ میں جگہ جگہ اس کا تعقب، تفسیح اور حاشیہ آرائی کرتے ہوئے ملتے ہیں، لیکن افسوس ناک بات یہ ہے کہ ہمارے تعلیم یافتہ مسلم طبقہ نے اپنے مستشرق اساتذہ کے آراء و افکار کو بغیر کسی تحقیق و تنقیح کے نہ صرف قبول کر لیا ہے، بلکہ علمی

تحقیق کے نام پر اپنے زبان و قلم سے ان کی نشر و اشاعت بہت پر جوش انداز میں کی ہے،  
ڈاکٹر احمد امین پر نقد | اس جماعت کے سرخیل ڈاکٹر احمد امین ہیں، جو "فجر الاسلام" "فضی الاسلام" اور "ظہر الاسلام"  
 جیسی مشہور کتابوں کے مصنف ہیں، انہوں نے اپنی تالیف "فجر الاسلام" میں حدیث و سنت کے موضوع پر بھی حق  
 باطل کی آمیزش کے ساتھ خیال آرائی کی ہے، اور اپنے مستشرق اساتذہ کے نقوش قدم کی اتباع کرتے ہوئے نہ صرف  
 اسلام کے مسلم حقائق کی تحریف بلکہ صحابہ کرام و تابعین عظام کی مقدس جماعت کے ساتھ ظلم و زیادتی کی کوشش  
 کی ہے، چنانچہ وہ رقمطراز ہیں:

علمائے جرح و تعدیل نے کچھ قواعد وضع کیے ہیں جن کی تفصیل کا یہاں موقع نہیں ہے،  
 مگر حق بات یہ ہے کہ انہوں نے نقد متین کی نسبت نقد اسناد کے ساتھ زیادہ اعتنا کیا ہے چنانچہ  
 اس نوعیت کا نقد بہت کم ملتا ہے، کہ مثلاً رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جو قول منسوب ہے  
 وہ ان حالات و ظروف سے مطابقت نہیں رکھتا ہے، جن میں وہ کہا گیا ہے، یا مسلم تاریخی واقعات  
 اس کے متناقض ہیں، یا عبارت حدیث دراصل ایک طرح کی فلسفیانہ تعبیر کلام ہے، یا یہ کہ حدیث  
 اپنے شرائط و قیود کے ساتھ متون فقہ سے زیادہ مشابہ ہے، چنانچہ محدثین نے اسناد الرجال کی  
 جرح و تعدیل میں جو غیر معمولی کاوش و محنت کی ہے، اس کے مقابلہ میں مذکورہ بالا امور کی طرف  
 عشر عشر بھی توجہ نہیں کی ہے، یہاں تک کہ امام بخاریؒ اپنی تمام جلالت و مرتبت اور وقت نظری  
 کے باوصف ایسی احادیث درج کرتے ہیں جن کے غیر صحیح ہونے پر حقائق روزگار اور تجربات  
 و مشاہدات دلالت کرتے ہیں، اس کا باعث یہ ہے کہ امام بخاریؒ کی ساری توجہ کا محور نقد رجال  
 رہا ہے، مثلاً درج ذیل دو حدیثیں

سوسال کے بعد روئے زمین پر کوئی شخص

زندہ نہ رہے گا،

جو شخص روزانہ سات عدد عجوہ کھجور کا ناشہ

کرے گا، اسے اس دن رات تک کوئی زہر پانچ

۱- لا یبقی علی ظہر الارض بعد ما

سنة نفس منقوسہ،

۲- من اصطر کل یوم سبع مہرات

من عجوۃ لہ یضربہ سنم ولا یسحر



ذالک الیوم الی اللیل، لہ نقصان نہیں ہو سکتا،

ڈاکٹر احمد امین کے مذکورہ بالا ارشادات کا حاصل دو امور ہیں:

۱۔ محدثین نے نقد حدیث کے جو قواعد مقرر کیے ہیں، ان کا نقد،

۲۔ احمد امین کے وضع کردہ قواعد نقد حدیث کے مطابق صحیح بخاری کی مذکورہ دو حدیثوں پر نقد،

اسناد مصطفیٰ سباعی نے لکھا ہے کہ احمد امین دراصل انکار حدیث کے سلسلہ میں مستشرقین کی معروف فکر

کے ایک بڑے داعی اور علمبردار تھے، اس لیے اگر انھوں نے اپنے مذکورہ الصدر خیالات میں مسلمہ تاریخی حقائق

سے انکار کیا ہے، تو یہ کوئی محل تعجب و حیرت نہیں ہے، واقعہ یہ ہے کہ علمائے اسلام نے حدیث و سنت کی

حفاظت اور اسے تحریف و تزییف کی ہر کوشش سے پاک و صاف رکھنے کے لیے جو جانکاوہ کاوشیں اور

غیر معمولی جدوجہد کی ہے، اس کی نظیر پوری علمی تاریخ میں مفقود ہے، بلاشبہ ماہرین جرح و تعدیل نے نقد

متن اور نقد اسناد دونوں کے ساتھ یکساں اعلیٰ کیا ہے، چنانچہ مصطلحات حدیث میں ہمارے علمائے

جو تالیفات یادگار چھوڑی ہیں، ان کے مطالعہ سے یہ حقیقت بخوبی منکشف ہو جاتی ہے، کہ سند حدیث کے ساتھ

متن حدیث بھی علمائے فن کی فکر و کاوش کا خصوصی جو لانگاہ رہی ہے، حقیقت یہ ہے کہ علم اصطلاح الحدیث

صرف اسناد کے مباحث پر ہی اکتفا نہیں کرتا، بلکہ وہ متن حدیث کے مسائل کو بھی شامل ہے، ظاہرین نظریہ

خیال کرتی ہے کہ نقادان حدیث نے متن حدیث سے زیادہ اسناد پر خصوصی توجہ منحطف کی ہے، لیکن دراصل یہ صرف

ایک واہمہ ہے، جو وقت نظری اور تحقیق علمی کی کسوٹی پر آنے کے بعد محض ایک خواب پریشان رہ جاتا ہے، بلا

ماہرین فن محدثین عظام کی علمی بحثیں حدیث کے متن و اسناد دونوں کے محور پر گردش کرتی ہیں، انھوں نے ضعیف سند کو

صحیح سے اور خبر موضوع کو غیر موضوع سے تمایز کرنے کے لیے کچھ علامات کا تعین کیا ہے، چنانچہ متن حدیث کی پرکھ

کے لیے آٹھ اور اسناد کے لیے چار علامتیں مقرر کی گئی ہیں،

اصل بات یہ ہے کہ نقد و جرح میں یہ فطرہ احتیاط اور شدت حزم مولف فجر الاسلام کو پسند نہیں آئی، کیونکہ

لے فجر الاسلام ص ۲۱۶-۲۱۸، الباعث الحثیث ص ۹، المنار لابن قیم ص ۱۲۰، تدریب الراوی ص ۱۸۰،

نوٹ:۔ ان کتابوں سے یہ علامات مستنبط ہیں،

ان کے مستشرق اسانہ کو بھی یہ چیز ناپسند تھی، چنانچہ اس باعث انہوں نے مذکورہ بالا تنقید قرآنی، مصروف کے خیال میں محدثوں کو نقد حدیث اور حدیث کی توثیق کرنا چاہیے تھا۔

۱۔ کیا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ان حالات و واقعات سے مطابقت رکھتے ہیں جن میں وہ کے گئے؟

۲۔ کیا ان حالات و واقعات ان کی تائید کرتے ہیں؟

۳۔ کیا حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مزاج و طبیعت کے خلاف ایک قسم کی فلسفیانہ تعبیر ہے؟

۴۔ کیا حدیث اپنے مشرکوں و شیوکے باعث متون فقہ سے زیادہ مشابہ ہے۔؟

اب ہم ذیل میں ڈاکٹر احمد امین کے وضع کردہ نقد حدیث کے "جدید قواعد" پر بالترتیب تفصیل سے بحث کرتے ہیں۔

۱۔ مولف فجر الاسلام کا یہ خیال صریحاً غلط ہے کہ "محدثین نے اس بات کی تحقیق نہیں کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب حدیثیں اپنے زمانے کے حالات سے مطابقت رکھتی ہیں یا نہیں۔" اس لیے کہ علمائے حدیث نے اس عیب کو متنب حدیث میں وضع حدیث کی علامات میں شمار کیا ہے، اس کی مثال میں یہ حدیث پیش کی جاتی ہے، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی شہادت اور حضرت معاذ بن ابی سفیان رضی اللہ عنہما کے خط کی بنیاد پر اپنی خیر برجزیہ مقرر کر کے انہیں بیگاری کی مشقت و صعوبت سے نجات دلا دی تھی، مگر تاریخ سے ثابت ہے کہ عام خیر تک نہ تو جزیرہ کی مشروعیت ہوئی تھی، اور نہ یہ معروف عام ہی تھا، بلکہ آیت جزیرہ کا نزول تو عام تبوک کے بعد ہوا ہے، پھر حضرت سعد بن معاذ اس سے قبل ہی غزوہ خندق میں راہی ملک بھارت گئے تھے، اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے موقع پر مشرف باسلام ہوئے، اس تفصیل سے معلوم ہوا کہ تاریخی حقائق نہ تو حدیث کی تردید کرتے ہیں، اور اس کو موضوع قرار دیتے ہیں،

اسی طرح کی ایک اور مثال حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی یہ حدیث ہے کہ "میں غسل خانے میں داخل ہوا تو دیکھا کہ وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تہنند باندھے بیٹھے ہوئے ہیں، میں نے آپ سے بات کرنی چاہی

۱۰، المنار لابن قیم ص ۳۷-۳۸، تذکرۃ الحفاظ للذہبی ص ۱۱۴،

تو ارشاد فرمایا: اے انس! اسی وجہ سے میرے لیے غسل خانے میں بغیر تہبند باندھے داخل ہونا حرام ہے، حالانکہ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کبھی غسل خانے میں نہیں گئے، اور نہ اس زمانے تک غسل خانے معروف ہی تھے،

۲۔ اگر تاریخی مسلمات و حقائق کسی حدیث کے مؤید نہیں ہیں، تو محدثین نے اسے کبھی علامات وضع میں شمار کیا ہے، اور اس کی مثال اہل نمبر پر جزیہ مقرر کرنے کے بارے میں مذکورۃ العذر حدیث ہے، علمائے جرح نے یہی بنیاد پر اس حدیث کو ناقابل قبول قرار دیا ہے کہ تاریخی حقائق اس کے خلاف ہیں، ایسی صورت میں احمد امین کی یہ سب سے قطعی لاٹھی پر مبنی ہے کہ محدثین نے نقد حدیث کے وقت اس اصول کو مدنظر نہیں رکھا ہے، کہ حوادث زمانہ اور تاریخی حقائق حدیث زیر بحث کی تائید کرتے ہیں یا کذب، ۹

۳۔ نقد حدیث کے لیے احمد امین کا وضع کردہ یہ اصول بھی اپنے اندر کوئی جدت و ندرت نہیں رکھتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معروف انداز تکلم کے خلاف طے والی بعض احادیث کو محض ایک فلسفیانہ تعبیر پر محمول کیا جانا چاہیے، کیونکہ ہمارے علمائے جرح و تعدیل نے اس اصول پر ”رکعت لفظ“ کے تحت بحث کی ہے، اس کا ضابطہ یہ ہے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس طرح کے کلام کے صدور کی ممکن نفی کر دی جائے، ما ابن جر عسقلانی کی رائے ہے کہ ”رکعت (یعنی پھر بن) میں اصل معنی کی رکعت ہے، چنانچہ جس حدیث میں اس کا وجود ہو گا وہ بلاشبہ موضوع قرار دی جائے گی، خواہ اس میں لفظی گھٹیا پن نہ ہو، اس لیے کہ پورا دین مجموعہ محاسن و فضائل ہے، اس میں کسی طرح کی پستی اور گھٹیا پن دین کے بنیادی مزاج کے خلاف ہی، اور اگر کسی حدیث میں صرف لفظی رکعت ملتی ہے، تو یہ اس کے موضوع قرار دینے کے لیے کافی نہیں، کیونکہ اس بات کا احتمال موجود ہے کہ راوی نے روایت بالمعنی کر کے اصل الفاظ حدیث تبدیل کر دیئے ہوں، ۱۰

۴۔ اب رہی یہ بات کہ احادیث اپنے شرائط و قیود کے باعث فقہی متون سے زیادہ مماثلت رکھتی ہیں، تو محدثین نے کسی حدیث کی صحت کے لیے اس بات کو شرط قرار دیا ہے، کہ وہ اس کے متعقب راوی کے ذاتی مسلک کی آغوش نہ ہو، یہی باعث فقہ و عقائد کے باب میں بکثرت احادیث کو رد کر دیا گیا ہے، کیونکہ وہ روایت کے شخصی مذاہب کی



مؤید ہیں، مثلاً یہ حدیث کہ بنی رجب پر غسل واجب ہو، کے لیے تین تین بار کلی کرنا اور ناک میں پانی ڈالنا فرض ہے، یا یہ حدیث کہ ”اگر کسی کپڑے میں ایک درہم کے برابر خون لگا ہو تو کپڑا دھو کر نماز کا اعادہ کر لیا جائے۔“ ابن ابوزری کا قول ہے کہ اس حدیث کی سند میں بکثرت مہول روایہ شامل ہیں۔ غرض اس طرح کی احادیث کو ماہرین فن نے یکسر موضوع قرار دیا ہے،

ڈاکٹر احمد امین کی اس رائے سے قطعی اتفاق نہیں کیا جاسکتا کہ ”امام بخاری اپنی تمام تر علوئے مرتبت اور وقت نظری کے باوصف ایسی احادیث نقل کرتے ہیں، جن کی عدم صحت پر حقائق روزگار اور تجربات و مشاہدات شاہد ہیں۔“ اس سلسلہ میں موصوف نے جن دو حدیثوں سے استدلال کیا ہے، وہ بجائے خود ان کی رائے کی معارض ہیں، حقیقت یہ ہے کہ ”لا یبقی علی ظہر الارض بعد مائتہ سنتہ نفس منقوسۃ“ والی حدیث صحیح ہے، امام بخاری کے علاوہ امام ابو داؤد اور ترمذی نے بھی اس کی تخریج کی ہے، نیز یہ حدیث مختلف طرق سے مروی ہے، اس کا منشا و حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ پیشین گوئی بیان کرنا ہے، کہ ستو سال گزرنے کے بعد عہد نبوت کا کوئی شخص روئے زمین پر زندہ باقی نہ رہے گا، درحقیقت یہ پیشین گوئی علامات نبوت میں شمار کیے جانے کے لائق ہے، کیونکہ تاریخ شاہد ہے کہ عہد رسالت کی فصل بہار ستو سال سے زیادہ باقی نہیں رہی، اور دیدار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے مشرف ہونے والی ایک ایک دیدہ روشن اس عرصہ میں ابدی نیند سو گئی۔

مذکورہ حدیث کا حاصل رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ کرام پر یہ حقیقت منکشف کرنا ہے کہ ان کو ہم سابقہ کی طرح طویل عمریں نصیب نہیں ہوں گی، اس لیے انہیں اس مختصر عرصہ حیات کو غنیمت جان کر عبادت و طاعت اور توشہ آخرت کی تیاری میں بیش از بیش ریاضت کرنی چاہیے، حدیث بالا میں کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے، جسے عقائذ زمانہ اور عام تجربہ و مشاہدہ کے خلاف کہا جاسکے، چنانچہ ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی رقمطراز ہیں کہ ”فی الواقع جو حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اہم معجزات میں شمار کیے جانے کے لائق ہے، وہ مولف فجر الاسلام کی نقد جدید کی منطق کے مطابق محض کذب و افتراء قرار پاتی ہے۔“

۱۰ تنزیہ الشریعۃ المرفوعہ ص ۶۷: امام بزار کا قول ہے کہ اس حدیث کی نکارت پر علماء کا اتفاق ہے، ۱۱ فیحاء ج ۲ ص ۶۷، ۱۲ تاویل مختلف الحدیث لابن قتیبہ ص ۱۱۹، ۱۳ السنۃ وما کانہا، التشریح الاسامی ص ۲۶۱،

اسی طرح دوسری حدیث "من اصبح کل یوم سبع تمرات لہ یضربہ مہم ولا یحضر ذلک الیوم الی الی" کی تخریج امام بخاری نے کتاب الطب میں کی ہے، مزید برآں امام مسلم اور امام احمد نے بھی اپنی کتابوں میں اسے نقل کیا ہے، اس حدیث کی شرح بعض علماء نے دوسری مفید احادیث کی روشنی میں کی ہے، اور اسے کھجور مدینہ کے ساتھ مختص کیا ہے، اور بعض نے اسے مطلق رکھا ہے، لیکن اکثر محدثین کے نزدیک یہ حدیث مدینہ کی عجوبہ کھجوروں کے ساتھ خاص ہے، ابن قیم کا بیان ہے کہ "مدینہ کی عجوبہ کھجور حجاز کی ہر نوع کی کھجوروں میں سب سے زیادہ مفید اور نفع بخش ہے، اور ویسے بھی کھجور اپنی گرم و تر تاثیر اور غذا میت کے عتبات سے تمام پھلوں پر فائق ہے، صبح تہار منہ کھانے سے اس کی تریاتی طاقت منہ کے کپڑوں کا فائدہ کرتی ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص پابندی کے ساتھ تہار منہ کھجور کھایا کرے، تو اس کے منہ میں کپڑوں کا مادہ خشک یا بالکل ختم ہو جائے گا،"

نہایت تعجب و حیرت کا مقام ہے کہ اگر بطراط و جالینوس وغیر کسی خاص خطہ کی کھجور ایک مخصوص مقدار میں کھانے کی یہی خصوصیات بیان کرتے تو دنیا کے تمام اطباء پورے یقین و اعتماد کے ساتھ اس فارمولے کو ہاتھوں ہاتھ لیتے، حالانکہ حکمائے عالم کا بیان صرف ظن و تخمین کی حیثیت رکھتا ہے، مگر جب صاحب وحی نے پورے اذعان و یقین اور قطعیت کے ساتھ کھجور کے خواص بیان کیے تو اسے قبول کرنے کے بجائے اس پر "تجربہ و مشاہدہ" کے خلاف ہونے کا اعتراف وارد کیا جاتا ہے، ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف "السنۃ و مکانتہا فی التشریح الاسلامی" میں احمد ابن کے تمام شبہات و اعتراضات کا نہایت مدلل طور پر علمی رد کیا ہے، چنانچہ اس سلسلہ میں کتاب مذکور کے صفحات ۲۰۳ تا ۲۱۲ کا مطالعہ نہایت افادیت کا حامل ہے،

اسی طرح ڈاکٹر احمد ابن "فجر الاسلام" کے صفحہ ۵۲۹ پر وضعیت حدیث کے آغاز و ارتقاء کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

"وضعیت کی حد و مقدار جاننے کے لیے اتنی دلیل کافی ہے، کہ امام احمد بن حنبل کے نزدیک

۱۵ البخاری ص ۱۳، ۱۴، ص ۱۶۱۸، مسند احمد بن ج ۲ حدیث ۲۲۲، ۲۲۳، ۲۲۴، ۲۲۵، ۲۲۶، ۲۲۷، ۲۲۸، ۲۲۹، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۳۳، ۲۳۴، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۳۷، ۲۳۸، ۲۳۹، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۲، ۲۴۳، ۲۴۴، ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۲۴۹، ۲۵۰، ۲۵۱، ۲۵۲، ۲۵۳، ۲۵۴، ۲۵۵، ۲۵۶، ۲۵۷، ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۰، ۲۶۱، ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴، ۲۶۵، ۲۶۶، ۲۶۷، ۲۶۸، ۲۶۹، ۲۷۰، ۲۷۱، ۲۷۲، ۲۷۳، ۲۷۴، ۲۷۵، ۲۷۶، ۲۷۷، ۲۷۸، ۲۷۹، ۲۸۰، ۲۸۱، ۲۸۲، ۲۸۳، ۲۸۴، ۲۸۵، ۲۸۶، ۲۸۷، ۲۸۸، ۲۸۹، ۲۹۰، ۲۹۱، ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۹۴، ۲۹۵، ۲۹۶، ۲۹۷، ۲۹۸، ۲۹۹، ۳۰۰، ۳۰۱، ۳۰۲، ۳۰۳، ۳۰۴، ۳۰۵، ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸، ۳۰۹، ۳۱۰، ۳۱۱، ۳۱۲، ۳۱۳، ۳۱۴، ۳۱۵، ۳۱۶، ۳۱۷، ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۲۰، ۳۲۱، ۳۲۲، ۳۲۳، ۳۲۴، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۷، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۰، ۳۳۱، ۳۳۲، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۶، ۳۳۷، ۳۳۸، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۱، ۳۴۲، ۳۴۳، ۳۴۴، ۳۴۵، ۳۴۶، ۳۴۷، ۳۴۸، ۳۴۹، ۳۵۰، ۳۵۱، ۳۵۲، ۳۵۳، ۳۵۴، ۳۵۵، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۵۸، ۳۵۹، ۳۶۰، ۳۶۱، ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴، ۳۶۵، ۳۶۶، ۳۶۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۰، ۳۷۱، ۳۷۲، ۳۷۳، ۳۷۴، ۳۷۵، ۳۷۶، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۲، ۳۸۳، ۳۸۴، ۳۸۵، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۸۸، ۳۸۹، ۳۹۰، ۳۹۱، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۴، ۳۹۵، ۳۹۶، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۹، ۴۰۰، ۴۰۱، ۴۰۲، ۴۰۳، ۴۰۴، ۴۰۵، ۴۰۶، ۴۰۷، ۴۰۸، ۴۰۹، ۴۱۰، ۴۱۱، ۴۱۲، ۴۱۳، ۴۱۴، ۴۱۵، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۱۸، ۴۱۹، ۴۲۰، ۴۲۱، ۴۲۲، ۴۲۳، ۴۲۴، ۴۲۵، ۴۲۶، ۴۲۷، ۴۲۸، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۳۱، ۴۳۲، ۴۳۳، ۴۳۴، ۴۳۵، ۴۳۶، ۴۳۷، ۴۳۸، ۴۳۹، ۴۴۰، ۴۴۱، ۴۴۲، ۴۴۳، ۴۴۴، ۴۴۵، ۴۴۶، ۴۴۷، ۴۴۸، ۴۴۹، ۴۵۰، ۴۵۱، ۴۵۲، ۴۵۳، ۴۵۴، ۴۵۵، ۴۵۶، ۴۵۷، ۴۵۸، ۴۵۹، ۴۶۰، ۴۶۱، ۴۶۲، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۶۵، ۴۶۶، ۴۶۷، ۴۶۸، ۴۶۹، ۴۷۰، ۴۷۱، ۴۷۲، ۴۷۳، ۴۷۴، ۴۷۵، ۴۷۶، ۴۷۷، ۴۷۸، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۱، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴، ۴۸۵، ۴۸۶، ۴۸۷، ۴۸۸، ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۵، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۴۹۹، ۵۰۰، ۵۰۱، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۴، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۰۹، ۵۱۰، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۴، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۲، ۵۲۳، ۵۲۴، ۵۲۵، ۵۲۶، ۵۲۷، ۵۲۸، ۵۲۹، ۵۳۰، ۵۳۱، ۵۳۲، ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۳۵، ۵۳۶، ۵۳۷، ۵۳۸، ۵۳۹، ۵۴۰، ۵۴۱، ۵۴۲، ۵۴۳، ۵۴۴، ۵۴۵، ۵۴۶، ۵۴۷، ۵۴۸، ۵۴۹، ۵۵۰، ۵۵۱، ۵۵۲، ۵۵۳، ۵۵۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، ۵۶۰، ۵۶۱، ۵۶۲، ۵۶۳، ۵۶۴، ۵۶۵، ۵۶۶، ۵۶۷، ۵۶۸، ۵۶۹، ۵۷۰، ۵۷۱، ۵۷۲، ۵۷۳، ۵۷۴، ۵۷۵، ۵۷۶، ۵۷۷، ۵۷۸، ۵۷۹، ۵۸۰، ۵۸۱، ۵۸۲، ۵۸۳، ۵۸۴، ۵۸۵، ۵۸۶، ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰، ۵۹۱، ۵۹۲، ۵۹۳، ۵۹۴، ۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۵۹۸، ۵۹۹، ۶۰۰، ۶۰۱، ۶۰۲، ۶۰۳، ۶۰۴، ۶۰۵، ۶۰۶، ۶۰۷، ۶۰۸، ۶۰۹، ۶۱۰، ۶۱۱، ۶۱۲، ۶۱۳، ۶۱۴، ۶۱۵، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۸، ۶۱۹، ۶۲۰، ۶۲۱، ۶۲۲، ۶۲۳، ۶۲۴، ۶۲۵، ۶۲۶، ۶۲۷، ۶۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۶۳۱، ۶۳۲، ۶۳۳، ۶۳۴، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۳۷، ۶۳۸، ۶۳۹، ۶۴۰، ۶۴۱، ۶۴۲، ۶۴۳، ۶۴۴، ۶۴۵، ۶۴۶، ۶۴۷، ۶۴۸، ۶۴۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳، ۶۵۴، ۶۵۵، ۶۵۶، ۶۵۷، ۶۵۸، ۶۵۹، ۶۶۰، ۶۶۱، ۶۶۲، ۶۶۳، ۶۶۴، ۶۶۵، ۶۶۶، ۶۶۷، ۶۶۸، ۶۶۹، ۶۷۰، ۶۷۱، ۶۷۲، ۶۷۳، ۶۷۴، ۶۷۵، ۶۷۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۰، ۶۸۱، ۶۸۲، ۶۸۳، ۶۸۴، ۶۸۵، ۶۸۶، ۶۸۷، ۶۸۸، ۶۸۹، ۶۹۰، ۶۹۱، ۶۹۲، ۶۹۳، ۶۹۴، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۸، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲، ۷۰۳، ۷۰۴، ۷۰۵، ۷۰۶، ۷۰۷، ۷۰۸، ۷۰۹، ۷۱۰، ۷۱۱، ۷۱۲، ۷۱۳، ۷۱۴، ۷۱۵، ۷۱۶، ۷۱۷، ۷۱۸، ۷۱۹، ۷۲۰، ۷۲۱، ۷۲۲، ۷۲۳، ۷۲۴، ۷۲۵، ۷۲۶، ۷۲۷، ۷۲۸، ۷۲۹، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۳، ۷۳۴، ۷۳۵، ۷۳۶، ۷۳۷، ۷۳۸، ۷۳۹، ۷۴۰، ۷۴۱، ۷۴۲، ۷۴۳، ۷۴۴، ۷۴۵، ۷۴۶، ۷۴۷، ۷۴۸، ۷۴۹، ۷۵۰، ۷۵۱، ۷۵۲، ۷۵۳، ۷۵۴، ۷۵۵، ۷۵۶، ۷۵۷، ۷۵۸، ۷۵۹، ۷۶۰، ۷۶۱، ۷۶۲، ۷۶۳، ۷۶۴، ۷۶۵، ۷۶۶، ۷۶۷، ۷۶۸، ۷۶۹، ۷۷۰، ۷۷۱، ۷۷۲، ۷۷۳، ۷۷۴، ۷۷۵، ۷۷۶، ۷۷۷، ۷۷۸، ۷۷۹، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۲، ۷۸۳، ۷۸۴، ۷۸۵، ۷۸۶، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۸۹، ۷۹۰، ۷۹۱، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۴، ۷۹۵، ۷۹۶، ۷۹۷، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۰۱، ۸۰۲، ۸۰۳، ۸۰۴، ۸۰۵، ۸۰۶، ۸۰۷، ۸۰۸، ۸۰۹، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۲، ۸۱۳، ۸۱۴، ۸۱۵، ۸۱۶، ۸۱۷، ۸۱۸، ۸۱۹، ۸۲۰، ۸۲۱، ۸۲۲، ۸۲۳، ۸۲۴، ۸۲۵، ۸۲۶، ۸۲۷، ۸۲۸، ۸۲۹، ۸۳۰، ۸۳۱، ۸۳۲، ۸۳۳، ۸۳۴، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۳۸، ۸۳۹، ۸۴۰، ۸۴۱، ۸۴۲، ۸۴۳، ۸۴۴، ۸۴۵، ۸۴۶، ۸۴۷، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۲، ۸۵۳، ۸۵۴، ۸۵۵، ۸۵۶، ۸۵۷، ۸۵۸، ۸۵۹، ۸۶۰، ۸۶۱، ۸۶۲، ۸۶۳، ۸۶۴، ۸۶۵، ۸۶۶، ۸۶۷، ۸۶۸، ۸۶۹، ۸۷۰، ۸۷۱، ۸۷۲، ۸۷۳، ۸۷۴، ۸۷۵، ۸۷۶، ۸۷۷، ۸۷۸، ۸۷۹، ۸۸۰، ۸۸۱، ۸۸۲، ۸۸۳، ۸۸۴، ۸۸۵، ۸۸۶، ۸۸۷، ۸۸۸، ۸۸۹، ۸۹۰، ۸۹۱، ۸۹۲، ۸۹۳، ۸۹۴، ۸۹۵، ۸۹۶، ۸۹۷، ۸۹۸، ۸۹۹، ۹۰۰، ۹۰۱، ۹۰۲، ۹۰۳، ۹۰۴، ۹۰۵، ۹۰۶، ۹۰۷، ۹۰۸، ۹۰۹، ۹۱۰، ۹۱۱، ۹۱۲، ۹۱۳، ۹۱۴، ۹۱۵، ۹۱۶، ۹۱۷، ۹۱۸، ۹۱۹، ۹۲۰، ۹۲۱، ۹۲۲، ۹۲۳، ۹۲۴، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷، ۹۲۸، ۹۲۹، ۹۳۰، ۹۳۱، ۹۳۲، ۹۳۳، ۹۳۴، ۹۳۵، ۹۳۶، ۹۳۷، ۹۳۸، ۹۳۹، ۹۴۰، ۹۴۱، ۹۴۲، ۹۴۳، ۹۴۴، ۹۴۵، ۹۴۶، ۹۴۷، ۹۴۸، ۹۴۹، ۹۵۰، ۹۵۱، ۹۵۲، ۹۵۳، ۹۵۴، ۹۵۵، ۹۵۶، ۹۵۷، ۹۵۸، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۱، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۵، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۶۸، ۹۶۹، ۹۷۰، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۴، ۹۷۵، ۹۷۶، ۹۷۷، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۲، ۹۸۳، ۹۸۴، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۷، ۹۸۸، ۹۸۹، ۹۹۰، ۹۹۱، ۹۹۲، ۹۹۳، ۹۹۴، ۹۹۵، ۹۹۶، ۹۹۷، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۶، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۴، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰، ۱۰۲۱، ۱۰۲۲، ۱۰۲۳، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۷، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲، ۱۰۳۳، ۱۰۳۴، ۱۰۳۵، ۱۰۳۶، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۴۳، ۱۰۴۴، ۱۰۴۵، ۱۰۴۶، ۱۰۴۷، ۱۰۴۸، ۱۰۴۹، ۱۰۵۰، ۱۰۵۱، ۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۵، ۱۰۵۶، ۱۰۵۷، ۱۰۵۸، ۱۰۵۹، ۱۰۶۰، ۱۰۶۱، ۱۰۶۲، ۱۰۶۳، ۱۰۶۴، ۱۰۶۵، ۱۰۶۶، ۱۰۶۷، ۱۰۶۸، ۱۰۶۹، ۱۰۷۰، ۱۰۷۱، ۱۰۷۲، ۱۰۷۳، ۱۰۷۴، ۱۰۷۵، ۱۰۷۶، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۷۹، ۱۰۸۰، ۱۰۸۱، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴، ۱۰۸۵، ۱۰۸۶، ۱۰۸۷، ۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳، ۱۰۹۴، ۱۰۹۵، ۱۰۹۶، ۱۰۹۷، ۱۰۹۸، ۱۰۹۹، ۱۱۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۲، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۶، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸، ۱۱۰۹، ۱۱۱۰، ۱۱۱۱، ۱۱۱۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۴، ۱۱۱۵، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷، ۱۱۱۸، ۱۱۱۹، ۱۱۲۰، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۳، ۱۱۲۴، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶، ۱۱۲۷، ۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۰، ۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۵، ۱۱۳۶، ۱۱۳۷، ۱۱۳۸، ۱۱۳۹، ۱۱۴۰، ۱۱۴۱، ۱۱۴۲، ۱۱۴۳، ۱۱۴۴، ۱۱۴۵، ۱۱۴۶، ۱۱۴۷، ۱۱۴۸، ۱۱۴۹، ۱۱۵۰، ۱۱۵۱، ۱۱۵۲، ۱۱۵۳، ۱۱۵۴، ۱۱۵۵، ۱۱۵۶، ۱۱۵۷، ۱۱۵۸، ۱۱۵۹، ۱۱۶۰، ۱۱۶۱، ۱۱۶۲، ۱۱۶۳، ۱۱۶۴، ۱۱۶۵، ۱۱۶۶، ۱۱۶۷، ۱۱۶۸، ۱۱۶۹، ۱۱۷۰، ۱۱۷۱، ۱۱۷۲، ۱۱۷۳، ۱۱۷۴، ۱۱۷۵، ۱۱۷۶، ۱۱۷۷، ۱۱۷۸، ۱۱۷۹، ۱۱۸۰، ۱۱۸۱، ۱۱۸۲، ۱۱۸۳، ۱۱۸۴، ۱۱۸۵، ۱۱۸۶، ۱۱۸۷، ۱۱۸۸، ۱۱۸۹، ۱۱۹۰، ۱۱۹۱، ۱۱۹۲، ۱۱۹۳، ۱۱۹۴، ۱۱۹۵، ۱۱۹۶، ۱۱۹۷، ۱۱۹۸، ۱۱۹۹، ۱۲۰۰، ۱۲۰۱، ۱۲۰۲، ۱۲۰۳، ۱۲۰۴، ۱۲۰۵، ۱۲۰۶، ۱۲۰۷، ۱۲۰۸، ۱۲۰۹، ۱۲۱۰، ۱۲۱۱، ۱۲۱۲، ۱۲۱۳، ۱۲۱۴، ۱۲۱۵، ۱۲۱۶، ۱۲۱۷، ۱۲۱۸، ۱۲۱۹، ۱۲۲۰، ۱۲۲۱، ۱۲۲۲، ۱۲۲۳، ۱۲۲۴، ۱۲۲۵، ۱۲۲۶، ۱۲۲۷، ۱۲۲۸، ۱۲۲۹، ۱۲۳۰، ۱۲۳۱، ۱۲۳۲، ۱۲۳۳، ۱۲۳۴، ۱۲۳۵، ۱۲۳۶، ۱۲۳۷، ۱۲۳۸، ۱۲۳۹، ۱۲۴۰، ۱۲۴۱، ۱۲۴۲، ۱۲۴۳، ۱۲۴۴، ۱۲۴۵، ۱۲۴۶، ۱۲۴۷، ۱۲۴۸، ۱۲۴۹، ۱۲۵۰، ۱۲۵۱، ۱۲۵۲، ۱۲۵۳، ۱۲۵۴، ۱۲۵۵، ۱۲۵۶، ۱۲۵۷، ۱۲۵۸، ۱۲۵۹، ۱۲۶۰، ۱۲۶۱، ۱۲۶۲، ۱۲۶۳، ۱۲۶۴، ۱۲۶۵، ۱۲۶۶، ۱۲۶۷، ۱۲۶۸، ۱۲۶۹، ۱۲۷۰، ۱۲۷۱، ۱۲۷۲، ۱۲۷۳، ۱۲۷۴، ۱۲۷۵، ۱۲۷۶، ۱۲۷۷، ۱۲۷۸، ۱۲۷۹، ۱۲۸۰، ۱۲۸۱، ۱۲۸۲، ۱۲۸۳، ۱۲۸۴، ۱۲۸۵، ۱۲۸۶، ۱۲۸۷، ۱۲۸۸، ۱۲۸۹، ۱۲۹۰، ۱۲۹۱، ۱۲۹۲، ۱۲۹۳، ۱۲۹۴، ۱۲۹۵، ۱۲۹۶، ۱۲۹۷، ۱۲۹۸، ۱۲۹۹، ۱۳۰۰، ۱۳۰۱، ۱۳۰۲، ۱۳۰۳، ۱۳۰۴، ۱۳۰۵، ۱۳۰۶، ۱۳۰۷، ۱۳۰۸، ۱۳۰۹، ۱۳۱۰، ۱۳۱۱، ۱۳۱۲، ۱۳۱۳، ۱۳۱۴، ۱۳۱۵، ۱۳۱۶، ۱۳۱۷، ۱۳۱۸، ۱۳۱۹، ۱۳۲۰، ۱۳۲۱، ۱۳۲۲، ۱۳۲۳، ۱۳۲۴، ۱۳۲۵، ۱۳۲۶، ۱۳۲۷، ۱۳۲۸، ۱۳۲۹، ۱۳۳۰، ۱۳۳۱، ۱۳۳۲، ۱۳۳۳، ۱۳۳۴، ۱۳۳۵، ۱۳۳۶، ۱۳۳۷، ۱۳۳۸، ۱۳۳۹، ۱۳۴۰، ۱۳۴۱، ۱۳۴۲، ۱۳۴۳، ۱۳۴۴، ۱۳۴۵، ۱۳۴۶، ۱۳۴۷، ۱۳۴۸، ۱۳۴۹، ۱۳۵۰، ۱۳۵۱، ۱۳۵۲، ۱۳۵۳، ۱۳۵۴، ۱۳۵۵، ۱۳۵۶، ۱۳۵۷، ۱۳۵۸، ۱۳۵۹، ۱۳۶۰، ۱۳۶۱، ۱۳۶۲، ۱۳۶۳، ۱۳۶۴، ۱۳۶۵، ۱۳۶۶، ۱۳۶۷، ۱۳۶۸، ۱۳۶۹، ۱۳۷۰، ۱۳۷۱، ۱۳۷۲، ۱۳۷۳، ۱۳۷۴، ۱۳۷۵، ۱۳۷۶، ۱۳۷۷، ۱۳۷۸، ۱۳۷۹، ۱۳۸۰، ۱۳۸۱، ۱۳۸۲، ۱۳۸۳، ۱۳۸۴، ۱۳۸۵، ۱۳۸۶، ۱۳۸۷، ۱۳۸۸، ۱۳۸۹، ۱۳۹۰، ۱۳۹۱، ۱۳۹۲، ۱۳۹۳، ۱۳۹۴، ۱۳۹۵، ۱۳۹۶، ۱۳۹۷، ۱۳۹۸، ۱۳۹۹، ۱۴۰۰، ۱۴۰۱، ۱۴۰۲، ۱۴۰۳، ۱۴۰۴، ۱۴۰۵، ۱۴۰۶، ۱۴۰۷، ۱۴۰۸، ۱۴۰۹، ۱۴۱۰، ۱۴۱۱، ۱۴۱۲، ۱۴۱۳، ۱۴۱۴، ۱۴۱۵، ۱۴۱۶، ۱۴۱۷، ۱۴۱۸، ۱۴۱۹، ۱۴۲۰، ۱۴۲۱، ۱۴۲۲، ۱۴۲۳، ۱۴۲۴، ۱۴۲۵، ۱۴۲۶، ۱۴۲۷، ۱۴۲۸، ۱۴۲۹، ۱۴۳۰، ۱۴۳۱، ۱۴۳۲، ۱۴۳۳، ۱۴۳۴، ۱۴۳۵، ۱۴۳۶، ۱۴۳۷، ۱۴۳۸، ۱۴۳۹، ۱۴۴۰، ۱۴۴۱، ۱۴۴۲، ۱۴۴۳، ۱۴۴۴، ۱۴۴۵، ۱۴۴۶، ۱۴۴۷، ۱۴۴۸، ۱۴۴۹، ۱۴۵۰، ۱۴۵۱، ۱۴۵۲، ۱۴۵۳، ۱۴۵۴، ۱۴۵۵، ۱۴۵۶، ۱۴۵۷، ۱۴۵۸، ۱۴۵۹، ۱۴۶۰، ۱۴۶۱، ۱۴۶۲، ۱۴۶۳، ۱۴۶۴، ۱۴۶۵، ۱۴۶۶، ۱۴۶۷، ۱۴۶۸، ۱۴۶۹، ۱۴۷۰، ۱۴۷۱، ۱۴۷۲، ۱۴۷۳، ۱۴۷۴، ۱۴۷۵، ۱۴۷۶، ۱۴۷۷، ۱۴۷۸، ۱۴۷۹، ۱۴۸۰، ۱۴۸۱، ۱۴۸۲، ۱۴۸۳، ۱۴۸۴، ۱۴۸۵، ۱۴۸۶، ۱۴۸۷، ۱۴۸۸، ۱۴۸۹، ۱۴۹۰، ۱۴۹۱، ۱۴۹۲، ۱۴۹۳، ۱۴۹۴، ۱۴۹۵، ۱۴۹۶، ۱۴۹۷، ۱۴۹۸، ۱۴۹۹، ۱۵۰۰، ۱۵۰۱، ۱۵۰۲، ۱۵۰۳، ۱۵۰۴، ۱۵۰۵، ۱۵۰۶، ۱۵۰۷، ۱۵۰۸، ۱۵۰۹، ۱۵۱۰، ۱۵۱۱، ۱۵۱۲، ۱۵۱۳، ۱۵۱۴، ۱۵۱۵، ۱۵۱۶، ۱۵۱۷، ۱۵۱۸

احادیث تفسیر میں سے کوئی بھی صحیح نہیں ہے، اس باب میں ہزاروں حدیثیں جمع کی گئی ہیں، صرف صحیح بخاری سات ہزار صحیح احادیث تفسیر پر مشتمل ہے، جن میں سے تین ہزار کمرات ہیں، محدثین کا بیان ہے، کہ امام بخاری نے ان حدیثوں کو اپنے عمد میں متداول چھ لاکھ احادیث کے ذریعہ سے منتخب کیا ہے۔

ظاہر ہے مذکورہ بالا خیال آرائی کا حاصل وضع حدیث کی کثرت ظاہر کرتا ہے، اس سلسلہ میں موصوف نے احادیث، تفسیر اور احادیث بخاری کا خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا ہے، بلاشبہ حدیث کے اکثر مجموعوں میں تفسیر کے مستقل ابواب ملتے ہیں، جن کے تحت بلاغبار صحیح احادیث درج ہیں، علمائے فن نے مفسر قرآن کے لیے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول تفسیر پر اعتماد کرنا لازمی قرار دیا ہے چنانچہ امام ابو جعفر طبری رقمطراز ہیں:

اللہ جل شانہ نے قرآن پاک اپنے نبی پر نازل کیا ہے، اس لیے اس کی تفسیر و تشریح تک رسائی بھی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے بیانات و اقوال کی روشنی میں ہو سکتی ہے۔

امام ابو حنیفہ انہی اپنی تفسیر میں رقمطراز ہیں:

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح احادیث ہی سے قرآن کے مبہم معانی کی تعیین و اجا کی وضاحت، اسباب نزول و نسخ آیات کی معرفت ہو سکتی ہے، اور حدیث کی تمام معانی کتب مثلاً صحیحین، سنن ترمذی اور سنن ابوداؤد وغیرہ میں اس باب کی احادیث کثرت سے ملتی ہیں۔

حافظ جلال الدین سیوطی نے "القامان" میں ابن تیمیہ کا یہ قول نقل کیا ہے، کہ "معلوم ہونا چاہیے کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صواب کرام کے سامنے قرآن پاک کے الفاظ و معانی دونوں کی تفسیر و تشریح فرمائی ہے چنانچہ ارشادِ باری "لَيَسِّرَنَّ لِلنَّاسِ مَا نَزَّلَ الْكِتَابَ" دونوں طرح کی تفسیروں کو شامل ہے، امام شافعی سے منقول ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حکم فرمایا اس کو قرآن مجید سے مستنبط کر کے فرمایا ہے، مزید برآں علامہ تفسیر ابیطبری ج ۱ ص ۲۵۔ البحر المحیط ج ۱ ص ۶۔ سے مقدمہ تفسیر ابن تیمیہ۔



زرکشی نے تفسیر قرآنی کی دو قسمیں ذکر کی ہیں، ایک وہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام اور تابعین سے منقول ہے، اور دوسری قسم تفسیر غیر منقول ہے، علمائے تفسیر نے منقول سے رجوع کرنا واجب قرار دیا ہے، اگر احمد امین کے زعم کے مطابق احادیث تفسیر غیر صحیح ہوئیں، تو علماء ایسا حکم نہ دیتے، بلکہ بعض ماہرین فن کے نزدیک تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم منقول تفسیر کے علاوہ کوئی اور تفسیر کرنا جائز ہی نہیں ہے، علماء سیوطی رقمطراز ہیں:

”کیا قرآن کے معانی میں ہر شخص غور و فکر کر سکتا ہے؟ اس بارے میں اختلاف رائے

پایا جاتا ہے، ایک طبقہ کا خیال ہے کہ کوئی شخص خواہ کتنا بڑا عالم اور ادیب ہو، اور منطق،

فقہ، نحو اور تاریخ وغیرہ علوم پر اس کی نظر کتنی ہی وسیع ہو، اس کے لیے رسول اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم سے مردی تفسیر کے علاوہ قرآن کی کوئی اور تفسیر لے لفظاً اپنا نہیں ہو سکتا۔“

پہلے انتہا پسندانہ اور غیر معمولی بہ سہمی، مگر اس سے اتنا بہر حال ثابت ہوتا ہے کہ احادیث

تفسیر سے تجاہل برتنا یا ان کا انکار کرنا کسی کے لیے درست نہیں ہے۔

ڈاکٹر احمد امین نے اپنے مذکورہ اقتباس میں امام احمد بن حنبل کا یہ قول نقل کیا ہے، کہ تین چیزوں کی

کوئی بنیاد نہیں ہے۔ تفسیر، لحاق، معادری۔ اس پر درج ذیل چند اشارات سے بحث کی جاسکتی ہے:

۱۔ خود امام احمد نے اپنی مسند میں معادری، تفسیر اور لحاق کے بارے میں کثرت سے احادیث ذکر

کی ہیں، ان کا یہ عمل خود ان کے مذکورہ قول کے متناقض ہے،

۲۔ کسی چیز کے صحیح ہونے کی نفی کر دینے سے اس کا ضعیف اور موضوع ہونا لازم نہیں آتا، بلکہ

قاری نے تذکرۃ الموضوعات میں لکھا ہے کہ:

لا یلزم من عدم الثبوت وجود کسی بات کا عدم ثبوت اس کے موضوع

الوضع، ہونے کو مستلزم نہیں ہے،

حافظ ابن حجر عسقلانی ”تخریج الافکار المسمی بنتائج الافکار“ میں امام احمد بن حنبل کا یہ قول نقل

کے کہ ”لا علم فی الموضوع حدیثاً ثابتاً“ یعنی وضوء کے بارے میں مجھے کسی صحیح حدیث کا علم

کہتے ہیں کہ "میری رائے میں کسی چیز کی عدم واقفیت سے اس کا معدوم ہونا ثابت نہیں ہوتا۔"

۳۔ امام احمد نے یہ نہیں فرمایا کہ تفسیر کوئی چیز نہیں ہے، بلکہ صرف یہ کہا کہ تین چیزوں کی کوئی اصل و حقیقت نہیں ہے، اور ظاہر ہے اس کا مقصد و منشا یہ ذکر کرنا ہے، کہ مذکورہ تینوں علوم میں مستقل و مخصوص

کتابیں نہیں ہیں، ایک دوسری روایت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ ثلاثہ کتب کا اصل لہا المغازی والملاحیہ والتفسیر۔

۴۔ امام احمد کے مذکورہ بالا قول سے اس بات کا بھی قوی احتمال ہے کہ مذکورہ علوم ثلاثہ کے بارے میں صحیح احادیث غیر صحیحہ کی بہ نسبت کم ہیں، اگرچہ عالم نے ابن حنبل کے تذکرہ قول کو اسی معنی پر نقل کیا ہے، امام ذکری "البرکات" میں رقمطراز ہیں کہ:

هر اذ كان الطالب ليس لها اسانيد صحيح متصلة والا صح من ذلك كثير  
اس کی مراد یہ ہے کہ بیشتر احادیث صحیحہ متصل سند سے مروی نہیں ہیں، ورنہ اس میں صحیح حدیثیں کافی ہیں،

ڈاکٹر احمد امین نے اس بات پر بڑے تعجب و حیرت کا اظہار کیا ہے، کہ امام بخاری نے چھ لاکھ احادیث کے ذخیرہ سے کس طرح صحیح احادیث کا انتخاب کیا ہوگا، اور پھر اس استغراب سے انہوں نے احادیث بخاری میں وضعیت کی کثرت پر استدلال کیا ہے، بلاشبہ امام بخاری کے عہد میں متداول احادیث کی تعداد و کیف و کم کے احاطے سے باہر تھی، چنانچہ دستیاب کتب حدیث میں روایات کی کثرت و صحت دیکھ کر عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے، بیان کیا جاتا ہے کہ امام احمد بن حنبل کو سات لاکھ سے زیادہ حدیثیں یاد تھیں، اسی طرح ایک قول ابو زرہ سے بھی منقول ہے، امام بخاری کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ دو لاکھ ضعیف اور ایک صحیح احادیث کے حافظ تھے، امام مسلم کا بیان ہے کہ:

جمعت کتابی هذا من ثلاث مائة الف حدیث، میں نے تین لاکھ احادیث میں سے انتخاب کر کے اپنی کتاب مرتب کی ہے۔

امرواقع یہ ہے کہ عام لوگوں کا ذکر نہیں، بہت سے تعلیم یافتہ لوگ بھی اس بات سے ناواقف ہیں، کہ احادیث کی یہ غیر معمولی تعداد دراصل متابعات و شواہد کی کثرت کا نتیجہ ہے، مثلاً حدیث "انما الاعمال بالنیات" سات سو طرق سے مروی ہے، چنانچہ احادیث کے مجموعوں سے اگر ان متابعات و شواہد کو نکال دیا جائے تو احادیث کی بہت چھوٹی سی تعداد باقی رہ جاتی ہے، اسی باعث صحیح بخاری میں روایات صحیحہ کی کل تعداد دو ہزار چھ سو دو (۲۶۰۲) اور صحیح مسلم میں چار ہزار (۴۰۰۰) ہے، اس طرح کتب حدیث میں مروی احادیث کی کل تعداد پچاس ہزار ہے، اور اس میں بھی صحیح، سقیم، متفق علیہ اور متکلم فیہ غرض تمام نوعیت کی حدیثیں شامل ہیں امام ابو حاکم نیشاپوری نے (جو حدیث قبول کرنے کے معاملہ میں ذرا مسائل واقع ہوئے ہیں)، صراحت کی ہے کہ اول درجہ کی احادیث دس ہزار سے زیادہ نہیں ہیں،

مولف فجر الاسلام کا یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ امام بخاری نے اپنی جامع صحیح میں تمام روایات صحیحہ کا استقصاء کیا ہے، بلکہ یہ ایک معروف عام حقیقت ہے کہ امام بخاری نے اپنی کتاب میں ہر صحیح حدیث کا استیعاب نہیں کیا ہے، چنانچہ خود امام صاحب سے منقول ہے کہ

لما خرجت في هذا الكتاب اكل  
صحیحاً وما تركت في الصحیح اكثر  
میں نے اس کتاب میں صرف صحیح احادیث  
کی تخریج کی ہے، اور اس میں بھی بہت سی  
حدیثیں چھوڑ دی ہیں،

حافظ حازمی رقمطراز ہیں:

اما البخاری فلم يلتزم ان يخرج  
كل ما صح عندنا من الحديث،  
امام بخاری نے ہر صحیح حدیث کی تخریج کا  
التزام نہیں کیا ہے،

فواد سرگین کی آرا و کا نقد | ہم عصر علماء میں "تاریخ التراث العربی" کے مشہور مصنف استاد فواد سرگین نے بھی مستشرقین کے افکار و نظریات سے گہرا اثر قبول کیا ہے، اور ان کی تبلیغ و اشاعت میں بڑی کاوش کی ہے، موصوف نے بروکلمان کی شہرہ آفاق کتاب "تاریخ الادب العربی" کو جدید ذوق و معیار کے مطابق ایڈٹ



کیا ہے، اس میں بعض نہایت گرائڈر اہل علم نے مثلاً مصنف کی تمام مطبوعہ و قلمی تصانیف کی نشاندہی فرمائی ہے، کہ جس کے باعث یہ کتاب ہر عالم و محقق کا مرجع بن گئی ہے، بلاشبہ اس عظیم علمی کارنامے پر فواد فخر ہر سپاس و تحسین کے مستحق ہیں، مگر یہیں ہمہ جہاں اہل علم نے صحیح بخاری کے بارے میں اظہار خیال کیا ہے، اس سے مستشرقین کے نظریات کی تراوش ہوتی ہے، چنانچہ وہ رقمطراز ہیں:

”سے بڑی غلطی جس کے نتیجے میں دوسری غلطیوں کا صدور ہوتا گیا، یہ ہوئی کہ صحیح بخاری کو پہلی ”مصنف“ خیال کر لیا گیا، جو ہر فقہی مسئلہ اور ہر فقہی باب میں قذیل راہ کی خدمت انجام دینے کے لیے تالیف کی گئی ہے،“

میں نے علم حدیث کے ارتقاء کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے یہ حقیقت واضح کی ہے، کہ امام بخاری اور ان کے معاصرین کے مجموعہ ہائے حدیث کسی طور بھی کتب ”مصنف“ کی نمائندگی نہیں کرتے، اس لیے کہ وہ سو سال کی مدت میں تالیف ہونے والے مختلف ”مصنفات“ کا مجموعہ و ملخص ہیں، اور یہ بات ظاہر ہے کہ امام بخاری نے اپنی جامع میں بغیر تحقیق و تنقیح کے بکثرت لغوی، تاریخی، فقہی اور حدیث کی کتب سے استفادہ کیا ہے، (تراث العربی ج ۲ ص ۱۷۳)

صحیح بخاری کے بارے میں استاد فواد سزگین کی اس غلط رائے پر سخت تعجب و حیرت ہوتی ہے، اس لیے کہ کسی بھی مسلمان اہل علم نے یہ دعویٰ نہیں کیا ہے، کہ امام بخاری کی جامع صحیح علم حدیث کی پہلی ”مصنف“ ہے، بلکہ صرف یہ ذکر کیا ہے کہ احادیث صحیحہ کے باب میں پہلی تصنیف کی حیثیت سے اس کی اہمیت مسلم ہے، چنانچہ امام نووی ”التقریب“ میں رقمطراز ہیں:

اول مصنف فی الحدیث المجرود	صحیح بخاری احادیث صحیحہ کی پہلی تصنیف
صحیح البخاری ثم مسند و صحاح	ہے، اس کے بعد مسلم کا درجہ ہے اور یہی دونوں
الکتب بعد القران العزیز و البخاری	قرآن کے بعد صحاح الکتب میں، ان دونوں میں بھی
صحیحاً	صحیح بخاری کا پایہ صحت کے اعتبار سے زیادہ بلند ہے

لہذا رقمطراز نے اپنی عربی کتاب ”الامام البخاری“ میں اس طرح کے متعدد اقوال جمع کر دیئے ہیں،

بلاشبہ امام بخاریؒ سے پہلے کتب حدیث موجود تھیں، لیکن صورت حال یہ تھی کہ ان کتابوں میں صحیح و سقیم روایات غلط ملط تھیں، اور کسی حدیث کے درجہ صحت کا تعین رجال و رواۃ کی جانگاہ تحقیق کے بعد ہی ممکن ہو سکتا تھا، اگرچہ بھی اس بارے میں کوئی واضح رہنمائی نہیں ملتی تھی تو ائمہ حدیث سے رجوع کرنا پڑتا تھا، یہ اور بالفرض اگر یہ بھی ممکن نہ ہوتا تو وہ حدیث تا وقت مہول الحال ہی باقی رہ جاتی تھی، لیکن جب امام بخاری نے علم حدیث کے فلک رفعت ایوان پر اپنی سطوت و علوئے مرتبت کے علم بسند کیے، تو انھوں نے نہایت کاوش و محنت کے ساتھ صحیح روایات منتخب کر کے اپنی شہرہ آفاق "جامع صحیح" تالیف کی، تاکہ علم حدیث کا لذت شناس تلاش و تحقیق کی بے جا زحمت سے نجات پاجائے، امام بخاریؒ نے اس میں صرف وہی احادیث درج کی ہیں، جن کی صحت ان کے نزدیک مسلم تھی، اس کتاب کا پورا نام انھوں نے "الجامع المسند الصحیح المختصر من امور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسننہ وایامہ" رکھا، اس لیے کہ علمائے امت کا اجماع ہے کہ صحیح بخاری نہ صرف تمام مجموعہائے حدیث میں افضل ہے، بلکہ قرآن کے بعد اسے صحیح الکتب کی حیثیت حاصل ہے، امام قسطلانی بڑے ادیبانہ انداز میں رقمطراز ہیں:

"صحیح بخاری علم حدیث کی سب سے زیادہ صحیح کتاب ہے، اس نے ہر عہد کے علماء سے قبول عام کی سند حاصل کی ہے، اپنی گونا گوں خصوصیات و محاسن میں وہ تمام علوم و فنون کی ہم عصر کتب میں فائق و ممتاز ہے، تمام اکابر اہل علم اور فضلاء روزگار نے اس کی عظمت کا اعتراف کیا ہی حقیقت یہ ہے کہ اس کے فضائل و محاسن کیف و کم کے احاطے سے باہر ہیں۔"

اب رہی یہ بات کہ صحیح بخاری کی تالیف کا مقصد یہ تھا کہ وہ ہر فقہی باب اور ہر فقہی مسئلہ کے لیے شمع راہ ثابت ہو تو یہ "نئی تحقیق" ہمارے علمی حلقوں میں قطعاً غیر معروف ہے، ہر اہل علم جانتا ہے کہ امام بخاری نے جامع صحیح صرف اس لیے تالیف کی کہ صحیح احادیث کا اہتمام کیا جائے، اور اس کے متون سے پیش از پیش معانی و مفہیم کا استخراج کیا جائے، پناہ سچے اسی لیے انھوں نے مختلف ابواب میں مکرر احادیث درج کی ہیں، بلکہ بعض احادیث کو بیس مرتبہ سے بھی زیادہ ذکر کیا ہے، اسی باعث علماء کا یہ مشہور قول زبان زد

خلائق ہے کہ ”فقہ البخاری فی تراجمہ“ حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری کے مقدمہ میں رقمطراز ہیں:

یہ بات طے شدہ ہے کہ امام بخاری نے اپنی کتاب الجامع میں صحت کا التزام رکھا ہے، اور صرف روایات صحیحہ ہی درج کی ہیں، یہی اس کا اصل موضوع بھی ہے، جو اس کتاب کے اصل نام الجامع الصحیح المسند من حدیث رسول اللہ ﷺ و سننہ و ایامہ سے بھی ظاہر ہے، پھر اس کے بعد امام صاحب کی رائے ہوئی کہ وہ فوائد فقہیہ اور نکات فلسفیانہ سے صرف نظر نہیں کر سکتے، اس لیے انہوں نے اپنی بصیرت کے مطابق متون حدیث سے بکثرت مسائل کا استخراج کیا، اور کتاب کے تمام ابواب میں حسن تناسب سے انہیں پھیلا دیا۔

معلوم ہوا کہ نواد مسرگین کی یہ رائے کہ ”صحیح بخاری کا مقصد تالیف ہر فقہی مسئلہ کی وضاحت یا تمام ابواب فقہیہ کا ذکر تھا، صحیح نہیں ہے،

اسی طرح یہ بات کہ ”امام بخاری نے کتب حدیث کے علاوہ بکثرت لغوی، تاریخی اور فقہی کتب سے بغیر کسی تحقیق و تنقیح کے استفادہ کیا ہے،“ صرف وہی شخص کہہ سکتا ہے، جس کا صحیح بخاری اور اس کے مصنف کی غایت احتیاط و جستجو کے بارے میں کوئی مطالعہ نہ ہو، خود امام بخاریؒ کے درج ذیل بیانات اس کے شاہد عدل ہیں،

”میں نے اپنی کتاب میں کوئی حدیث درج کرنے سے پہلے غسل کیا، اور دو گانہ نفل ادا کیا ہے“

”میں نے اپنی جامع صحیحہ چھ لاکھ احادیث میں سے انتخاب کر کے سو سال میں تالیف کی ہے، نیز میں نے اسے اپنے اور اللہ کے درمیان حجت بنایا ہے“

”میں نے اپنی کتاب میں کوئی حدیث درج کرنے سے پہلے استخارہ کیا، اور دو گانہ نفل ادا کیا ہے، نیز اس حدیث کی صحت کا یقین کر لیا ہے“



پھر قابل ذکر بات یہ ہے کہ امام بخاری نے احادیث کے مواج سمندر میں سے صرف دو ہزار چھ سو دو (۲۶۰۲) موتی چن کر جمع کیے ہیں، کیا اس شدت حزم و احتیاط کی نظیر مل سکتی ہے؟ علاوہ ازیں امام بخاری نے صحت حد کے بن سخت ترین شرائط و قیود کا پورا التزام کیا ہے، وہ اعتبار و اعتماد اور صحت و ثبوت کا مستہائے کمال ہے، دوسرے مولفین حدیث کے یہاں اس کی مثال مفقود ہے، یہ صحیح ہے کہ امام بخاری نے بہت سے تاریخی، لغوی اور فقہی مراجع پر اعتماد اور ان سے استفادہ کیا ہے، مگر اس میں بھی انھوں نے اپنی مجتہدانہ شان برقرار رکھی ہے، ان کی بعض اجتہادی آراء سے اختلاف رائے ممکن ہے، مگر عدم تحقیق و تفتیح کا نتو بھی محال ہے:

استاذ فواد منرگین مزید رقمطراز ہیں:

”اسانید کے اعتبار سے صحیح بخاری درجہ کمال کو نہیں پہنچتا ہے، چنانچہ تقریباً ربع کتاب کی اسانید ناقص ہیں، چوتھی صدی کے آغاز میں اس عمل کو تعلق کا نام دیا گیا، اس بنا پر صحیح بخاری جمع و ترتیب اور اپنے مشمولات میں معروف شہرت سے محروم ہو جاتی ہے، خود امام بخاری کے بارے میں یہ ثابت ہے کہ وہ ایسے عالم حدیث نہ تھے جنہوں نے اسناد کو درجہ کمال تک پہنچایا، بلکہ وہ پہلے شخص ہیں جن سے اسناد کا انحطاط شروع ہوا، ..... بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اسناد کی مکمل حقیقت سے امام بخاری واقف ہی نہ تھے، اور ان کے یہاں اسناد اپنا اعلیٰ مقام دمر تہ کھو بیٹھتی ہیں۔“

فواد منرگین نے اپنی مذکورہ الصدر تصنیف میں ایک مستقل باب علم حدیث کے مقدمہ کے طور پر سپرد قلم کیا ہے، جو تیس صفحات پر محیط ہے، اس میں موصوف نے علم حدیث کی کتابت و تدوین اور روایات کی تاریخ لکھنے کی کوشش کی ہے، اور بلاشبہ انھوں نے بکثرت مفید معلومات کی نشاندہی کی ہے، لیکن بس ہمہ حقیقت یہ ہے کہ حدیث و مصطلحات کی کتابوں کے بارے میں فواد منرگین کا مطالعہ صفر کے برابر ہے

۱۵ شروط الائمة السنہ للمقدسی ص ۴۷۔ نیز ملاحظہ ہو مقالہ نگار کی کتاب البخاری ص ۱۱۲۔ ۱۱۳ تاریخ الترتیب

العربی جلد دوم ص ۱۲۷، ۱۲۸ ایضاً ص ۱۱۲۔

انہوں نے خود مستشرقین کے افکار کو بغیر کسی تحقیق و تنقید کے قبول کر لیا ہے، اور امام بخاری و جامع صحیح کو اس کے بلند مقام سے گرانے کی کوشش کی ہے، جیسا کہ سطور بالا میں ذکر آچکا ہے، کہ امام بخاری نے صحیح حدیث کے سنہ ترین شرائط کا پورا لحاظ رکھا ہے، امام صاحب کے یہاں راوی اور مروی عنہ میں طاقات ہونا شرط ہے جب کہ امام مسلم کے یہاں دونوں میں معاشرت ہی کافی ہے،

امام حازمی کا قول ہے کہ ”در اصل امام بخاری حدیث میں ایک مختصر کتاب تالیف کرنا چاہتے تھے، ان کا مقصد حدیث در رجال کا استیعاب کرنا نہیں تھا، بس ان کی واحد شرط یہ رہی ہے کہ صحیح احادیث ہی کی تخریج کریں، اسی بنا پر شادوران علم حدیث اور ماہرین اسماء الرجال نے دوسری کتب اسما الرجال کی بنسبت بخاری و مسلم پر زیادہ اعتماد کیا ہے، صحیح بخاری میں جس راوی سے کسی حدیث کی تخریج کی گئی ہے، اس کے بارے میں شیخ ابوالحسن مقدسی کا یہ قول بہت مشہور ہے کہ ”هذا جاز القنطرة“ (یعنی یہ شخص پل پار کر گیا) مطلب یہ کہ اس راوی کے بارے میں کسی طرح کی نقد و جرح ناقابل اعتنا ہے۔

خلاصہ کلام یہ کہ امام بخاری نے کسی حدیث کو قبول کرنے سے پہلے تحقیق و جستجو میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کی ہے، مستشرقین کے اتباع میں ڈاکٹر فواد منیر گین کے متذکرہ بالا افکار و نظریات تعجب انگیز ہیں، کیونکہ انہوں نے علم حدیث کی تاریخ لکھنے اور کتب حدیث در رجال کا تنقیدی جائزہ لینے کے لیے اپنی کتاب میں مستقل ایک فصل قائم کی ہے، اور تقریباً تیس صفحے تحریر کر ڈالے ہیں، انہوں نے اگر ایسا عدم واقفیت کی بنا پر کیا ہے، تو حق کی طرف رجوع واجب ہے، اور اگر عمدتاً ایسا کیا ہے تو ظاہر ہے اس کا مقصد حدیث کی بنیاد کو مکمل طور پر تباہ کرنا ہے، ہر دست راست سطور مذکورہ بالا گزارشات ہی پر اکتفا کرتا ہے، ورنہ ہمارے مسلمان تسلیم یافتہ طبقہ میں احمد امین اور فواد منیر گین جیسی مثالوں کی کمی نہیں ہے، ورنہ اصل عصر حاضر میں یہ موضوع بے حد اہمیت کا حامل ہو گیا ہے۔ واللہ من وراء القصد وهو

ولحی التوفیق: (مترجمہ ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی)

۱۰ مقدمہ جامع الدراری ص ۹۲۔ ۱۱ مقدمہ فتح الباری ص ۲۶۹۔

# اسلام اور مستشرقین کے موضوع

پر

## ایک سرسری نظر

(از مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی امیر جماعت اسلامی ہند)

یہ مقالہ عربی میں پیش کیا گیا تھا، اردو زبان میں اس کا ترجمہ مولوی عبید اللہ کوٹی ندوی،

رفیق دارالمصنفین نے کیا ہے۔

دارالمصنفین کے احاطہ میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر کئی انداز میں ایک عالمی کانفرنس کا انعقاد اور اس میں عالم اسلام کے محققین اور ممتاز افراد اور ہندو بیرون ہند کی مختلف اکادمیوں کے نمائندوں کی شرکت، اس بات کا واضح اشارہ ہے کہ یہاں اس موضوع پر سیر حاصل بحث و گفتگو ہوگی، یہ کانفرنس اس جدید علمی ترقی کی بھی نمایاں علامت ہے جو ہندوستان اور بیرون ہند پورے عالم اسلام میں نشوونما پا رہی ہے، عالم اسلام کے کسی بھی گوشہ میں ایسی کانفرنس منعقد ہو سکتی تھی لیکن ہمارے ہندی دیار اور خصوصاً دارالمصنفین کو اپنی علمی کارگزاریوں کی بنا پر، اس کانفرنس کے منعقد کرنے کا زیادہ حق تھا، اس لیے کہ اس کی صدارت اور سرپرستی ہمارے فاضل دوست اور داعی اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے سپرد ہے، اور اس لیے بھی کہ علوم اسلامیہ کی نشر و اشاعت کے سلسلہ میں اس ادارہ کی خدمات روز روشن کی طرح عیاں ہیں،

اس ادارہ کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ اس نے دنیا کو گراں قدر علمی تحفے کے طور پر کئی اہم کتابیں دی ہیں، جن میں خاص طور پر الفاروق، ارض القرآن، سیرت عائشہ، انتقاد علی التمدن الاسلامی، مقالات شبلی، سیرۃ نبویؐ اور سیرۃ صحابہؓ کی سلسلہ وار جلدیں اور الجہاد فی الاسلام، قابل ذکر ہیں، یہ تمام کتابیں عالم اسلامی کا ورثہ ہیں، ان



میں بعض کتابیں مثلاً علامہ شبلی و علامہ سید سلیمان ندوی کی سیرۃ النبیؐ تو پورے عالم اسلام میں بے نظیر ہے  
ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔

اس موقع پر کانفرنس ہی کے کسی موضوع پر مجھے بھی دلائل و براہین سے آراستہ کوئی مضمون پیش  
کرنا چاہیے تھا، لیکن افسوس ہے کہ اس سلسلہ میں مجھے کامیابی نہیں ہوئی، میرے متنوع مشاغل نے اس طرح  
کے کسی مقالہ کی تکمیل کا مجھے موقع نہیں دیا، پھر بھی میں چاہتا ہوں کہ ہر مہرے انداز میں مستشرقین اور ان کی کارگزاریوں  
کے بارے میں اپنے تاثرات پیش کر دوں

مستشرقین کی خدمات	یہ بات شک و شبہ سے بالاتر ہے کہ گزشتہ صدیوں میں، یورپ نے علوم اسلامیہ
اور ان کے مقاصد	کے مطالعہ میں جو کچھ سچی لی اور ادب و سیرت اور مختلف علوم کی قدیم کتابوں کی

نشر و اشاعت کے لیے جو تگ و دو کی، اس کے لیے یورپ تیسریں و آفریں کا مستحق ہے، جب کہ ہم مسلمانوں کو  
اس طرف متوجہ ہونا چاہیے تھا، اور ہماری عظمت شکاری کی وجہ سے دنیا کے مشہور کتب خانوں کے گوشہ انجمنوں  
میں یہ کتابیں بند پڑی تھیں، ان تک عام اہل علم کی نظر میں نہیں پہنچ سکتی تھیں، اور نہ ہی ان سے استفادہ ممکن تھا،  
یورپ نے ان کتابوں کو طبع و اشاعت کے ذریعہ عام کر دیا، جس پر وہ ہماری طرف سے شکر یہ کا مستحق ہے،  
اس لیے کہ جو شخص بھی، کوئی قابل قدر اور باوقار خدمت انجام دے، اس کا شکر گزار ہونا ایک اخلاقی فریضہ ہے،  
لیکن اس کے پہلو یہ پہلو چند اور گوشوں کو بھی پیش نظر رکھنا ضروری ہے،

میرا خیال یہ ہے کہ مذکورہ بالا علمی جدوجہد، حتیٰ کی جستجو یا کسی بلند اخلاقی مقصد کے بجائے یورپ کی  
اپنی سیاسی ضرورتوں کا نتیجہ تھی، یورپ میں علمی ترقی کے آغاز، دنیا کے ایک بڑے حصہ پر اس کے تسلط، اور  
مشرق پر اس کے سیاسی اقتدار کے نتیجے میں یورپ کو مشرقی روایات و افکار سے واقفیت کی ضرورت کا  
احساس ہوا، مستشرقین اس ضرورت کو پورا کرنے کے لیے سامنے آئے، اور وہ اس میں اس حد تک کامیاب ہوئے  
کہ مغربی تہذیب کی چمک سے جن لوگوں کی نگاہیں خیرہ ہو چکی تھیں، انہوں نے بھی علوم اسلامیہ کے مطالعہ و تحقیق کے  
کے لیے مغرب کے سفر شروع کر دیئے، حالانکہ یورپ، اسلام کے تصور و حی کا قائل نہ تھا، اور نہ ہی محمد ﷺ  
کی نبوت کا اس نے اعتراف کیا تھا، مگر اس کے باوجود مستشرقین کو اپنی کوششوں میں یہاں تک کامیابی ہوئی کہ وہ

علوم اسلامیہ میں بھی سزا تسلیم کر لیے گئے، اور ان کو ان علوم میں بھی امتداد کی حیثیت حاصل ہو گئی، یہ ذہنیت دراصل یورپ کے مقابلہ میں عالم اسلام کی اس شکست کا نتیجہ تھی، جس سے ہر جگہ مسلمان دوچار ہوئے ہیں، اور واقعہ یہ ہے کہ میدان جنگ میں شکست کے مقابلہ میں یہ ذہنیت زیادہ خطرناک تھی،

دوسری بات جس کی طرف مجھے آپ حضرات کی توجہ مبذول کرانی ہے، وہ یہ ہے کہ صلیبی جنگوں کی وجہ سے مستشرقین میں جو معاندانہ رویہ پرورش پاتا رہا اس کو کسی بھی حال میں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا، ان میں معدودے چند کے سوا جن کو انگلیوں پر گنا جاسکتا ہے، مستشرقین کی اکثریت، اپنی بلند علمی حیثیت کے باوجود، حق اور صداقت کے بنیادی فرض کی ادائیگی میں بھی، اپنے کو معاندانہ رویہ سے نہیں بچا سکی، اسی وجہ سے جہ اسلام اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر لکھی جانے والی اپنی تحریروں میں، غلط واقعات اور بناوٹی قصوں کہانیوں کی نشر و اشاعت اس طرح کرتے ہیں، گویا کہ وہ ثابت شدہ واقعہ ہوں، اسلام کے تصور توحید کے بارے میں یہ بات اب ڈھکی چھپی نہیں رہی کہ وہ اتنا واضح ہے جس کی مثال کسی دوسرے مذہب میں موجود نہیں، مگر مستشرقین نے اس کے باوجود دنیا کو یہ یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ اسلام بھی بت پرستی ہی کی ایک نئی شکل ہے، اور یہ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خانہ کعبہ میں دوسرے قدیم مجسموں کو ہٹا کر اپنا ایک زریں مجسمہ نصب کروا دیا تھا، انہوں نے نزول وحی کی کیفیت کو مرگی قرار دیکر لوگوں میں یہ خیال پیدا کرنے کی کوشش کی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی یا کوئی آسمانی پیام نہیں آیا بلکہ وہ مرگی کے مریض تھے، اور مرگی کا دورہ گزر جانے کے بعد، آپ لوگوں سے یہ کہہ دیا کرتے تھے کہ یہ نزول وحی کی حالت تھی، پھر آپ لوگوں کو اپنی طرف سے چند آیات سنا دیا کرتے، کچھ مستشرقوں نے یہ غلط کہانی ایجاد کی، کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے چند کبوتروں کی تعلیم و تربیت دے کر تیار کیا تھا، وہ آپ کے کانڈھوں پر کان کے قریب آکر بیٹھ جاتے، اور آپ لوگوں سے یہ فرما دیا کرتے کہ یہ کبوتر جو تم میرے کانڈھوں پر دیکھ رہے ہو، یہ پرندے نہیں ہیں، بلکہ جبرئیلؑ ہیں، جو خدا کی طرف سے پیغام لے کر میرے پاس حاضر ہوئے ہیں، چند مستشرقین یہ لکھتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو دین پیش کرتے ہیں وحی آسمانی سے اس کا کوئی تعلق نہیں، وہ بحیرہ راہب کی تعلیم سے ماخوذ ہے جس سے آپ نے اپنے سفر شام کے دوران میں ملاقات کی تھی، اسی بنا

پر مستشرقین کا ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ اسلام کوئی مستقل مذہب نہیں، وہ عیسائیت ہی کی شاخ ہے، چند محققین نے دنیا کو یہ یقین دلانے کے لیے زبردست کوششیں کی ہیں کہ اسلام کی اشاعت اس کے اعلیٰ مقاصد اور بہتر تعلیمات کی وجہ سے نہیں بلکہ صرف تلوار کے بل پر ہوئی ہے، کچھ لوگوں نے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب گرامی نصرت بالربعب (مجھے خدا کی طرف سے عظمت اور وقار عطا ہوا ہے) کے معنی غلط سمجھانے کی کوشش کی ہے اور اس سے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام ایک دہشت پسند دین ہے، کچھ اہل تحقیق نے اپنے قلم کا سارا زور یہ ظاہر کرنے میں صرف کر دیا کہ اسلامی قوانین، خدا کی طرف سے نازل نہیں ہوئے، بلکہ اس کا ایک حصہ رومن لاسے اور دوسرا حصہ صومرانی کے قوانین سے ماخوذ ہے۔

یہ لوگ جب اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ کے بارے میں کچھ لکھتے ہیں، تو مسلمانوں پر الزام تراشی سے نہیں چوکتے، چنانچہ اسکندر یہ اور بغداد کے دو کتب خانوں کو نذر آتش کیے جانے کا الزام، انھوں نے بڑی جسارت کے ساتھ مسلمانوں پر لگایا ہے، اللہ تعالیٰ اپنی رحمتیں نازل فرمائے حجۃ الاسلام علامہ شبلی نعمانی پر جنھوں نے سیرۃ النبیؐ، الانتقاد علی التمدن الاسلامی اور اپنی دوسری کتابوں میں واضح دلائل کے ذریعہ اس طرح کی دروغ بیانیوں اور الزام تراشیوں کا جواب دیا ہے،

مستشرقین کی افرا پر دازیوں اور دسیہ کاریوں کی یہ چند مثالیں ہیں، علمائے اسلام نے ان کی بہتان طرازیوں پر واضح دلائل کے ذریعہ اطمینان بخش جوابات دیئے ہیں، جس کے رد عمل کے طور پر مستشرقین نے اپنے نقطہ نظر میں کسی قدر ترمیم کرنے کے بعد، بڑی حکمت اور ہوشیاری سے اپنا رویہ تبدیل کر دیا، اور اب وہ اپنے مقصد سے ذرا سا بھی تغافل کیے بغیر، عدل و انصاف کا لبادہ اوڑھ کر لوگوں کے سامنے نمودار ہوئے، انھوں نے سیرت طیبہ پر علم نفسیات اور دوسرے علوم کی روشنی میں اعتراضات کیے، تاکہ وہ یہ ثابت کر سکیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدا میں صنسی میلانات پر قابو پانے کی کوشش کی، مگر وہ اس میں ناکام ہوئے، تا آنکہ تعدد ازدواج کی صورت میں اس کے نتائج ظاہر ہوئے،

اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں مستشرقین کی سرگرمیوں کے یہ چند نمونے ہیں، انہوں نے سیرت و سوانح اور ادب و تاریخ کے میدان میں علمی تاریخی اور ادبی تحقیق کا دعویٰ کرتے ہوئے اور آزادی فکر و رائے کا نام



لے کر، اسلامی عقائد، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کے بارے میں شک و شبہ کی تضاویہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

میں نے مستشرقین، اور ان کی کارکردگی کے بارے میں اپنے چند تاثرات کا یہاں اختصار کے ساتھ ذکر کر دیا ہے، اور اس کی روشنی میں:

پہلی بات جس کی طرف میں توجیہ دلانا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جب تک مستشرقین کو استادانہ حیثیت حاصل رہے گی، اور جب تک وہ علوم اسلامیہ میں مرجع اور سند بنے رہیں گے، اور جب تک اسلام کے اہم مفہم کے لیے وہ لوگوں کی توجیہات کام کر رہے رہیں گے، اس وقت تک اسلامی معاشرہ میں شک و شبہ کی خمر ریزی کا دروازہ بھی کھلا رہے گا، لیکن اسی کے ساتھ ہمیں مستشرقین کی علمی کاوشوں کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، ورنہ ان سے صرف نظر کرنے کی وجہ سے ہم بہت سی قابل قدر کتابوں سے محروم ہو جائیں گے، ہمارے اہل نظر علماء کو مستشرقین کی طرف سے شایع ہونے والی کتابوں سے باخبر ہونے کے علاوہ ان کے نتائج فکر سے ہوشیار اور چوکنا بھی رہنا چاہیے، تاکہ عالم اسلامی کو یہ معلوم ہوتا رہے کہ اسلام اور مسلمانوں کی شہرت کو دفاع کرنے کے لیے کہاں اور کس کس طرح کوششیں کی جا رہی ہیں، عام مسلمانوں خصوصاً ان کی نوجوان نسل اور تعلیم یافتہ غیر مسلموں کی ایک بڑی تعداد، اسلام اور سیرت نبوی سے واقفیت کے لیے مستشرقین ہی کی تحقیقات پر اعتماد کرتی ہے، اس لیے یہ علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ مستشرقین کے اثرات اور ان کی افر پر وازوں اور نکتہ چینیوں کا دلائل کی روشنی میں جواب دیں، تاکہ حق و باطل کی تمیز ہو سکے، اور واضح دلائل کی روشنی میں صحیح اور غلط کا فیصلہ کیا جاسکے۔

مذکورہ بالا مقصد کے پیش نظر یہ بھی ضروری ہے کہ ہم علم و تحقیق کی اعلیٰ سطح پر جدید تقاضوں کے مطابق، اسلامی تعلیمات اور سیرت نبوی پر واقع اور قابل قدر کتابوں کا ایک سلسلہ تیار کر دیں، یہ کتابیں اسلوب اور معنی کے لحاظ سے مستشرقین کی تالیف کردہ کتابوں سے اپنے معیار اور اسلوب میں بلند تر ہوں یا کم از کم ان سے فروتر نہ ہوں، اور تب ہی لوگ، مستشرقین سے بے نیاز ہو سکیں گے، اور ان کو زیادہ بہتر انداز میں آسانی سے ان کا بدل مل سکے گا،



# مستشرقین کے بارے میں مولانا ابوالحسن علی ندوی

کے

## ارشادات گرامی

نوٹ۔ ”المصنفین کے اس سیمینار میں مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنے خطبہ صدارت میں جو کچھ فرمایا تھا وہ ”اسلامیات اور مغربی مستشرقین و مسلمان مصنفین“ کے عنوان سے شایع ہو گیا ہے، یہ کتاب دارالمصنفین اور مجلس تحقیقات و نشریات اسلام لکھنؤ سے مل سکتی ہے، اس میں سے کچھ اقتباسات، ہم یہاں ناظرین کے لیے پیش کرتے ہیں۔

اس حقیقت کا اعتراف ایک صاحب علم کا علمی و اخلاقی فرض ہے کہ متعدد مستشرقین نے اسلامی علوم کے مطالعہ میں اپنی ذہنی و علمی صلاحیتوں کا فیاضانہ استعمال کیا، انہوں نے اس کام کے لیے اپنی زندگیاں وقف کر دیں، ان میں سے بہت سے فضلا نے مشرقی اور اسلامی علوم کا موضوع، سیاسی، اقتصادی اور مشنری اغراض و مقاصد کے ماتحت نہیں بلکہ محض شوق علم اور جذبہ بحث و تحقیق کی خاطر اختیار کیا اور اس کام میں خاصی جگر کاوی اور دیدہ ریزی کا ثبوت دیا، یہ بہت دھرمی اور انصافی ہوگی کہ ان کے اس پہلو کا اظہار و اعتراف نہ کیا جائے، انکی کوششوں سے بہت سے نادرا اسلامی مخطوطات جو صدیوں سے سو رہ کی روشنی سے محروم تھے نشر و اشاعت سے آشنا ہوئے، اور نادان و نااہل دارثوں کی غفلت اور کرم خوردگی سے بچ گئے، کتنے علمی ماخذ اور اہم تاریخی دستاویزیں اول اول انہیں کی کوششوں اور علمی دیکھی اور شہف کے نتیجہ میں منظر عام پر آئیں، جن سے مشرقی دنیا کے علماء و محققین کی آنکھیں روشن ہوئیں، اور ان کے علم و تحقیق



### کلام آگے بڑھا

ان مشہور مستشرقین کے ناموں اور کاموں کا احاطہ تو اس مقالہ میں نہیں کیا گیا ہے، جن کا علمی دنیا پر احسان ہے، محض مثال کے طور پر چند جو ذیل حضرات کا نام لیا جا سکتا ہے، پروردگار نے ان کو آرزو مند فرمایا کہ قابل قدر کتاب (The Perennial Message of Islam) (دوست اسلام) ہے، اسٹینلی لین پول، چین کی کتاب (Saladin) سلطان صلاح الدین، اور (Moors in Spain) (عرب اندلس میں) بڑی حد تک منصفانہ تصنیفات ہیں، انگریزی لغتوں نے حافظ بن جر عسقلانی کی مشہور کتاب "الاصحاب فی تیسیر الصحابہ مطبوعہ رائل ایشیاٹک سوسائٹی، کولمبو، کو اپڈیٹ کیا، اور اس پر انگریزی میں ایک فاضلانہ مقدمہ لکھا، اور ڈین جو اس عربی و انگریزی ڈکشنری کے مرتب ہیں، جو (Arabic English Lexicon) کے نام سے مشہور ہے، اور انگریزی زبان میں عربی مفردات کی تفصیلی شرح پر قابل اعتماد مرجع کی حیثیت رکھتی ہے، اور جس سے خود عربی زبان اور عربی نحو کے ماہرین فائدہ اٹھاتے ہیں، اسے جے ونک (A. J. Wensinck) جنہوں نے ائمہ مدین کی حدیث و سنن و معانی پر مشتمل چودہ کتابوں سے تخریج و تراجم کے لیے بڑی مفضل انداز میں تیار کیا ہے، اور علمی و فقہی عنوانات، اسما اور سیرت کی بعض ذیلی سرخوں پر اس کو ترتیب دیا ہے، پھر ان عنوانات کو حروف تہجی پر مرتب کیا ہے، مشہور مصری عالم استاذ نواد عبد الباقی نے اس کتاب کو عربی میں منتقل کیا ہے اور اس کا نام "مفتاح کنوز السنہ" رکھا ہے، علامہ سید رشید رضا مصری اور علامہ احمد محمد شاہ نے اس پر بڑے فاضلانہ اور اعتراف و تشکر آمیز مقدمے لکھے ہیں، اسی طرح مستشرق و نمونک نے "المجموع الفرس لالفاظ الحدیث النبوی" (احادیث نبوی کے الفاظ کی ڈکشنری) کی ترتیب میں بھی نگرانی کا کام انجام دیا ہے جس کی ترتیب و تالیف میں کئی مستشرق علماء و محققین شریک ہیں، اور اس کو ۱۹۳۶ء میں پہلی مرتبہ شائع کیا، مذکورہ صدر کتاب کے مقابلہ میں اس کتاب سے استفادہ آسان ہے، یہ سات بڑی جلدوں میں شائع ہوئی ہے، جی بی اسٹریچ (G. B. Strange) اور ان کی کتاب (Lands of the East) (Calcutta) (جنرالیہ خلافت مشرقین بھی ان کا ذیل میں آتی ہے) یہ تمام تصنیفات ادراکی و تحقیقی کوششیں اس بات کی دلیل ہیں کہ ان مصنفین و مرتبین نے جو وجدی کوششیں

کسر نہیں اٹھا رکھی اور اس طرح، جاں گسل، مطالعہ اور کاوش، بحث و تحقیق میں اپنے موضوع کے ساتھ خلوص و  
 اہتمام کا پورا ثبوت دیا ہے،

لیکن مستشرقین کے علم و فضل کے اعتراف کے ساتھ ساتھ، اس موقر علمی مجلس میں اس حقیقت کی وضاحت  
 کرنے میں کوئی باک نہیں کہ مستشرقین کے ایک بڑے طبقہ کی ہمیشہ یہ کوشش رہی ہے کہ اسلامی شریعت مسلمانوں  
 کی تاریخ اور تہذیب و تمدن میں کمزوریوں اور غلطیوں کی تلاش و جستجو میں وقت صرف کریں اور سیاسی  
 و مذہبی اغراض کی خاطر ان کی کاہت بنائیں، اس سلسلہ میں ان کا رول بالکل اس شخص کی طرح رہا ہے  
 جس کو ایک منظم و خوشنما و خوش منظر شہر میں صرف سیدر لائنز، تالیاں، گندگی اور گھورے نظر آتے ہیں، جس  
 طرح محکمہ صفائی کے انچارج (Drain Inspector) کا کسی کارپوریشن اور میونسپلٹی میں فریضہ  
 منصبی ہوتا ہے کہ اس طرح کی رپورٹ پیش کرے، وہ متعلقہ ڈپارٹمنٹ کو جو رپورٹ پیش کرتا ہے، اس  
 میں طبعی طور پر قارئین کو سوائے گندگیوں اور کوڑے کرکٹ کے تذکرہ کے عام طور پر کچھ نہیں ملتا،

ہنسوس کی بات ہے کہ ہم بہت سے مستشرقین کو یہ کام کرتے ہوئے دیکھتے ہیں، وہ اپنی ساری کدو کاوش  
 تاریخ اسلام، اسلامی معاشرہ، تہذیب و تمدن اور ادب و ثقافت میں جھول اور کمزوریوں کی تلاش و نشاندہی  
 میں صرف کرتے ہیں، پھر مولناک اور ڈرامائی انداز میں ان کو پیش کرتے ہیں، ان کی ذہانت و طباعی کا پورا مظاہرہ  
 چہرہ اسلام کو بدنام و کھانے میں ہوتا ہے، اور اس طرح اسلامی ممالک کے زعماء و قائدین کے (جنہوں نے  
 یورپ کی بڑی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی یا اسلام کا مطالعہ یورپین زبان میں کیا ہے) دل و دماغ میں اسلام  
 اور اسلامی قانون و تہذیب کے سرچشموں کے بارے میں شکوک و شبہات پیدا کرتے ہیں اور اسلام کے  
 مستقبل سے ناامیدی، حال سے بیزاری اور ماضی سے بدگمانی اس طرح پیدا کر دیتے ہیں کہ ان کا سارا جوش  
 و خروش دین کو عصری تقاضوں کے مطابق ڈھالنے (Modernisation) اور اسلامی قانون میں  
 اصلاح و ترمیم کی مہم چلانے میں منحصر ہو کر رہ جاتا ہے،

بہت سے مستشرقین کا یہ بھی طریقہ رہا ہے کہ وہ پہلے ایک مقصد متعین کر لیتے ہیں پھر ہر ممکن طریقہ سے اس  
 مقصد کو پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ ریلب و ایلس معلومات (جن کا بعض اوقات موضوع سے کوئی تعلق

نہیں ہوتا) دینی تاریخی اور ادبی کتابوں بلکہ شعر و شاعری، قصوں کہانیوں، مسخروں کی خوش گپیوں اور طنز و مزاح کی نگارشات سے (خواہ وہ کتنی ہی سطحی اور بے ہودہ ہوں) معلومات اخذ کرتے ہیں، پھر مکمل فنکاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کی بنیاد پر ایسے علمی نظریات قائم کرتے ہیں جن کا ان کے ذہن و دماغ کے علاوہ کہیں وجود نہیں پایا جاتا، اکثر ان کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ تاریخ اسلام کی کسی محبوب و معظّم شخصیت کی کسی ایک کمزوری کی نشاندہی کرتے ہیں، اور قارئین کے دلوں میں اس کی جگہ بنانے کے لیے دس پندرہ فضائل و محاسن (جن کی صحیفہ اخلاق میں کوئی اہمیت نہیں ہوتی) بڑی درپادلی سے ذکر کر جاتے ہیں، نتیجہً قاری ان کی کشادہ دلی اور سیرِ چشمی سے مرعوب اور ان کی انصاف پسندی سے متاثر ہو جاتا ہے، اور اس کمزوری کو (جو تمام فضائل و محاسن پر پانی پھیرتی) قبول کر لیتا ہے، یہ مستشرقین کسی دعوت و شخصیت کے تاریخی اور طبعی اسباب و محرکات کی ایسی مہارت اور چابک دستی سے تصویر کشی کرتے ہیں کہ پوچھا کہ یہ خیال پیدا ہوا ہے، ان کا ہے کہ یہ دعوت یا شخصیت دراصل اسی اصول اور انہیں محرکات کا قدرتی نتیجہ ہے، کا طبعی رد عمل تھا، اور گویا گوہ آتش فشاں پھٹنے کے لیے تیار تھا، اس شخصیت نے صحیح وقت پہچان لیا، ایک چمک اٹھی اور دکھائی اور وہ پھٹ پڑا، اس لیے قاری کا ذہن کسی غیر مادی سرچشمہ یا طاقت کی طرف جانے نہیں پاتا اور اس شخصیت یا دعوت کی عظمت یا اس کے ساتھ تائید الہی اور ارادہ غیبی کو تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا،

ان میں سے بہت سے مستشرقین اپنی کتابوں اور مضامین میں زہر کی ایک خاص مقدار بہت احتیاط سے ملائے ہیں جو تناسب سے بڑھنے نہ پائے، اور قارئین کے لیے وحشت کا باعث نہ بنے، اور ان کو بیدار اور محتاط نہ بنا دے، نیز محقق علامہ کی انصاف پسندی اور خلوص نیت مشتبہ نہ کر دے، اس طرح کے مستشرقین کی تصنیفات ان مخالف مصنفین کے مقابلہ میں زیادہ ضرر رساں اور خطرناک ہوتی ہیں جو کھل کر دشمنی کا اظہار کرتے ہیں اور جن کی کتابوں میں دجل و فریب و افتراء پر دازی، عریاں طریقہ پر نظر آتی ہے کیونکہ مذکورہ اصرار کتابوں کا مطالعہ کرنے والا، متوسط درجہ کا کتاب خواں، ان کو پڑھنے کے بعد متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا،

عالم اسلام اور ممالک عربیہ کی علمی کمزوری، پست ہمتی اور بے ماگی کی یہ کھلی دلیل ہے کہ یہ ممالک ایک



طویل زمانہ سے خالص اسلامی موضوعات پر مستشرقین کی کتابوں کو ماخذ و مرجع سمجھتے ہیں، اور ان کے نزدیک ان کی یہ محققانہ کتابیں "کتاب مقدس" (Gospel) کی حیثیت رکھتی ہیں، مثال کے طور پر آرنے نکلسن کی کتاب *Literary history of Arabs* (تاریخ ادبیات عرب) ڈاکٹر پی کے سیٹی کی کتاب *History of the Arabs* (تاریخ عرب) کادل بروکلمان کی جرمن زبان میں کتاب *Geschichte der Arabischen Literature* (تاریخ عربی ادبیات) اور اس کا انگریزی ترجمہ *The history of Arab Literature* جو عربی ثقافت و فنون پر مشتمل ہے، گولڈنبرگ کی کتاب *Introduction of Islamic Theology & Law* (اسلامی عقیدہ و شریعت کا تعارف) اور — *Mohammed Nische Studien Halle* (مطالعہ اسلامیات) شناخت کی کتاب *The origins of Mohammedan Jurisprudence* (فقہ اسلامی کے ابتدائی ماخذ) اور ڈبلیو سی اسمتھ کی کتاب *Islam in Modern History* (اسلام جدید دنیا میں) اور اے آر گب کی کتاب *Wilher Islam* (اسلام کا رخ کس طرف ہے؟) مونٹگمری واٹ کی تصنیفات *Mohammed in Mecca* (محمد مکہ میں) *Mohammed in Medina* (محمد مدینہ میں) اور *Mohammed prophet and statesman* (محمد بحیثیت نبی اور سیاستدان)

ان سب کتابوں کے بارے میں یہ خیال پایا جاتا ہے کہ اپنے موضوع پر یہ منفرد تصنیفات ہیں، اسلامی مکتبہ کی یونیورسٹیوں کے عربی زبان و ادب اور اسلامیات کے شعبوں میں ان کو اہم علمی ماخذ گردانا جاتا ہے، اور تصنیف و تالیف کا کام کرنے والے زیادہ تر انہی پر اعتماد کرتے ہیں، اسلامی انسائیکلو پیڈیا (Encyclo-paedia of Islam) جس کی تالیف کا کام مستشرقین کے ہاتھوں انجام پایا ہے (اگرچہ اس میں بعض مسلمان مقالہ نگاروں کا بھی کچھ حصہ ہے) اور جس کے کئی ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں، وہ اسلامی حقائق و معلومات کا سب سے بڑا ذریعہ اور سب سے قیمتی ذخیرہ سمجھا جاتا ہے، اور بعض عرب اور مسلمان ملکوں کے علمی حلقوں میں اس کو اسلام سے متعلق معلومات کا اساسی اور بنیادی ماخذ سمجھا جاتا ہے، مصر میں عرصہ دراز سے

اس کا لفظی ترجمہ شایع ہو رہا ہے، حالانکہ مصر جیسے ملک سے اس کی توقع تھی کہ وہ مسلمان محققین اور اسلامی موفوں پر اصحاب اختصاص مسلمانوں کے قلم سے مستقل اسلامی انسائیکلو پیڈیا اور دائرۃ المعارف اسلامیہ پیش کرتا، مستشرقین کے منفی اثرات کے ازالہ کے لیے علمائے اسلام، محققین و مفکرین اور مسلمان ریسرچ اسکالرز کی ذمہ داری ہے کہ وہ علمی موضوعات پر محققانہ اور "اورینٹل" بحثیں تیار کریں، اور عالم اسلام کو صحیح اور قابل اعتماد معلومات اور اسلام کے صحیح تصورات اور حقائق سے (ان خوبیوں اور امتیازات کا لحاظ کرتے ہوئے جو مستشرقین کی خصوصیات سمجھی جاتی ہیں) روشناس کریں، بلکہ علمی اصول و اصول بحث، مجتہدانہ تحقیق و دقت نظر و مطالعہ، اتحاد و مراجع کی صحت و استناد اور پر زور استدلال و استنتاج میں ان پر بھی فوقیت لے جائیں، اور ان غلطیوں اور کمزوریوں سے بھی محفوظ رہیں جن کے عام طور پر مستشرقین شکار ہوتے ہیں۔

یہ بھی ضروری ہے کہ مسلمان علماء و محققین، مستشرقین کی تصنیفات و علمی تحقیقات کا جائزہ لیں، اور حقائق و واقعات کی روشنی میں ان کا علمی محاسبہ کریں، ان کی وسیعہ کاریوں اور عربی عبارتوں کے مفہوم سمجھنے یا ان کی تحلیل و تشریح میں ان کی غلطیوں کی نشاندہی کریں، جس سے تاریخ کو یہ معلوم ہو کہ جن مراجع و آخذ پر وہ اعتماد کرتے ہیں، وہ ناقابل اعتماد ہیں، انہوں نے ان سے جو اہم نتائج نکالے ہیں اور ان پر اپنے دعوے کی پوری عمارتیں قائم کر لی ہیں، ان کی بنیاد ہی کمزور، مشکوک یا سراسر سے معدوم ہے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی دکھائیں کہ انکی معصومانہ علمی کاوشوں میں سیاسی و مذہبی (مشرقی) اغراض و مقاصد کہاں تک کام کر رہے ہیں۔

۱۹۷۸ء میں لاہور کے قیام کے دوران یہ معلوم کر کے خوشی ہوئی کہ پروفیسر ظفر علی قریشی صاحب نے مستشرقین کی سیرت پر تمام تصنیفات و مقالات جمع کرنے اور ان پر علمی تنقید، محاسبہ اور تردید کا کام شروع کیا ہے، اس سلسلے میں انہوں نے ایک مفصل قیمتی بحث انگریزی میں لکھی ہے، جو کئی ہزار صفحات پر مشتمل ہے، راقم السطور ان کی اس انفرادی رضا کارانہ کوشش اور ان کے ذاتی کتب خانہ کو دیکھ کر متاثر اور سرور ہوا، ساتھ ہی ساتھ اس پر متعجب بھی کہ کسی مسلم حکومت یا ادارے کی طرف سے اس کام کی قدر دانی اور ہمت افزائی کا ثبوت نہیں دیا گیا،

لیکن صرف ناقدانہ اور سلبی کام کافی نہیں ہے، مثبت اور تعمیری کام بھی ناگزیر ہے، اس کی فوری ضرورت ہے کہ اسلامی موضوعات پر عمیق و فکرانگیز معلومات اور محققانہ علمی کام کا سلسلہ جاری رہے، جو تحلیل و تجزیہ، ناقد و مراجع کے دیانت و ارادہ حوالہ اور مفید و متنوع تفصیلی اندکس سے (جو مستشرقین کی خصوصیت سمجھی جاتی ہے) معمور ہو، اس سلسلہ میں ایسے مواد اور کتابوں سے بھی استفادہ کیا جائے جن کی طرف باومی النظر میں ذہن نہیں جاتا اور جن کا موضوع سے برادر راست تعلق نہیں ہوتا اور نہ روایتی طور پر وہ تاریخ کی کتابیں سمجھی جاتی ہیں، جو عام طور پر سرکار و بارہ حرب و ضرب اور سیاسی حوادث و واقعات کے گرد گردش کرتی ہیں، اس جدید مواد اور ایسے مفید مآخذ کی دہشت ساعلی کام ہو جانے کے باوجود اب بھی کمی نہیں جو ایک محنت کش ابدیدہ ور، علم و تحقیق کی سچی پیاس رکھنے والے عالم و محقق کے منتظر ہیں، آج بھی ہاتھ غلیبی کی صداکانوں میں آتی ہے ۵

گماں میر کہ بیایا رسید کار مغال

ہزار بادۂ ناخوردہ در گ تانگ است

ساتھ ہی اس کی بھی ضرورت ہے کہ ایسے خالص علمی اور تحقیقی کاموں میں بے جا تطویل اور عبارت آرائی سے گریز کیا جائے اور حتی الامکان طنز و تضحیک اور مفروضات کے قائم کرنے سے پرہیز کیا جائے، کیونکہ اس طریقہ کار (طنز و تضحیک) سے بحث و تحقیق کا علمی وقار اور تحقیقی وزن جاتا رہتا ہے، جب تک یہ دونوں کام نہ انجام دیئے جائیں گے، اس وقت تک عالم اسلام کا وہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ جو ذہین اور حوصلہ مند نوجوانوں پر مشتمل ہے اور جو یورپ و امریکہ کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پارہا ہے، یا خود اپنے ملک اسلام کا مطالعہ یورپین زبانوں میں کرنے کا عادی ہے، مستشرقین کے مسموم افکار اور انکی ذہنی غلامی سے آزاد نہیں ہو سکتا،

زندگی کے کسی گوشہ میں بھی غلا زیادہ دیر تک باقی نہیں رہ سکتا، یہ خدا کے تکوینی قوانین اور فطرت بشری کے منافی ہے، کیونکہ حاجتمند اگر صحیح ذریعہ سے اپنی ضرورت پوری نہیں کر سکتا تو غلط اور نامناسب طریقہ اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے، جب تک مستشرقین اور مغربی مفکرین کی (اسلامیات کے میدان تک میں) فکری قیادت اور غلا رہنمائی کا سلسلہ جاری ہے، اس وقت تک عالم اسلام عقلی و ذہنی انتشار اور فکری ارتداد کی آندھیوں سے محفوظ نہیں رہ سکتا، تجدد و مغربیت کے داعی و علمبردار، مغرب کے افکار و خیالات کے نقیب و ترجمان بنتے رہیں گے، جب



ان کو سیاسی اقتدار حاصل ہوگا تو وہ بزور حکومت اور قانون سازی کے ذریعہ وہ "اصلاحات" نافذ کریں گے جو اسلام پر نیشہ زنی کے مرادف ہوں گی، وہ ایسے معاشرہ کو تشکیل دیں گے جو قدیم اسلامی معاشرہ اور اقبال دینا میں کلیتہً ایک مغربی اور مادی معاشرہ ہوگا، اس وقت اس کے ذائقوں اور نصیبوں اور پروٹوں کو مخاطب کر کے عارف شیرازی کے الفاظ ہیں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ

ترجمہ ندرسی بکعبہ سے اعرابی  
کہیں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

ان ممالک میں جو اسلامی و مغربی تہذیبوں اور فلسفوں کی آویزش کا میدان تھے، ہندوستان کو یہ امتیاز و فخر حاصل ہے کہ اس سلسلہ کا سب سے بڑا کام اس کی سر زمین پر انجام پایا، دارالمنصفین (ہماری معلومات کی حد تک) سب سے پہلی علمی و تحقیقی اور غیر سرکاری اکیڈمی ہے جس کا قیام مغرب کے فکری حملوں اور مستشرقین کی مسموم تصنیفات اور مضامین کی تردید، تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اسلامی تعلیمات کی برتری پر مطمئن کرنے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی عظیم شخصیت و سیرت اور اس نسل کے کارناموں سے واقف کرانے (جس نے آغوش نبوت میں تربیت پائی تھی) اور اسلام کے علمی و تحقیقی سرمایہ سے متعارف کرانے کی خاطر عمل میں آیا،

مشہور سچی مہری فاضل جرجی زیدان نے بیسویں صدی کے اوائل میں جب مصر سے اپنی مشہور کتاب (تاریخ المدین الاسلامی) شایع کی تو علمی حلقوں میں اس کی دھوم مچ گئی، جرجی زیدان کی اس کتاب میں معلومات و مواد کی فراوانی کے ساتھ ساتھ، اموی اور عباسی خلفاء کے ساتھ علمی و تمدنی کا معاملہ اور بعض تاریخی حقائق کی تحریف سے کام لیا گیا تھا، اور کتب خانہ اسکندریہ کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حکم سے آگ لگا دینے کی اس بے اصل داستان کو دہرایا گیا تھا، جو عرصہ سے سچی مورخین کا دیرہ بن گیا تھا، اس کتاب کے مطالعہ سے علامہ شبلی کی رگ حمیت پھڑک اٹھی، اور مؤلف کا علامہ کی تعریف و توصیف اور ان کی کوششوں کو سراہنا، بعد مکانی اور خود مصر میں جبید علماء کی موجودگی، کوئی چیز بھی علامہ شبلی کی راہ میں حائل نہ ہو سکی، انھوں نے عربی زبان میں ۱۹۱۴ء میں الانتقاد علی المدین الاسلامی کے نام سے کتاب لکھی جس میں پرزور دلائل سے ان الزامات کی تردید کی، ہندوستان و مصر کے علمی حلقوں میں اس کتاب کو بہت پسند کیا گیا، اور اہل حمیت اور

عرب فضلاء و بالخصوص علامہ سید رشید رضا نے ان کی اس خدمت کا ممنونیت و تشکر کے ساتھ ذکر کیا،  
 دبستان شبلی نے بحث و تحقیق، وسعت مطالعہ، فہم کی شایستگی اور تحریر کی شگفتگی کے دلائل و نمونے پیش  
 کیے، اس مکتب فکر کے فضلاء نے عالمانہ و ادیبانہ طرز تصنیف و حسن ترتیب کے میدان میں قائدانہ کردار ادا کیا،  
 انہوں نے علمی و تحقیقی بلکہ فلسفیانہ اور متکلمانہ مضامین کیلئے وہ اسلوب تحریر اختیار کیا جو سنجیدہ اور عالمانہ مقالہ  
 کے لیے ہر طرح موزوں تھا، جس میں زبان کی چاشنی اور ادب و انشاء کا حسن، صحیح تناسب کے ساتھ پایا جاتا ہے  
 یہ خصوصیت نئی نسل کے ان خوش مذاق نوجوانوں کے لیے باعث کشش بن گئی، جو ادب و انشاء کی چاشنی کے بغیر  
 کسی ٹھوس، غور طلب اور فکر انگیز مضمون یا کتاب کا مطالعہ نہیں کر سکتے، اس دبستان کی کتابوں اور مضامین نے  
 جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں اسلامی تہذیب و ثقافت، مسلمانوں کی تابناک تاریخ اور ان کی علمی و تمدنی خدمات کو اس  
 طرح پیش کیا جس نے اسلام کی برتری اور عظمت اور اسلاف کی ذہنی اور انسانی بلندی پر اس کا اعتماد جو جدید تعلیم  
 اور مغربی لطیفیہ کے اثر سے متزلزل ہو رہا تھا بحال کر دیا، اور اس احساس کہتری کو دور کرنے میں موثر رول ادا کیا  
 جو ۱۸۵۶ء کے بعد اس میں پیدا ہو گیا تھا،

ان مصنفین کی تصنیفات اور مضامین کی دوسری نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ ان کی بحث و تحقیق میں براہ راست  
 واقفیت اور اصلیت (Originality) پائی جاتی ہے جو ان کی عربی و فارسی زبانوں پر قدرت اور اصل ماخذ  
 سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت اور علوم اسلامیہ کی باقاعدہ تحصیل کا نتیجہ تھی اور جس کی کمی مستشرقین کے خوشہ چینوں اور  
 بالواسطہ (Second hand) معلومات رکھنے والوں میں نمایاں طور پر نظر آتی ہے،

علامہ شبلی کا (جو دارالین کے خیال و منصوبہ کے اصل محرک ہیں) سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے  
 سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے موضوع پر جدید و قدیم طرز کے تمام مصنفین کی روش اور طریقہ سے ہٹ کر وسیع  
 تحلیل اور ہمہ گیر و مکمل خاکہ کے ساتھ کام شروع کیا جس کو ان کے ماوراء روزگار تلمیذ و جانشین مولانا سید سلیمان ندوی  
 نے اور زیادہ وسعت و کرسات جلدوں میں مکمل کیا، اس سلسلہ کی پہلی جلد مکمل علامہ شبلی کے قلم سے ہے اور دوسری  
 جلد میں مولانا سلیمان ندوی کے اضافے ہیں، بقیہ جلدیں ان ہی کے رواں اور شاداب قلم کا نتیجہ ہیں تیسری جلد کا تعلق  
 دلائل و معجزات نبوی سے ہے چوتھی جلد منصب نبوت، نبوت کے خدائیں، بعثت محمدی کے وقت،

جزیرۃ العرب اور تمدن دنیا کے حالات اور اسلامی عقائد سے تفصیلی بحث کرتی ہے، پانچویں جلد عبادات بدنی، مالی، قلبی کے ساتھ منہموم ہے، چھٹی جلد اسلام کی اخلاقی تعلیمات اور اس کے اخلاقی فلسفہ سے متعلق ہے، اس موضوع پر ہمارے علم میں تفصیلی اور دیدہ ریزی سے کم لکھا گیا ہے، ساتویں اور آٹھویں جلد مواظبات اور سیاست کے موضوع پر ہے، اور ان طریقوں پر کتاب عبرت و تعلیمات نبوت کا ایک جامع تعارف اور ایک چھوٹا سا انسائیکلو پیڈیا بن گیا ہے۔

علامہ شاکر نے جاوید تصنیفات میں ان کی کتاب "الفاروق" خاص اہمیت رکھتی ہے، اس کو ان کی انشاپردی کا شاہکار کہا جاسکتا ہے، اس کتاب نے بہت سے جدید تعلیم یافتہ مسلمان نوجوانوں کے دل میں اسلام کی محبت کا بیج بویا اور ایمان کی آبیاری کی، اور وہ مغرب کے فکری و تہذیبی حملوں کا مقابلہ کرنے کا ذریعہ بنی، علامہ موصوف کے سوانح و سیرت نگاری کے اس مفید سلسلہ میں الخزالی، سوانح مولانا روم، الہامون اور سیرت النعمان بھی شامل ہیں، جو تذکرہ و سوانح کی ترتیب کا جدید اور قابل تقلید نمونہ ہیں، ان کے تلامذہ نے اسلامی تاریخ کی جو قدیم کتابوں کے صفحات اور کتبوں میں بھولی بسری اور کتابوں کے ڈھیر میں دبی پڑی تھی، عصری اسلوب اور چلتی جاگتی زبان میں تشکیل جدید کا کام کیا جس کا نمونہ اسوۃ صحابہ، اسوۃ صحابیات، سیر الصحابیات، اطفالائے راشدین، ہماجرین، انصار، سیر الصحابہ، اہل کتاب صحابہ و تابعین اور سیرت عمر بن عبدالعزیز اور تاریخ اسلام میں دیکھا جاسکتا ہے۔

علامہ شبلی کی شعرا عجم نامہ شعرو شاعری کی تاریخ، تحلیل و تنقید اور مختلف شعراء کے خصوصیات کلام اور ماسن شعری کے موضوع پر ایسی امتیازی حیثیت رکھتی ہے، کہ اس سے جزئی اختلاف اور اس کے بعض مضامین پر تنقید نے بھی اس کی اہمیت کم نہیں کی، اس طرح ان کے مضامین الجزیری فی الاسلام، حقوق الذمین، جو اسلامی جزیرہ کی حقیقت، ذمیوں کے حقوق اور ان کی ذمہ داریوں سے بحث کرتی ہے، کتب خانہ اسکندریہ اور ادنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر خواص و عوام میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں اور افتراء پر دازیوں کا پردہ چاک کرتے ہیں، اور تاریخ کے روشن حقائق کے چہرہ سے نقاب اٹھاتے ہیں، انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل سے جو اسلامی ممالک میں یورپین سامراج کا راتہ ہے، تاریخ اسلام، اسلامی تہذیب و تمدن، اسلامی نظام حکومت اور اسلامی حکومتوں میں غیر مسلم حکومتوں کے ساتھ سلوک و برتاؤ سے متعلق طرح طرح کے شبہات پیدا کر دیئے گئے تھے، اور تاریخ کو شک آفرینی، اعتقادی تزیین



اور ذہنی مرعوبیت کا ایسا ہی ذریعہ بنانے کی کوشش کی گئی تھی اور اس سے وہی کام لیا جانے لگا جو تیسری چوتھی صدی ہجری میں یونانی فلسفہ سے لیا گیا تھا اس لئے اس کی شدید ضرورت تھی کہ تاریخ کو صحیح طریقہ پر پیش کیا جائے اور شبہات، افترا پرداز یوں کا پردہ چاک کیا جائے، یہ نہ صرف ایک علمی و تاریخی خدمت تھی بلکہ ایک نیا علم کلام تھا، جس سے ایمان کی حفاظت و تقویت کا کام لیا جاسکتا تھا، علامہ شبلی اور ندوۃ العلماء کے فضلاء نے اس سلسلہ میں مفید اور ناقابل فراموش خدمات انجام دیں۔

علامہ شبلی کے بعد ان کے نابغہ روزگار تلمیذ اور اور ندوۃ العلماء کے مایہ ناز اور یگانہ فاضل مولانا سید سلیمان ندوی کا دور آتا ہے جنہوں نے ”ارض القرآن“ کے نام سے قرآنی عہد اور انبیاء کے ظہور اور ان کی دعوتوں اور سرگرمیوں کے مرکزوں کے جغرافیائی اور تاریخی جائزہ لیا، اس میں عربوں کی تاریخ اسلام سے پہلے ان کی فتوحات، جزیرۃ العرب کے مختلف خطوں سے، دنیا کے مختلف ممالک اور مختلف ممالک سے جزیرۃ العرب کے مختلف حصوں کی طرف انسانی قافلوں کی آمد کے واقعات، ان علاقوں کی زبانوں، مذاہب، تجارتی کاروانوں اور تہذیب کے مختلف دوروں کا تذکرہ کیا ہے، انہوں نے ۱۹۱۴ء میں یہ کتاب مرتب کی، جس میں دوسری زبانوں کے ماخذ و مراجع سے پورا استفادہ کیا گیا، اس کے علاوہ ان کی دوسری تصنیفات ”عرب و ہند کے تعلقات“، ”عربوں کی جہاز رانی“ اور ”خیام“ وہ کتابیں ہیں جو طویل بحث و تحقیق، اسلامی کتب خانہ کی غواصی اور تحقیق و جستجو کا نتیجہ ہیں اور جدید علمی طریقہ بحث و تحقیق کا وہ نمونہ پیش کرتی ہیں، جس پر اردو زبان اور نئی نسل کو بجا طور پر فخر کرنا چاہیے۔

عمر خیام، ایران کا سرمایہ فخر فرزند، نادرہ روزگار شاعر اور علوم ریاضیات کا ماہر ہے، لیکن خود ایران عمر خیام کی سیرت و شخصیت پر کوئی ایسی کتاب پیش نہیں کر سکتا جو اس نابغہ وقت شخصیت کی عظمت اور اس کے علمی کارناموں کو اجاگر کرنے اور علمی و تاریخی عمیق و طویل مطالعہ میں اس کتاب کی ہم پلہ ہو، ان کی کتاب ”خطبات مدراس“ جس کا ترجمہ بلاذری میں ”الرسالة المحمدية“ کے نام سے شایع ہو چکا ہے، سیرت نبوی ﷺ اور تعلیمات نبوی ﷺ پر ایسی طاقت ور، موثر اور پر مغز اور پر از معلومات کتاب ہے جس کی نظیر مسلمانوں کی دوسری زبانوں میں ملنی مشکل ہے، اسی طرح ”سیرت عائشہ“ اپنے موضوع پر منفرد کتابوں میں ہے۔

۱۔ یہ ترجمہ ہمارے فاضل دوست مولانا محمد ناظم صاحب ندوی (سابقہ، مہتمم دارالعلوم ندوۃ العلماء اور شیخ الجامعۃ العباسیۃ بمال پور) نے کیا ہے، عرب ممالک میں اس کے کئی ایڈیشن شایع ہو چکے ہیں۔

# اسلام اور مسیحیت

جلد دوم

رتبہ

سید صباح الدین عبدالرحمن

مصنفین، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ (۲۷۶۰۰۱)